

امامُ الفنِّ  
 فصاحتُ جنگِ جلیلِ بانپوری  
 جانشینِ امیرِ صنیائی

272  
 1-94.

○  
 حیاتِ  
 شخصیتِ  
 فن



ڈاکٹر علی احمد جلیلی

# جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

A cc. No.  
488

ادیشن - پہلا

اشاعت - ۱۹۹۳ء

تعداد - ایک ہزار

کتابت - محمد عبدالرؤف خوشنویس

سرورق - سلام خوشنویس

مطبع - اعجاز پریس - چھتہ بازار

قیمت - ۱۱ روپے

ALI

تقسیم کار :-  
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس - لال کنواں

دہلی - ۱۱۰۰۰۶

حسامی بک ڈپو - مچھلی سمان - حیدرآباد

یہ کتاب ترقی اورو بورڈ نئی دہلی کے مالی اشتراک سے شائع ہوئی

انتساب

واللہ مراد

کے

نام

پوچھا انھوں نے جانتے ہو تم جلیں کو  
بوسے کہ ہاں وہ شاعرِ نازک خیال ہے



نواب فصاحت جنگ (حافظ جلیل حسن) جلیل - رح

# ترتیب

پیش لفظ

۷

حیات

- ۱۵ پہلا دور - وطن - خاندان - پیدائش  
۲۷ دوسرا دور - قیام راسپور  
۴۵ تیسرا دور - حیدر آباد میں آمد  
۷۵ چوتھا دور - استاد شاہ

جلیل کا سوگ

۱۰۳ اخبار و رسائل میں

۱۱۰ منظوم خراج عقیدت

۱۱۹ شاگرداں جلیل اور اصلاح سخن

تصنیفات و تالیفات

۱۵۱ دوا دین

۱۵۲ تذکیر و تمانیث

۱۶۱	مہیا اردو
۱۶۵	اردو کا عروض
۱۷۰	سوانح آبیرنیائی
۱۷۵	مکاتیب جلیل
۱۸۷	شخصیت
	شاعری
۲۲۵	نعت گوئی
۲۲۹	غزلیہ شاعری
۲۴۷	درباری شاعری
۲۶۱	تاریخ گوئی
	فنی تجزیہ
۲۷۳	صنائع لفظی و معنوی
۲۸۱	عروضی تجزیہ
۲۸۹	جلیل اور آہنگ شعر
۳۰۷	ناقدین کی رائوں پر تبصرہ
۳۱۵	کتابیات

## پیش لفظ

یہ کتاب حضرت فصاحت جنگ جلیل مانپکوری کی حیات، شخصیت اور ان کے ادبی، علمی، شعری اور لسانی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ ہے۔ اس جائزہ کے وقت یہ تلخ حقیقت سامنے رہی ہے کہ جلیل مانپکوری اور ان کے معاصر غزل گو شاعروں کو بیسویں صدی کی تنقید میں کم جگہ دی گئی ہے۔ جو تحریری مضامین یا کتاب کی صورت میں ہیں وہ اس لیے قابل اعتناء نہیں کہ ان سے پوری تشفی نہیں ہوتی۔ پروفیسر مغنی تبسم کی ”وفانی بدایونی“ جیسی کتابیں بہت کم ہیں جو مکمل طور پر شاعر کی حیات اور اس کے فن کا احاطہ کرتی ہوں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جن شعرا پر بہت کم لکھا گیا ہے ان پر یعنی حسرت، اصغر، ریاضی، یگانہ، جگر، فراق اور جلیل مانپکوری وغیرہ پر بھی بھرپور قلم اٹھایا جائے۔

اُردو غزل اپنی پیدائش سے لیکر مختلف ادوار سے گزرتی اور مختلف حالات و رجحانات سے دوچار ہوتی ہوئی ہم تک پہنچتی ہے۔ اس دور تک غزل کی کلاسیکی روایات کے جو محافظ نود تحریکات کے مقابلہ میں غزل کو اس کا مقام دلانے میں حریفانہ آئے ان میں جلیل مانپکوری کا نام کئی اعتبار سے سرفہرست ہے۔ جلیل بحیثیت شاگرد و جانشین امیر میانی نہ صرف امیر کی روایات کے پاسدار ہیں بلکہ

دبستان لکھنؤ کے نمائندہ شاعر تھے۔

جلیل مانپکوری کا عہد شعر و ادب کے ارتقا میں انقلابی نوعیت کا ہے جب کلاسیکی سرمایہ پر روایت کی چھاپ مدھم ہو چلی تھی اور ترقی پسند عناصر بار بار پائے تھے۔ اس بیجا بی دور میں جلیل نے آندھیوں میں اپنی موم بتی دالی شمع جلا رکھی تھی۔ وہ غزل گوئی کے روایتی آہنگ کے استاد تھے۔ اس لحاظ سے انھیں لکھنؤ دبستان کے آخری نام لیوا کا نام دیا جاسکتا ہے۔

افسوس کہ بیشتر معاصرین کی طرح جلیل پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ اس سلسلے میں قابل ذکر کتاب لکھنؤ کے ڈاکٹر ذکی کا کوروی کی ”جلیل مانپکوری“ ہے جو ان کے ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے۔ یہ کاوش اس اعتبار سے لائق اعتنا ہے کہ انھوں نے جلیل کی سوانح اور ان کے کارناموں کا پہلی بار تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا ہے اس سلسلے میں انھوں نے حیدرآباد کا سفر کیا راقم الحروف سے بے اللہ مرحوم کا سوانحی مواد حاصل کیا جس کا ذکر ان کی کتاب میں ہے۔ اس سلسلے کی دوسری اہم کوشش بیٹی کے ڈاکٹر خالق انصاری کی ہے۔ انھوں نے بھی جلیل مانپکوری کو اپنی ڈاکٹریٹ کا موضوع بنایا۔ انھوں نے بھی حیدرآباد میں مجھ سے ربط قائم کیا اور کئی شخصیتوں سے ملاقات کی۔ ان کا مقالہ نسبتاً ضخیم ہے اور شائع بھی ہو چکا ہے۔ حیات کا حصہ دو دو کے یہاں مختصر ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی کتاب لکھنؤ کا دبستان شاعری میں جلیل کی حیات اور شاعری پر لکھا گیا ہے۔ اس کی حیثیت ایک طویل مضمون کی ہے۔ نگار لکھنؤ کے غزل نمبر میں معاصر غزل گو شعرا کے ساتھ جلیل کے کلام پر مختصر تنقید لکھی ہے مجلہ ثنائیہ کا جلیل نمبر بھی ایک اہم ماخذ ہے جو جلیل کی وفات پر ڈاکٹر حسن الدین احمد کی نگرانی میں یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہوا ہندوستانی ادب، حیدرآباد کا جلیل نمبر بھی قابل ذکر ہے۔

ان کتابوں اور مضامین میں کوئی بھی ایسا نہیں جو جلیل کی حیات اور شاعری کا پورے طور پر احاطہ کر سکے میری یہ کتاب اس کی تکمیل کرتی ہے۔ حیات و شخصیت کے ہر گوشہ کو سینے کی کوشش کی ہے۔ سوانحی حالات سے متعلق میرا اہم مقبرہ ماخذ

وہ یادداشت ہے جو والد مرحوم کے عین حیات خلفِ اولِ صدیق احمد اتر کے ہاتھوں منضبط کی گئی تھی اور جسے کارنامہ جلیل کا نام دیا گیا تھا۔ یہ تلمیذِ تحریر جو میرے پاس محفوظ ہے اس لحاظ سے بہت اہم و کارآمد ہے کہ اس میں زندگی کے قابلِ ذکر حالات و واقعات کے علاوہ امیرِ بنیائی کے سخی خطوط اور شاہی فرامین کے وہ نقول بھی ہیں جو دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں۔ قطع نظر اس سے ہیں نے اپنے شخصی و ذاتی مشاہدات و حالات بھی درج کئے ہیں جو ہوشِ سنبھالنے کے بعد سے والد مرحوم کی وفات تک ان کی صحبت سے حاصل کئے۔

جہاں تک تنقیدی حصہ کا سوال ہے فیاذفتح پوری کے اس بیان کو پیشِ نظر رکھا ہے کہ ”جلیل کے ذکر میں جدید رجحانات کو دیکھنا چاہیے بلکہ انھیں کے آرٹ کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرنا ہے۔“ اس باب میں دوسرا اصول جو میرے سامنے رہا ہے وہ یہ کہ تنقید شعروں کے تجزیہ میں ناقدین جلیل کی آرا کو بنیاد بنایا ہے۔ دورِ حاضر کے ناقدین کے آرا حاصل کرنے کے لیے میں نے شخصی طور پر ملاقاتیں کیں اور خطوط کے ذریعہ آرا فراہم کیں۔ میں پروفیسر مسعود حسین خان، شمس الرحمن فاروقی، اختر الایمان اور معصوم رفارہاچی وغیرہ کا ممنون ہوں کہ ان کا تعاون مجھے حاصل رہا۔ میں نے آج کے تنقیدی رجحانات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے رسانی و صوتیاتی آہنگ اور عروضی تجزیہ کو بھی تنقید میں جگہ دی ہے جس کی وجہ سے ادبی و شعری تخلیق کے اسلوب اور صوتی و عروضی حسن کی انفرادی خصوصیات کی سائنٹیفک جانچ ممکن ہو گئی۔ شاعری کے تجزیہ میں ضائع بدائع کے استعمال، محاوروں کے برتنے کے ہنر اور پیکر تراشی کے نمونوں کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے۔ غرض کہ شاعری کے علاوہ درباری شاعری، نعتیہ شاعری اور تاریخ گوئی کے علاوہ ابواب قائم کئے ہیں شاگردانِ جلیل کی تعداد بیل تو بہت ہے لیکن تمام ناموں کی فراہمی ممکن نہ ہو سکی: میرے یہاں جو فہرست تھی اس کو بنیاد بنا کر دوسرے تذکرہ نگاروں نے اپنی فہرستیں ترتیب دی ہیں۔ بعض نے ان ناموں میں اضافے بھی کئے ہیں۔ با اینہم اسے مکمل فہرست قرار نہیں دیا جاسکتا کیوں کہ شاگردوں کی تعداد اس

سے کہیں زیادہ تھی۔ اس کا باقاعدہ ریکارڈ رکھا گیا تھا افسوس کہ تلف ہو گیا ہو جو ریکارڈ میں جناب قتیل شفا کی کا نام بھی درج تھا لیکن میرے علم میں یہ بات قطعی نہ تھی۔ تحقیق فردی معلوم ہوئی۔ حسن اتفاق سے قتیل شفا کی حیدرآباد کے ایک انڈیا پاک مشاعرہ میں شرکت کے لیے حیدرآباد آئے تو میں نے مشاعرہ ہی میں یہ بات ان کے سامنے رکھی اور تصدیق چاہی معلوم ہوا کہ انھوں نے مشورہ سخن کے لیے استاد جلیل کو ضرور لکھا تھا لیکن بات پھر آگے نہ بڑھی اور اسی پر ختم ہو گئی۔

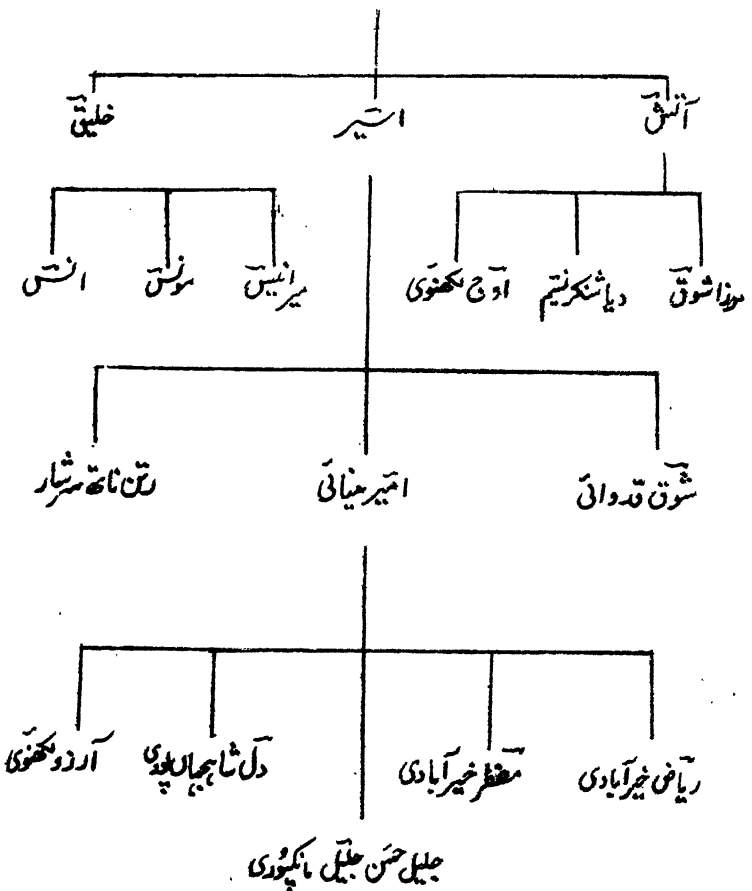
سوانحی حالات کی ایک چھوٹی ہوئی کڑی کو ملانے میں پاکستان کے ایک شاگرد جلیل، غلام حسن کسری منہاس نے میری مدد کی۔ ساہرین جلیل میں جن شخصیتوں کے ساتھ جلیل کے مراسم تھے ان میں علامہ اقبال کا کوئی ذکر ہمارے یہاں کے نجی ریکارڈ میں نہیں تھا لیکن حیدرآباد کے ایک کرم فرمانے اقبال اور جلیل کی ملاقات کا ذکر بڑے اعتماد سے کیا۔ میں نے اس کی تصدیق کے لیے محبی کسری صاحب کو لاہور خط لکھا۔ انھوں نے اس کے جواب میں اقبال پر لکھی ہوئی ایک کتاب مجھے بھیج دی جس سے اقبال و جلیل کے مراسم کی تصدیق خود اقبال کے الفاظ میں ہو گئی۔

اس کتاب کی ترتیب و تزیین میں پروفیسر مفتی تبسم کی جو رہنمائی راقم الحروف کو حاصل رہی وہ باعث ممنونیت ہے۔ بالخصوص فنی تنقید کے ابواب انھیں کی ہدایت کا نتیجہ ہیں۔ ان کے مخلصانہ مشوروں نے مجھے غیر معمولی حوصلہ اور اعتبار دیا۔

چاہ

# دستان لکھنؤ کا سلسلہ

مصطفیٰ



## پیشلا دور وطن، خاندان، پیدائش

مانکپور مقام کو اس وقت جو شہرت حاصل ہے وہ حافظ جلیل حسن جلیل کی نسبت سے ہے۔ ادبی حلقوں میں اور شعر و شاعری کی دنیا میں وہ جلیل مانکپوری ہی کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ مانکپور یو۔ پی کے ضلع پرتا بگڑھ کی تحصیل کنڈھ میں ایک قصبہ ہے۔ ضلع پرتا بگڑھ سے تعلق سے ڈاکٹر خالق انصاری نے یہ تاریخی سواد فراہم کیا ہے کہ ضلع پرتا بگڑھ یو۔ پی کا ایک بہت ہی مرموز خیر خطہ ہے۔ اس ضلع میں چھ سو سے زیادہ گاؤں اور تین شہر ہیں جن میں پرتا بگڑھ سب سے بڑا ہے۔ اس شہر کو راجہ پرتاب سنگھ نے ۱۶۱۷ء میں آباد کیا تھا۔ انیسویں صدی میں یہ علاقہ حکومت اودھ کے زیرِ انتظام آگیا تھا۔ ضلع پرتا بگڑھ الہ آباد کے دکنی اور یورپی کنارے پر آباد ہے۔ یہاں کے باشندے پیشہ کے لحاظ سے کسان ہیں۔ پرتا بگڑھ کو اہل ادب کا مولد و مسکن ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ یہ اربابِ علم اور بزرگانِ دین کا مسکن بھی رہا ہے۔

مانکپور ایک قدیم تاریخی مقام کی حیثیت رکھتا ہے۔ جو دریائے گنگا کے کنارے آباد ہے۔ مانکپور کے بالمقابل دریائے گنگا کے دوسرے کنارے کی بسنی کڑھ کہلاتی ہے۔ اور اسی اعتبار سے بالعموم اسے کڑھ مانکپور کہا جاتا ہے۔ جے چندیاں کا حکمران تھا۔ قطب الدین ایبک نے راجہ جے چند کو شکست دیکر اس پر قبضہ کیا تھا۔ اور جلال الدین خلجی کو اس کے داماد علاؤ الدین نے مالک پور اور کڑھ کے درمیان قتل کیا تھا۔ خلجی خاندان کے خاتمہ کے بعد محمد تغلق نے صنعت پارچہ بانی سے بہت دلچسپی لی۔ ابن بطوطہ مالک پور کے متعلق اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے کہ ان علاقوں میں بنائیت اعلیٰ قسم

کے کپڑے تیار کئے جاتے تھے اور دلی جو یہاں سے اٹھارہ دنوں کی مسافت ہے بھیجے جاتے ہیں۔ اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پارچہ بانی مانکپور کی خاص صنعت تھی جہاں کی پچاس فیصد آبادی میں اکثریت پارچہ بافوں کی تھی۔

تاریخ شاہد ہے کہ مانک پور ایک مرموز خیز خطہ رہا ہے۔ تذکرہ علمائے مبارکپور کے حوالے سے شبیر احمد رازی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ مانک پور صوفیائے کرام کا مرکز بھی رہا ہے۔ اسے دینی، علمی اور ادبی لحاظ سے بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس خاک سے بڑی ذی علم اور نامور ہستیاں اٹھتی رہی ہیں چنانچہ شیخ حسام الدین اپنے وقت کے جید عالم زہد و اتقا ہیں نہایت اہم مقام رکھنے والے صوفی مشن تھے۔ ان کے ایک شاگرد نے ”گلزار ابراہیم“ کے نام سے ان کے مکتوبات کو یکجا کیا ہے۔ شیخ موصوف کے مجموعہ ملفوظات کا نام ”رفیق العارفين“ ہے۔ ”انیس العاشقین“ تصوف پر ان کی مشہور کتاب ہے۔ قاضی یعقوب علم فقہ کے زبردست عالم تھے اور شاعر بھی۔ محمد اکبر شاہ کے عہد میں قاضی القضا کے عہدے پر فائز تھے علیہ دیگر جن بزرگوں نے اپنے زہد و تقویٰ اور فیض روحانی سے سرزمین مانک پور کو مرجع خلافت بنا دیا ان میں راجہ سید حامد شاہ۔ راجے سید نور۔ راجے سید شاہ اور راجے سید مبارک شاہ قابل ذکر ہیں۔

مانک پور میں جن شعرا نے مقبولیت حاصل کی اور شعرو شاعری میں نام پیدا کیا ان میں میر سپدش علی سخی مانکپوری کا نام نمایاں ہے۔ وحید الدین وحید کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انھوں نے [۲۲۷] ہزار اشعار یادگار چھوڑے ہیں۔ ان کا کلام لکھنؤ اور دہلی کے رنگ سخن کا امتزاج تھا۔ ان کے علاوہ سید بے نظیر شاہ وارثی جو حاجی وارث علی شاہ کے مرید و خلیفہ تھے کل ہند شہرت کے حامل تھے۔ حسرت مانکپوری کے نام سے بھی اہل سخن واقف ہیں۔ اس سرزمین مانکپور میں جلیل حسن جلیل کی ولادت ۱۲۸۳ھ ۱۸۶۲ء میں ہوئی۔ ادسط گھرانے سے آپ کا تعلق تھا۔ خاندانی حالات یعنی اجداد کے متعلق جو یادداشت ترب

تھے قاضی اطہر مبارک پوری بذکرہ علمائے مبارکپور۔

۱۶۳۳ء شبیر احمد رازی۔ فصاحت جنگ جلیل۔ اسکان سہاسی ۱۹۸۱ء شماره ۳ ص ۱۶۳

کی ہے وہ بھی اس باب میں کوئی رہنمائی نہیں کرتی۔ یہ خاندان مانکپور کب اور کہاں سے آیا کچھ یہ نہیں چلتا۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ آپ کے والد بزرگوار کا نام عبدالکریم اور دادا کا نام عبدالرحیم تھا۔ دونوں حضرات حافظ قرآن تھے۔ ڈاکٹر خالق انصاری لکھتے ہیں:

”جلیل کا مکان محلہ سلطان پور میں واقع ہے۔ اس سے متصل ایک مسجد ہے جسے ان کے آبا و اجداد نے تعمیر کروایا تھا۔ حافظ عبدالکریم اسی مسجد میں مانکپور کے رئیسوں اور زمینداروں کے بچوں کو قرآن اور دینیات کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ یہ مسجد مانکپور میں آج بھی تازنوں کے ساتھ موجود ہے۔ زہد و تقویٰ ان کا شعار تھا۔ مسجد کے ساتھ شب زندہ داری ان کا معمول تھا۔“ ۱

امیر احمد تیرہنائی بھی حافظ عبدالکریم کی بزرگی کے معترف تھے۔ ان کی وفات پر ایک شاگرد کو لکھتے ہیں:

”پہلے ان (جلیل) کے والد ماجد ایک بڑی جماعت کے مقتدا اور پیشوا تھے اور شیخ اجل تھے رحلت کی“ ۲

حافظ عبدالکریم کثیر العیال تھے۔ دس شادیاں کیں۔ پہلی زوجہ کے بطن سے چھ لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ ان کے نام ابوالحسن، الحسن، حسین، جلیل حسن، نورالحسن اور خلیل حسن تھے۔ دوسری زوجہ سے صرف دو اولادیں ہوئیں ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ جلیل حسن اور ان کی بہن سکونت بنی جو عمر میں ان سے چھوٹی تھیں۔ ان کا بیٹا مالیکان (ملح ناسک) میں ہوا تھا۔ یہاں ان کی ذریعات اب بھی مقیم ہے۔ ان کے نواسے محمد حنیف (جو مالیکان کی نمایاں شخصیت تھے) نے حال ہی میں وفات پائی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب دینی اور عربی فارسی علوم و فنون کی تکمیل **تعلیم و تربیت** ضروری سمجھی جاتی تھی۔ کسی ہی میں قرآن ختم کیا۔ بعد اسکے

حفظ قرآن کی نوبت آئی۔ ۱۲ سال کی عمر میں حافظ قرآن ہو گئے۔ بیس سال تک تحصیل علم کا سلسلہ جاری رہا۔ قدرت سے جناب جلیل کو دینداری اور علمی ذوق و شوقِ لیت ہوا تھا۔ اس کی تکمیل میں وہ تربیت بھی شالی تھی جو مولانا حافظ عبدالکریم نے اپنے ہو نہار سپوت کو دی تھی۔ اس سپوت نے مانکپور جیسے چھوٹے مقام پر عربی و فارسی کا ابتدائی نصاب کا درس اپنے والدی سے لیا۔ یہ تعلیم کا ابتدائی زمانہ تھا پھر جب تشنگی و در کرنے کا خیال پیدا ہوا تو لکھنؤ اور مانچور کی قربت نے کسب علم کو اور بھی آسان بنا دیا۔ طلب علم جلیل کو لکھنؤ لے گئی جو اس وقت علم و فضل کا مرکز بنا ہوا تھا۔ فرنگی محل کے علما کا فیض جاری تھا جن میں قابل ذکر نام مفتی محمد یوسف مولانا عبدالحکیم مفتی سعد اللہ، مولوی تراز علی اور مولانا عبدالعلی کے ہیں یہیں فرنگی محل میں آپ نے عربی و فارسی صرف و نحو اور منقولات و معقولات کا مکمل درس لیا۔ چونکہ طبیعت کا میلان شعر و ادب کی طرف تھا۔ معانی و زبان کی کتابوں کا مطالعہ کر کے اپنے ذوق کی تکمیل کی۔ پھر مانکپور واپس آ گئے۔

**شعروئی کی ابتدا اشاعروں میں بشرکت** | کاتب قدرت نے جناب جلیل کے لئے ایک شعرومن کی تاجدار

پہلے ہی لکھدی تھی۔ طالب علمی ہی کے زمانے سے شعر کہنے شروع کر دیتے تھے لیکن اس کا ظہور تب ہوا جب وہ علم متداد کی تحصیل سے فارغ ہو کر نکلے۔ شاعری سے ان کے فطری لگاؤ کا اندازہ ان کے ایک مکتوب کی اس تحریر سے ہوتا ہے:

”زبان اردو کی صحت کا خیال مجھے بچپن سے رہا کہ میں اُردو الفاظ صحیح

بولوں۔ فہمیدہ اور صاحب زبان اصحاب سے اس کی تحقیق کرتا تھا

اور شعر کا ذوق ایسا تھا کہ صد ہا شعر مجھے بچپن سے یاد ہو گئے تھے۔

میں مکتب میں پڑھتا تھا اور کوئی شخص شعر ناموزوں پڑھتا تو مجھ کو

ہنایت ناگوار ہوتا۔ بعض اہل مکتب جب کوئی شعر ناموزوں پڑھتے

تو خود صحیح پڑھنے کی استعداد نہ رکھنے کے باوجود مجھے ناموزون

معلق ہو جاتی۔ ایک بار میں نے ایک ہیم ہتی کو سودا کا شعر پڑھتے سنا۔

سکندر آیا جہاں ناپستاجو تالیب گور

صدایہ کان میں آئی وہاں تربت سے

اس شعر کو کوئی موزوں نہ پڑھتا تھا۔ میں سمجھتا تھا یہ ناموزوں  
پڑھتے ہیں مگر کیا چیز ناموزوں ہے مجھے معلوم نہ تھی جب استعد  
بڑھی اور میں نے شعر کہنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ آیا کا الف  
شاعر نے تقطیع سے گر لیا ہے اور جہاں کو قوں غنہ سے استعمال  
کیا ہے۔ اس طرح پڑھنے سے موزونیت کا عقدہ کھل گیا۔“

مانپور اگرچہ ایک چھوٹا مقام تھا لیکن ایک تو لکھنؤ کی قربت نے دو سرے وہاں  
کے زمیندار طبقہ کے ذوقِ سخن نے اچھی خاصی شعر و سخن کی خضا پیدا کر رکھی تھی۔ اکثر ردائے  
مانپور شاعری کے دلدادہ تھے اور شعرا کی قدر و منزلت کرتے تھے۔ ان کے دولت کدے  
شعر و شاعری کے ماسن بنے ہوئے تھے۔ اس ماحول کا اثر جناب خلیل نے بھی قبول کیا  
اور سب سے پہلے وہ جن کی شاعری سے متاثر ہوئے اس کا حال خود ان کے ایک بیان  
سے معلوم ہوتا ہے۔

میرے بڑے بھائی حافظ خلیل حسن خلیل فارغ التحصیل اور  
بڑے پایہ کے شاعر تھے وہ شعر کہتے تھے اور بہت کہتے تھے۔  
میں ان کے اچھے شعروں پر دہر کرتا تھا اور لکھ لیتا تھا شعرو

لے حافظ خلیل حسن خلیل۔ خلیل حسن خلیل کے برادر بزرگ۔ ۱۸۹۲ء میں بمقام مانپور پیدا  
ہوئے حافظ قرآن تھے۔ ان کو بھی ابتداء سے شعر و سخن کا شوق تھا۔ امیر مینائی سے ملحق حاصل  
تھا۔ کچھ عرصہ کے لئے رام پور بھی گئے تھے۔ چدر بریں گوالیار میں بھی رہے۔ ۱۸۹۷ء میں ریاست  
بلرام پور (گوٹھ) چلے گئے۔ اُس وقت تک شاعری میں نام پیدا کر چکے تھے۔ میا راجہ بلرام پور نے  
انکی قدر و منزلت کد اپنے دربار سے وابستہ کیا۔ خلیل کی حیثیت یہاں راج گوی کی تھی۔ شاعری میں غزل گوی  
سے زیادہ شہرہ گوی میں کمال پیدا کیا۔ ”نیچہ نگار میں“ جو پانچ شہزادوں کا مجموعہ انکی یادگار ہے۔ یہ مجموعہ بلرام پور  
کی نظر سے شائع ہوا۔ مہاراجہ کی مدح میں لکھے ہوئے قصائد کا ایک مجموعہ اسکے علاوہ ہے۔

شاعری کا چرچا ان کے ساتھ شب و روز رہتا۔ ایک بار جب میری عمر دس برس کی تھی ان کے پاس یہ طرح آئی۔  
ستم کر رہے ہیں انا ہے تمہارے

انھوں نے غزل کہنی شروع کی۔ میں نے دل میں سوچا کہ میں بھی کوشش کر کے کچھ لکھوں ممکن ہے مجھے بھی شعر کہنا آجائے چنانچہ میں نے بھی چند شعر موزوں کر کے انھیں دکھائے۔ پہلے تو انھوں نے تعین نہیں کیا۔ جب میں نے باصرار تعین دلایا تو بہت خوش ہوئے۔ ضلع الا آباد کے ایک بزرگ اور درویش جسم کے شاعر اس وقت وہاں موجود تھے۔ بھائی خلیل حسن صاحب نے مجھے ان سے ملایا اور کہا یہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔ اس نے ابھی یہ غزل کہی ہے یہ اس کی پہلی غزل ہے! انھوں نے دیکھ کر مجھے دُعا دی اور فرمایا — کہ حضرت موسیٰ کبھی بلندی پر چڑھے نہ تھے یکبارگی کوہ طور پر چڑھ گئے اور وہاں پیغمبر ہو گئے۔ وہی کیفیت تمہاری معلوم ہوتی ہے۔ ۶۶

جناب خلیل کے شوق شاعری کو جو طرہ وادارہ اس میں ایک عنصر یہ بھی شامل تھا کہ خاندان والوں یا والد کی طرف سے کبھی کوئی رکاوٹ یا پابندی عائد نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر مفتی تبسم امین<sup>۱</sup> قافی بدایونی میں لکھتے ہیں کہ قافی کے والد کو شاعری سے نفور تھا چنانچہ انھیں جب یہ معلوم ہوا کہ قافی شعر کہنے لگے ہیں تو برا فروختہ ہو کر ان کی بیانیہ نندراقتش کر دی تھی۔ جناب خلیل کے بیان کے مطابق ان کے استاد امیر میانی کے والد نے بھی امیر کو شاعری سے باز رکھا تھا تھا اور نصیحت کی تھی کہ — بیٹا ابھی پڑھنے لکھنے کا وقت ہے۔ علم و فضل حاصل کروں کہ خاندان کی عظمت قائم رہے۔ بعد فراغ تحصیل جب جی چاہے شعر کہہ لینا۔ لیکن یہاں معاملہ

۱۔ صدیق احمد انارکلی کا نام ہے خلیل۔ (۳)

۲۔ مختار علی گڑھ میگزین (قافیہ نمبر) ص ۲۷ سے سوانح امیر میانی، خلیل حسن خلیل ص اندانی

برعکس قضائیں نے اپنے بزرگوں سے یہ روایت سنی ہے کہ جناب جلیل کے والد کے لئے یہ بات باعث مسرت تھی کہ ان کے فرزند شاعری میں نام پیدا کر رہے ہیں چنانچہ سنا ہے کہ ایک بار خود انہوں نے جلیل کو ایک پرچہ تمنا تے ہوئے کہا کہ میں نے بھی کچھ شعر کہے ہیں اسے دیکھ لینا جلیل نے نہایت خوبصورتی سے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ جلیل بھیا کو دکھائیجئے خلیل کے سامنے بات آئی تو انہوں نے صاف کہہ دیا کہ آپ اپنے مشاغل میں مصروف رہیں اور یہ کام مجھے لئے چھوڑ دیں۔ حافظ صاحب سیدھے سادے آدمی تھے۔ ان سے کچھ نہیں کہا لیکن بعد میں اپنے دوستوں سے کہا کہ حدوں بچے میری غزل گوئی کی حمایت میں نہیں۔

اس خوشگوار ماحول میں جناب جلیل کی شعر گوئی کا سلسلہ تعلیم کے بعد بھی جاری رہا۔ ابتدائی مشق سخن کے ساتھ ہی مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔ مانکپور میں اعظمیہ اور احباب کے مکانات پر اکثر مشاعرے ہوتے تھے۔ ان میں راجہ تمشق حسین صاحب کی محفلیں خاص ہوا کرتی تھیں۔ مشاعرہ میں شریک ہونے والوں میں بے نظیر شاہ واٹلی، میر حیدر حسین حیدر، منشی احمد اسد احمد، منشی عبداللہ قیس، خلیل حسن خلیل اور جلیل حسن جلیل قابل ذکر ہیں۔ مانکپور سے ۱۲ میل کی دوری پر ایک مقام سلون تھا۔ سلون کے مشاعروں میں جو طرحی ہوا کرتے تھے جلیل پابندی سے شرکت کرتے تھے۔ یہاں ایک بزرگ شاہ جہدی عطا رہتے تھے جو سجادہ نشین خانقاہ بھی تھے۔ ان کے یہاں بڑے اہتمام سے مشاعرے ہوتے جن میں احباب ذوق اور کا ملین فن کے علاوہ مانکپور اور دیگر مقام کے شعراء کو بھی دعوت دی جاتی تھی۔ ان مشاعروں میں جلیل نے شرکت کر کے خود اعتمادی پیدا کی۔

## خط و کتابت اور امیر میانی کی شاگردی،

جلیل کے شعر کہنے کی ابتداء تو مانکپور میں ہو چکی تھی لیکن لکھنؤ کے قیام کے زمانے میں اس میں پرواز لگے۔ جس وقت جلیل لکھنؤ میں تعلیم پا رہے تھے اس وقت لکھنؤ اگرچہ ایک اُبڑا ہوا لکھنؤ تھا پھر بھی شاعری اس کے آب و گل میں سموی ہوئی تھی اور اس کے

لہ راجہ تمشق حسین مانکپور کے بڑے زمیندار تھا ذوق رئیس تھے جو دو شاعر تھے اور شاعروں کے بڑے قدر دان بھی۔ جوشی لکھنؤی کے شاگرد تھے۔ صاحب دہلا تھا

دروں میں دی ماضی کی خوب اچھی موجود تھی۔ چنانچہ اسی ماحول نے جلیل کی فطرت میں دی ہوئی  
 چنگاری کو ہوا دی۔ اُن میں چونکہ خدا داد ذہانت اور فطری موزونیت تھی اس لئے وہ ایک  
 عرصہ تک کسی استاد سے اصلاح لئے بغیر شاعری میں غزلیں پڑھا کرتے تھے۔ جوں جوں وقت  
 سُخن بڑھتا گیا کسی استاد سے کلام پر اصلاح لینے کا خیال شدت اختیار کرنے لگا۔ اس  
 وقت معاصرین میں امیر احمد امیر میانی ب سے زیادہ ممتاز تھے۔ کیوں کہ سرمایہ علمی  
 قادر الکلامی اور شعر گوئی کے علاوہ قدرت نے ان میں ایسی جامعیت و دلچسپی کی تھی کہ  
 تمام اصنافِ سُخن میں یکساں قوت کے ساتھ شعر کہتے تھے۔ امیر کی طبعی، نازک خیالی  
 معنی آفرینی اور قدرتِ کلام نے اس وقت کے نامور شعرا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا اور شعرا  
 کے حلقے میں ان کی بڑی قدر تھی۔ اب تک جلیل کے برادر بزرگ حافظ خلیل حسن خلیل نے بھی  
 شاعری میں اچھی دسترس رکھنے کے باوجود کسی کے سامنے زانوئے ادب تہ نہیں کیا تھا۔ چنانچہ  
 آپ دونوں اصحاب نے حضرت امیر کی خدمت میں شاگردی اختیار کرنے کے تعلق سے  
 مشترکہ عرضہ <sup>۱۸۸۲</sup> ۱۳۱۸ میں روانہ کیا جو ترکِ وطن کر کے اس وقت ریاست رامپور میں قیام  
 پذیر تھے اور لؤاب یوسف علی خاں والی ریاست کی سرپرستی حاصل تھی۔ امیر میانی نے دونوں  
 برادران کی درخواست کو قبول فرمایا اور خط کا جواب دیا۔ اس طرح جلیل امیر میانی کے  
 سلسلہ تلمذ سے وابستہ ہوئے یہ سلسلہ ایک زمانے تک جاری رہا۔ خط و کتابت کے ذریعہ کلام  
 پر اصلاح ہوتی رہی۔ زبانِ دین شاعری سے متعلق شکوک و شبہات رفع کئے جاتے رہے۔ اس  
 سلسلہ میں جو خطوط حضرت امیر نے جلیل کو لکھے وہ بڑی قدر و قیمت کے حامل تھے کیوں کہ  
 یہ خطوط شاعری کے گراں بہار موزون کلمات سے مملو ہوتے تھے۔ افسوس کہ جس وقت جلیل

۱۔ نجات جنگِ جلیل۔ سوانح امیر میانی ص ۱۶

۲۔ لؤاب یوسف علی خاں ناظم شاعری کے بڑے دلدادہ اور علم دوست تھے۔ پہلے مومن خاں  
 مومن سے مشورہ سُخن کرتے تھے بعد میں غالب کو اپنا کلام دکھانے لگے۔ پھر جب امیر میانی کی  
 شاعری کی گونج دربارِ رامپور تک پہنچی تو لؤاب نے حضرت امیر کو کادری سے طلب کیا اور عدالت  
 دیوانی کا مفتی مقرر کر دیا۔ پھر کلام پر اصلاح لینے لگے۔ امیر کھنوی جب رامپور آئے تو ان بھی اپنے کلام پر <sup>۱۸۸۲</sup> ۱۳۱۸

اپنے استاد کے ہمراہ حیدر آباد آئے یہ سارا ذخیرہ رامپور میں چھوٹ گیا۔ غرض اس شاگردی نے جلیل کی شاعری کو نہ صرف بلند و معتبر کیا بلکہ انہیں دُنیا سے شاعری سے روشناس بھی کرایا۔ اس کا اندازہ ان کی ان غزلوں سے ہوتا ہے جو گلدستہ ”دامن گلچین“ میں شائع ہوئی تھیں۔ طبعیت کے اسی بانگین اور جوہر نے جلیل کو مانکپور کے محدود ماحول شاعری سے نکال کر لکھنؤ کے معروف شعرا کی صف میں شامل کر دیا۔

رفتہ رفتہ حضرت امیر مینائی کی شاگردی کی کشتی بڑھتی گئی خطوط سے اب میری نہ ہوتی تھی یہ وہ زمانہ تھا کہ رامپور میں اردو سرپرستی کا احیا ہو رہا تھا۔ ایسے سلم الثبوت اصحاب یہاں جمع تھے۔ اس وقت تک امیر دفتر امیر اللغات قائم کر چکے تھے جس میں ان کے بعض نامور شاگرد کام کر رہے تھے اس دفتر کے پہلے سکریٹری و سیم خیر آبادی تھے۔ ۱۸۹۰ء میں اس عہدے سے استعفی ہو کر ریاست جوئیور چلے گئے اردو ہاں سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔ و سیم خیر آبادی کے بعد منشی ممتاز علی آہ کا سکریٹری کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ کچھ عرصہ بعد وہ

اے دامن گلچین حضرت امیر کے فرزند محمد احمد صریح مینائی کی ادارت میں لکھنؤ سے ۱۸۹۱ء میں جاری ہوا بعد ازاں گورکھپور منتقل ہو گیا۔ ۱۹۱۷ء میں بند ہو گیا۔ دوبارہ لکھنؤ سے جاری ہوا۔ نواب کلب علی خاں کے بلانے پر امیر جب رام پور آ گئے تو دو احد علی بسمل لکھنؤ کے زیر اہتمام نکلتا رہا۔ پھر بند ہو گیا۔ ۱۹۹۲ء میں و سیم خیر آبادی نے گورکھپور سے شائع کرنا شروع کیا لیکن جلد ہی بند کر دیا۔ ہر ماہ طرح جاری ہوتی تھی۔ ہندوستان بھر کے شاعر دل کی غزلیں بھیجتے تھے۔ زیادہ تر شاگرداں امیر اس میں حصہ لیتے تھے۔

امیر اللغات اردو کا وہ جامع لیکن ناکمل لغت ہے جو امیر کی کے نام سے منسوب ہے ۱۸۸۷ء میں سرالفرڈ لائل لکھنؤ گورنمنٹی فرمائش پر والی رامپور نواب کلب علی خاں نے اردو کی ایک مبسوط لغت تیار کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس وقت اگرچہ دربار رامپور سے وابستہ اور بھی شعور تھے لیکن امیر کا یہ چونکہ بلحاظ علم و فضل تمام شعرا میں بلند و مسلم تھا اسلئے یہ ہم خدمت اپنی کو سونپی گئی۔ امیر اللغات کا باقاعدہ ایک دفتر قائم ہوا اور کام شروع ہو گیا لیکن آنیوالے حالات نے ساتھ نہیں دیا۔ الف محدود اور الف مقصورہ پر مشتمل صرف دو حصے شائع ہو کر رہ گئے ۱۸۸۷ء احسن اللغات ثابت۔ مسکاتیب امیر مینائی علی

بھی ترک ملازمت کر کے ریاست کھیرا گڑھ چلے گئے۔ اب اس سلسلے میں حضرت امیر کی نظر جو ہر شناس اپنے شاگرد رشید جلیل پر پڑی اور چاہا کہ وہ رامپور آکر یہ کام انجام دیں لیکن مانپور میں جناب جلیل کے حالات کچھ ایسے تھے کہ وہ اپنے ضعیف والد کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاسکتے تھے اس لئے مجبوراً عذر کیا۔ اس کے جواب میں حضرت امیر نے جلیل کو جو خط لکھا اس سے ایک طرف جلیل کے مانپور چھوڑنے کی مجبوری اور دوسری طرف استاد کی اپنے شاگرد سے اس وابستگی کا اظہار ہوتا ہے جو جلیل کو رامپور بلانے کی ہمتی تھی۔

رامپور!

میرے پیارے جلیل

مُدّت سے ادھر تمہارا ادھر میرا جی چاہتا تھا کہ یکجائی ہو مگر اب جو اس کی گنجائش نکلی تو تم نے عذر کیا اور جن بزرگ کو تم نے اپنی اطاعت و صلاحیت سے خوش کر رکھا ہے انہوں نے مجھے لکھا کہ حافظ صاحب سے مجھے آرام ہے ان کو یہیں رہنے دیجئے اور میرا ان سے بہت کام ہے۔ سروسٹ تو میں نے تم سے دست بردار ہو کر وہ ہاتھ اپنے اس دل پر جو دیدار طلب ہے رکھا مگر آئندہ پھر دشوار ہے۔ یہاں آنا تمہارا ہو گا تو چرچے آچے ہیں تمہاری نیاقت جو فطرت میں ودیعت ہے بڑھے گی اور یہ بھی اُمید ہے کہ فلاح و رفاه کا دروازہ کھلے۔ اپنے بڑے بھائی صاحب کے لئے جو تم نے لکھا ہے ہم ان کی نیاقت تم سے زیادہ ہی مگر ان سے ایک ہی ملاقات ہوئی ہے۔ میرا دل تمہاری طرف ان کی نسبت زیادہ جھکتا ہے۔ اس کا کیا علاج ہے۔ انسان کے دو فرزند ہوتے ہیں مگر علاقہ دونوں کے ساتھ برابر نہیں ہوتا۔

اے جلیل کے والد حافظ عبدالکریم  
اے جلیل حسن جلیل

تم اپنے فراغ کی فکر رکھو بشرطیکہ اس صحبت میں شریک  
 ہونا تم کو پسند ہو اور جب حرکت ممکن ہو تو مجھے لکھنا۔  
 خدا کرے وہ وقت آئے کہ حسرت یکجائی برائے خط جلد  
 جلد لکھتے رہو اور حافظ خلیل حسن سے سلام و دعا کے بعد  
 کہو کہ میاں روٹھ نہ جانا۔ میں اس کو چاہتا ہوں جو تمہارا  
 بھی چہیتا اور پیارا چھوٹا بھائی ہے۔

میرے فرزند الیٰ ارجمند ماوجب کہتے ہیں اے  
 امسید فقیر



## دورِ ادور

### سفرِ رامپور و قیامِ رامپور

خوابِ جلیلؔ تو حضرتِ امیرؔ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے بچھین تھے۔ ان کے خط لے کر پرواز کا کام کیا۔ والد کو کسی طرح سمجھا بٹھا کر اور ان سے اجازت لے کر رامپور روانہ ہو گئے (۱۸۸۷ء تا ۱۸۹۰ء)۔ اس وقت رامپور میں نواب حامد علی خاں فرما رہے تھے۔ والیانِ رامپور کو شعر و سخن سے بڑی رغبت تھی۔ باوجود کثرتِ مشاغلِ ملکی و انتظاماتِ ریاستِ شاعری کے لئے وقت نکال لیتے تھے۔ وہ خود بھی شاعر تھے۔ ان کی سرپرستی قدر دانی اور شعری ذوق نے ریاست میں بڑے بڑے اربابِ فن کو جمع کر رکھا تھا۔ مقرب لوگوں کے قیام کے واسطے ایک اعلیٰ درجہ کا مکان مخصوص تھا۔ جو صاحبِ منزل کے نام سے مشہور تھا۔ مختلف علوم و فنون کے باکمال حضرات اور خصوصاً شعر بہت بڑی تعداد میں یہاں مرکوز ہو گئے تھے۔ اس اجتماع کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس وجہ سے دلی اور کھنؤ کے مختلف طرزِ آپس میں بل گئے اور ایک نئے طرز کی بنا پڑی۔ یہ نئی طرز کیا تھی۔ کس نے کس کا رنگ قبول کیا یہ بحثِ آئندہ سطور میں آنے گی۔ غرض اس سے قبل کہیں بھی دلی اور کھنؤ کے شعراء اس کثرت سے ایک مقام پر قیام پذیر نہیں ہوئے تھے۔ بمقابلہ اور شہروں کے

شعر کا مجمع خاص طور پر پسین زیادہ ہوا۔

اب حکمرانوں نے عالموں میں مولانا ارشاد حسین، علامہ عبدالحق خیر آبادی، علامہ عبدالحق سید حسن شاہ محدث اور مفتی سعد اللہ، شاعروں میں شیخ امداد علی بھر، میر اسماعیل حسین تیر، آفتاب العلوی قلی، احمد حسین عروج، مرزا رحیم الدین حیا، امیر اسد نسیم، ممتاز علی آہ، دیم خیر آبادی، حکیم فاضل علی جلال اور جان صاحب وغیرہ کو اپنے دربار میں جمع کر کے اُردو شاعری کو گنگا جمنی کر رکھا تھا۔ مرزا داغ دہلوی اس وقت تک رامپور چھوڑ چکے تھے البتہ جلال، رامپور دوبارہ واپس آ گئے تھے۔ ریاض خیر آبادی اور جگر بسوانی جب رامپور آتے تو ان صحبتوں کا لطف دوبالا ہو جاتا تھا۔ مختصر یہ کہ رامپور کا قلم جاب طیل کی زندگی کا اہم زمانہ ہے۔ دہلی اور کھنؤ کے حوالے سے لیل کرتے ہیں۔

”مصاب منزل آراستہ ہے۔ فرش مکلف بچھا ہے اور اس پردہ لوگ رولتی افروز ہیں جو انتخاب روزگار سمجھے جاتے ہیں اور فی الواقع ہیں۔ ایک جانب فضلا اور علمائے عصر کی نشست ہے۔ ایک طرف شعرائے نامدار کی جماعت بیٹھی ہے۔ آپس میں بڑے مزے کی مکالمت ہو رہی ہے۔ خصوصاً علمی تذکرہ وہ لطف دینا ہے کہ روح کو بالیدگی ہوتی ہے اور دل تروتازہ ہوتا ہے کبھی شاعری چھڑ جاتی ہے۔ اشعار ابدار پڑھ جاتے ہیں کبھی مسائل علمی و ادبی موضوعات پر بحث ہوتی ہے۔ الفاظ و محاورات کی تنقید ہوتی ہے۔ غرض یہ وہ پاکیزہ محبت ہے جو کم نصیب ہوتی ہے۔“

لہ ۱۸۵۷ء کی تباہیوں کے نتیجے میں جب عزت و آبرو و خطروں میں پڑ گئی تو لکھنؤ اور دلی کے شعرائے بے کچھ اطراف و قرب و جوارب کی ہندوستانی رہا ستوں مثلاً الور، چے لید، بھرت پور اور پٹیلہ وغیرہ میں پناہ گزین ہو گئے۔ کچھ اسلامی ریاستوں ٹونک، بھوپال، منگول اور بھادلو کی طرف چلے گئے اکثروں نے رام پور کا رخ کیا کیونکہ وہ دہلی اور لکھنؤ سے قریب و تاریخی اذ لہود۔ رام پور سکینہ ص ۴۱۲} لہ فعات جنگ طیل۔ سوانح امیر میانی ص ۳۳ ۱۹۲۸ء

انہی محبتوں میں جلیل کی علمی استعداد کو جلا ملی اور ذوقِ شاعری میں اضافہ ہوا۔ یہاں شاعر بہت ہوتے تھے اور بڑے اہتمام سے ہوتے تھے۔ بعض خاص مشاعرے جھیں سرکاری حیثیت حاصل تھی ان پر حضرت امیر مینائی کی نگرانی قائم تھی۔ واسپور کے آخری دور کے ان شاعروں میں جلیل کے جوہر ایسے چمکے کہ ہم عصروں کی نگاہیں ان کی طرف اٹھنے لگیں۔

جلیل حسن جلیل دفتر امیر اللغات میں کام کرنے کے لئے طلب کرتے گئے تھے۔ رام پور پہنچنے پر دفتر امیر اللغات کا کام بحیثیت سکرٹری مکمل طور پر جلیل کے سپرد ہو گیا۔ اس کام کو جلیل نے جس دلچسپی اور قابلیت کے ساتھ انجام دیا اس کو دیکھ کر کچھ اہل ذمہ داریاں بھی انھیں سوئپ دی گئیں۔ ان تمام ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتے ہوئے وطن سے دور نہ کر جب چند سال گزر گئے تو جلیل بدقت تمام اجازت حاصل کر کے کچھ دنوں کے لئے مانگ پور گئے۔ لیکن مصروفیتوں کے پیش نظر یہ قیام بہت مختصر رہا۔ جلد ہی رام پور واپس آئے اور آتے ہوئے اپنے والد ماجد کا خط جناب امیر مینائی کے نام لائے۔ اس کے جواب میں حضرت امیر نے جو خط مولانا عبدالکریم صاحب کو تحریر کیا اس سے واسپور میں جناب جلیل کے گونا گوں مشاغل پر روشنی پڑتی ہے۔

رامپور

مخدوم و معظم مکرم و محترم زاد اشفاقکم۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بسم اللہ کہ محبی جلیل حسن سلیم بالادما صاف الحسن مع الخیر آئے اور آپ کا نواز ششامہ برکت شامہ لائے۔ میں نے اس کو سر پر کھا کھو سے لگایا۔ حتی الامکان نور چشم جلیل کو دور قرآن شریف کے واسطے مہلت دیجائے گی۔ یہ رولت ہوگی گھٹ جائے تو تاکید بھی کی جائے گی مگر اس کا علاج کیا کہ وہ حد سے زیادہ ناتواں ہیں۔ ادھر تو شاعری کے شوق نے ان کے دماغ کو ضعیف کر دیا ہے ادھر لغت کا کام بھی دماغی ہے۔ میں کوشش و تاکید سے قراؤد واقعی کام لوں گا تو ان کی

سعادت سے اُمید ہے کہ وہ اس کام کو پورا تو کر لیں گے مگر التزام کی  
سے ہمیشہ دُور رہنا دشوار ہے۔ یہ جامہ آپ کی اولاد میں عزیز ارچا  
جلیل ہی کی قامت سراپا سعادت پر قطع ہے۔ جلد جلد رخصت دے  
کے باپ میں جو آپ نے ارشاد فرمایا اس میں حیران ہوں کہ تعمیل  
محکم کیونکر کروں۔ خداوند تعالیٰ ایسا سامان کر دے کہ بہت جیسے  
لائق لوگ اس دفتر میں جمع ہو جائیں تو علی سبیل البہل سب کور  
ہٹا کرے۔ یہ بات آپ کی دُعا پر موقوف ہے۔ میری طرف سے  
نور چشم جلیل کی والدہ کے حضور سلام والتجلی دُعا کیجئے اور والدہ  
دخواہان معود عافیت محمود کی طرف سے بھی سلام پہنچائیے۔ محمد احمد  
مع برادران کو چک خصوصاً مسعود احمد سلمہ اللہ بصد عجز و انکسار  
تسلیم گزار میں اور ہمیشہ دُعا کے اُمید دار۔ عزیز از جان خلیل حسن  
صاحب کو سنت و سلام محبت التیام پہنچے۔ زیادہ کیا مکلف شد  
ہوں۔ سب عزیزوں کو اندر باہر مادیب۔ فقط

سراپا تقصیر حسرت خیر  
فقیر امیر

## حضرت امیر و جناب جلیل کے باہمی تعلقات

تحریر مذکور سے ایک طرف اس امر کا انکشاف ہوتا ہے کہ امیر مینائی اور  
جلیل کے والد کے تعلقات کتنے گہرے تھے۔ دوسری طرف جناب جلیل کے مشاغل و انہماک  
کا علم ہوتا ہے نیز یہ کہ امیر و جلیل کے درمیان استاد و شاگردی کے علاوہ ایک قسم کی  
روحانی اور عزیزانہ دوستی بھی تھی درحقیقت یہ محبت و انسیت اس وقت قائم ہو گئی تھی  
جب ان دونوں میں سے کسی نے ایک دوسرے کو دیکھا نہ تھا۔ صرف تحریری عبادت

تعارف تھی۔ اس کشش نے جلیل کو رامپور بلوانے پر امیر کو مجبور کیا اور پھر جب جلیل آکر پہلے  
 تو چند روزہ یکجائی کے بعد ہی حضرت امیر نے یہ محسوس کیا کہ وہ جلیل کو جیسا سمجھتے تھے  
 وہ اس سے کہیں زیادہ چاہے جانے کے قابل تھے۔ جوہر شاعری سے قطع نظر جس وصف  
 نے جلیل کو امیر مینائی کے قریب تر کر دیا وہ ان کی سیرت اور عبادت گزاری ہے۔ شاگرد  
 کے ساتھ استاد کا سلوک ہندوستان میں پدرانہ تھا۔ انھوں نے جلیل کو اپنے یہاں اپنے  
 ساتھ رکھا اور ان کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا جیسا کہ اپنے استاد پتھر کے صاحبزادوں  
 اور اپنے فرزندوں کے ساتھ کرتے تھے۔ انہی کی معیت میں شجرۃ العروص کا درس دیتے  
 اور شاعری کے نکات کی تشریح فرماتے۔ فیضانِ ظاہری و باطنی کا یہ سلسلہ امیر مینائی کی  
 وفات یعنی ۱۷۱۲ سال تک جاری رہا۔ اس طرح جلیل نے استاد کے فیض صحبت میں تحصیل  
 علم کے ساتھ ساتھ زندگی کے عقائد نظریات، آداب و اقدار، مزاج و ذوق بلکہ زندگی  
 کے اکثر شعبوں میں حضرت امیر کے اتباع و تقلید کو افضل سمجھا۔

قیام رامپور کے زمانے میں جناب جلیل کئی مرتبہ وطن گئے۔ ۱۸۹۶ء میں والد کے  
 علالت کی خبر پا کر گئے جیسا کہ امیر مینائی کے اس مکتوب سے ظاہر ہوتا ہے۔  
 ”حافظ جلیل حسن اب تک وطن سے نہیں آئے۔ ان کے والد بیمار  
 ہو گئے اس لئے رخصت سے زیادہ توقف کیا۔“

ایک اندازے کے مطابق ۱۸۹۷ء کے اواخر میں جلیل کے والد نے انتقال کیا واپس آکر  
 جلیل رجوع ہوا ہو گئے لیکن بعد ازاں جب بھی جلیل کو وطن جانا پڑا تو استاد و شاگرد کے  
 درمیان خط و کتابت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

۱۔ جناب جلیل اپنی کتاب سوانح امیر مینائی میں لکھتے ہیں: ”کتاب شجرۃ العروص مصنفہ حضرت  
 امیر بکھنوی امیر کے صاحبزادوں کے ساتھ میں نے بھی ان سے (جناب امیر) سبقتاً سنا ہے  
 ہے۔“ ص ۷۳

۲۔ ذکی کارکردی، جلیل مانچھوری ص ۴۱۔ ۱۹۷۸ء لکھنؤ

۳۔ احسن اللہ خان شائق، مکتائب امیر مینائی، ص ۱۹۶

ریاست رام پور

پیارے جلیلِ سلمک اللہ الٰہی

آج کا ڈاک بک وطن سے تمہاری رسید نہیں آئی۔ شاید تم راہ میں اٹکے اور رائے بریلی میں مشاعرہ کا میدان مارنے کے لئے ڈٹ گئے۔ میری تنہائی اور سبکی کا خیال رہنا ضرور ہے۔ جو کچھ دن میری جدائی کے ہیں وہ اربابِ وطن کے دھیان میں صرف ہوں تو بہتر ہے۔ میں رخصت کے وقت سے تمہاری جدائی کی پہاڑی گھڑیاں گن گن کر بڑی سختی سے کاٹ رہا ہوں۔ تم شیریں کی طرح خسرو کے محل پر پرہ پھیلا نا۔ عید الفصحی آتے راہ میں ایسی رک گئی کہ آہی نہیں چکتی۔ وہ آئے تو اس سے تمہاری آمد کا شرہ سنوں اور خوش ہوں۔

امیر فقیر لہ

۲۱ مئی ۱۸۹۵ء

ریاست رام پور۔

ذوالحجۃ الاثین پیارے جلیلِ سلمک اللہ الٰہی

سلام مسنون اخلص و دُعا مستحون کے بعد مدعا نگار ہوں کہ اس وقت محبت نامہ سعادت شامہ آیا بند انتظار سے چھڑایا۔ مجھے جس وقت آپ کی تحریر پہنچی میں نے بواہی ڈاک اس کا جواب لکھ دیا۔ یہ تیسری تحریر آپ کی آئی۔ آپ لکھتے ہیں یہ جو جتنی تحریر ہے تو ایک مجھے نہیں پہنچی حضرت شاہ محمد اسماعیل سجادہ نشین مانگپور کی خبر رحلت سخت روح فرسا ہوئی۔ افسوس زمانہ اربابِ کمال اور مظاہر شیوں جمال سے خالی ہوتا جا رہا ہے حافظ صاحبِ عجب اتفاق ہے کہ جب آپ وطن تشریف لیجاتے ہیں تو ایسے واقعات پیش آتے ہیں کہ وطن جانے کا سرور غم میں بدل جاتا ہے۔ جب حافظ صاحب اور پیارے جلیل کی خدمت میں بکمال غلوں و محبتِ مادِ جب،<sup>۱</sup> امیر فقیر

ریاست رام پور

پیارے جلیل۔ خدا تمہاری عمر دراز کرے اور ہمشمول میں  
تم کو متاثر کرے۔ نامہ سعادت ایسے وقت آیا کہ آنکھیں تم کو ڈھونڈتی  
تھیں۔ اس لئے کہ معیارِ رخصت متقنی ہو چکی تھی۔ بہر کیف ادراس  
خیریت سے اطمینان ہوا۔ قطع نظر اس سے کہ جدائی شاق ہے مگر  
کی ابتری اور دقت کی نزاکت کا خیال آپ کو ضرور ہونا چاہیے  
زیادہ اس باب میں لکھنا فضول ہے۔ اما قائل تکفیتہ الا اشارہ  
میری طبیعت زیادہ مکر ہے۔ بہر حال شکر ہے۔ جتنی بہت یاد کرتی  
ہے۔ اپنی والدہ ماجدہ کو بہت بہت سلام و دعا کہتے اور سب بچوں  
کو بھی۔ سب عزیز اندر باہر دعائیں مانگتے ہیں کہ الٹی جلد پھر یہ  
دیرانہ آپ کے دم سے آباد ہو۔ دہلی کو ماوجب میرے سارے

گھر کی طرف سے کہئے۔ فقط ۱۱

۹ اکتوبر ۱۸۹۸ء  
اتیر فقیر

یہ خطوط جو نجی طور پر لکھے گئے اس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ جلیل اتیر کے شاگرد ہی  
نہ تھے اور بہت کچھ تھے۔  
پیشی کے منشی :

امیر مینائی کی شب و روز کی مصروفیت میں جناب جلیل جملہ شاگردوں میں  
سب سے زیادہ قریب و عزیز نظر آتے ہیں۔ استاد آپ ہی کے قلم سے غزلوں پر اصلاح  
لکھواتے۔ بعد میں جب کثرت کار اور پیرانہ سالی کے باعث زیادہ کام کرنا دشوار ہو گیا  
تو جلیل کو اجازت دیدی گئی کہ وہ خود دیکھ لیا کریں۔ اس طرح بشمول اصلاح جملہ خطوط  
وادبی استفسارات کے جواب بھی اتیر کی طرف سے جلیل ہی انجام دیتے تھے۔ اس  
بیان کی تصدیق صدیق الزماں کی تحریر سے ہوتی ہے جو نبیرہ حضرت امیر مینائی تھے۔

لکھتے ہیں :-

اپنے کلام کے علاوہ دوسرے شاگردوں کا کلام بھی اُستاد  
(حضرت امیر) کو سنا کر اصلاح لینا انہی کے ذمہ تھا۔ عموماً  
اصلاح بعد نماز عشاء ہوتی تھی..... حضرت جلیل کی مشق  
سُحُن اتنی بڑھتی گئی کہ آخر زمانہ میں استاد کلام کی اصلاح بھی انہی  
کے سپرد فرما دیا کرتے تھے۔“ ۱۔

اس طرح جلیل امیر کی پیشی کے منشی بھی تھے۔ جلیل رام پور سے جب کہیں چلے جاتے  
تو ان کی واپسی تک شاگردوں کی غزلوں پر اصلاح کا کام رکا ہوا رہتا۔ اس کا تذکرہ امیر  
کے خطوط میں جا بجا آتا ہے۔ جو انھوں نے اپنے شاگردوں کو لکھے ہیں۔

”حافظ جلیل حسن جلیل بحکم ضرورت دفعۃً وطن روانہ ہو گئے چلتے

وقت جلدی میں آپ کی غزلیں اصلاح طلب ان کو ڈھونڈے

نہ ملیں۔ میری پیشی کے منشی کا کام سب ان سے متعلق ہے“ ۲۔

”میری پیرانہ سالی اور خستہ سالی پر نظر کر کے میری کوتاہ قلمی کا خیال

نہ کیجئے و بحکم رشد و سعادت و خلعت و محبت ہمیشہ حالات خیریت

سے سرور کیجئے۔ جلیل رخصت لے کر وطن گئے ہوئے ہیں“ ۳۔

”دو قصیدے جو آپ نے بھیجے تھے ان پر سرسری نظر میں نے کی تھی

وہ بہت اصلاح کے محتاج ہیں۔ میری پیشی کے منشی حافظ جلیل حسن

جلیل سکرپٹری امیر اللغات رخصت لے کر وطن گئے ہوئے ہیں۔ ۴۔

قصیدے انکی غیبت میں نہیں مل سکتے۔ وہ آئیں تو نکلو اگر دیکھوں“ ۵۔

۱۔ ہندوستانی ادب۔ جلیل نمبر۔ جلد ۶ شمارہ (۸-۹) ۱۹۶۲ء ص ۹۲

۲۔ احسن اللہ خاں ثاقب۔ مکاتیب امیر مینائی۔ ص ۱۹۵

۳۔ ص ۳۰۵

۴۔ ص ۳۱

حضرت امیر نیائی کے سارے ملک میں پھیلے ہوئے تلامذہ جس کثرت سے غزلیں اصلاح کے لئے بھیجا کرتے تھے اس کا اندازہ جلیل کے ایک خط سے ہوتا ہے جو ہزمانہ قیام راسپور انھوں دلی شاہجیہاں پوری شاگرد امیر کو لکھا تھا:

ریاست رام پور - ۳ مارچ ۱۸۹۶ء

محبی و شفیقی - تسلیم!

نامہ ہائے عنایت صادر ہو کر باعث پذیر ی ہوئے۔ آج خدا خد کر کے آپ کی غزل ملاحظہ سے گزری۔ ہمراہ رقیہ نیاز بھیجتا ہوں۔ آپ شاگرد ایسے شخص کے ہوئے جو تمام عالم کا استاد ہے پھر کیونکر اصلاح میں تاخیر نہ ہو۔ اصلاح طلب کلام کے بستے کے بستے پڑے ہیں۔ میری جانب سے آپ کی تعمیل ارشاد میں مطلق تساہل نہیں ہوتا اور نہ کبھی ہوگا۔ دوسری غزل بعد کو روانہ کی جائے گی! ابھی وقت درکار۔ حضرت قبلہ و کعبہ آپ کو بہت بہت دعا کہتے ہیں اور سب سلام رساں ہیں۔“

آپ کا نیاز مند جلیل ذیل

جلیل ابتداء میں امیر فقر کی تقلید میں جلیل ذیل لکھتے تھے۔ بعد میں ترک کر دیا اصلاح کلام کے تعلق سے تلامذہ کے جو خطوط آتے تو ان کے ساتھ مختلف مسائل بھی درپیش ہوتے جناب جلیل کو ان سے نبٹنا پڑتا۔ ایک صاحب جنھوں نے اپنی غزل بغرض اصلاح بھیج کر زمرہ تلامذہ میں داخل ہونا چاہا ہے ان سے جلیل یوں مخاطب ہیں۔

”دتر امیر اللغات۔ ریاست رام پور

جمع محاسن اخلاق زادت اخلاقکم۔ تسلیم و تکریم  
فصیب اعدا حضرت (امیر نیائی) کا مزاج تقدس متزاج صحیح نہیں  
رہتا۔۔۔ مگر آپ نے اپنے آقا ولی نعمت کا شوق تلمذ جو حد سے

زانگہ ظاہر فرمایا تو باوصف، بحکم موانع غزل بطیب خاطر ملاحظہ فرمائی  
اور کمترین کو حکم دیا کہ میں غزل اصلاح شدہ آپ کو بھیج کر حقیقت حال  
عرض کروں۔۔۔۔۔

حضرت نے اصلاح کم دی ہے۔ اس وجہ سے کہ طبع ہمایوں حضرت  
مصنف سے اسکا ہی نہیں کہ زیادہ اصلاح پسند ہے یا اتنی بھی گراں گزر سکی  
اتندہ رسم خط و کتابت سے مزاج شناسی ہو جائے گی تو اس کے  
مطابق اصلاح دی جائیگی۔ اخلاص مند  
جلیل حسن جلیل طے  
۲۵ دسمبر ۱۸۹۵ء

جلیل کا یہ خط اس لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ بہ سحر پیر امیر کے انداز اصلاح  
کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ ایک اور دلچسپ خط کا ذکر یہاں دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا جو  
انھوں نے دفتر امیر اللغات سے الہ آباد کے ایک صاحب محمد نوری کو لکھا تھا۔  
ریاست نلیم پور۔

مکرمہ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ  
آپ کا خط قبلہ و کعبہ کے نام آیا۔ مضمون متدرجہ کے دیکھنے سے کمال تعجب  
ہوا۔ آپ لکھتے ہیں کہ ”آپ کے دوست ہر سینے میں غزلیں بنا دیا  
کر دیں۔ چھ روپیہ سالانہ ان کو دوں گا“ اور اس کے ساتھ شرائط  
بھی لکھیں اور آخر میں یہ بھی ہے کہ در صورت نامنظوری کے دسیا  
پڑی ہے۔ باوجود لیاقت و فراست بہ سخاوت و دفاعت خیالی  
ہیں آتا کہ آپ نے ایسا لکھا ہو۔ شاید چھ سو تک جگہ چھ کی رقم سہو  
قلم سے نکل گئی ہے۔ بہر کیف تحریر ایسی نہیں کہ اس کے جواب میں  
حضرت قبلہ و کعبہ اذقات گرانمایہ ضائع فرمائیں۔ مختصر جواب یہ ہے  
کہ وہ صاحب [جناب امیر] ایسے نہیں ہیں جیسا کہ آپ نے خیال

کیا ہے۔ اس خیال سے آپ درگزر کریں۔“

جلیل حسن جلیل سکرٹری

اس مکتوب سے ایک بات تو یہ ظاہر ہوتی ہے کہ جلیل نے مکتوب الیہ کے گستاخانہ لہجے کا کس نرم گفتاری سے سنجیدہ انداز میں جواب دیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس نوعیت کے خطوط کے جوابات جناب امیر سے رجوع کئے بغیر دیدیئے جاتے تھے۔ جلیل کے ایک مکتوب میں سے اس امر کی بولی تصدیق ہوتی ہے۔

”کھلا ہوا خط پہنچا۔ میری مجال نہیں کہ میں اس کو حضرت قبلہ و کعبہ کے

حضور میں پیش کروں۔ اس کا مضمون دیکھ کر قطعی گمان ہے کہ

حضور کو سخت ناگوار ہوگا۔“

مرزا داغ دہلوی اور جناب امیر ایک دوسرے کے حریف سمجھے جاتے تھے۔ ایسا

معلوم ہوتا ہے کہ اس تعلق سے بھی استفسارات ہوتے تھے۔ اختلاف رائے سے بچنے

کے لئے درمیانی صورت اختیار کی جاتی تھی۔ اعتدال پسند رویہ اختیار کیا جاتا تھا

اور یہ بار بھی جلیل ہی کو اٹھانا پڑتا تھا۔ اصل بحث پس منظر میں ہے۔ خط میں صرف اس

جانب اشارہ ملتا ہے جو محمد حسین بہادر دیوان ریاست کھیراگر ٹھہ کا موسومہ ہے:

رام پور

عالی جناب مستثنیٰ عن القاب زادت التفاتکم

آداب بعد ادب قبول ہو

۲۔ مارچ کا قدسی صحیفہ آیا..... بشکر یہ جداگانہ عرض کروں گا اور

اسی کے ساتھ اپنی کوتاہی قلم کا عذر بھی نکھوں گا جس کی وجہ سے

اپنے خادم جلیل کی طرف زیادہ توجہ صرف کرنا پڑی۔

بات کو کہ لی سرے قاتل نے گنہگاروں میں

اس گنہ پر مجھے مارا کہ گنہگار نہ تھا

اس وقت صرف امور مستفسرہ کا جواب گزارش کرتا ہوں۔ دوسرے صفحہ پر ملاحظہ فرمایا جائے۔ واقعی مسئلہ بڑی الجھن کا تھا۔ مشکل سے یہ پہلو نکالا گیا کہ وہ [جناب داغ] مد مقابل بھی قرار دیتے گئے اور حضرت (امیر) کی ترجیح بھی ثابت ہو گئی۔ میں نے جوابات لکھ کر حضور میں پیش کر کے حضرت کی رائے بھی شریک کر لی ہے۔ اب جناب کی رائے پر منحصر ہے۔

فرمان بردار جلیل

ان امور سے قطع نظر امیر اللغات کی طباعت و اشاعت اور اس کی قیمت بارے میں جو خطوط ہندوستان کے مختلف مقامات سے آتے اس کے جوابات بھی جلیل پڑتے۔ جے پور کے ایک اہل ذوق سراج احمد کے خط کا جواب یوں دیا ہے۔

۱۹ اکتوبر ۱۸۹۸ء

ادفتر امیر اللغات۔ ریاست رام پور

مندہ لہذا از سلام نیاز۔ گرامی نامہ مورخہ ۱۶ ماہ حال صادر ہوا۔ یاد آوری کا شکر گزار ہوں مستفسرہ امور کا جواب حسب ذیل ہے۔

امیر اللغات کی بقیہ جلدیں ہنود طبع نہیں ہوئی ہیں۔ امید ہے کہ تیسری جلد غریب طبع ہو۔ وقت پر اطلاع دیں گا۔ دونوں تیار شدہ جلد کی قیمت مع محصول ڈاک بارہ روپے ۱۲ آنے ہے۔ عام خریداروں کے مقابل میں صرف ان حمار کو تخفیف دی جاتی ہے جو یکمشت سو روپے کی کتابیں خریدیں۔ اتنی رعایت آپ کے ساتھ بھی ممکن ہے کہ محصول ڈاک نہ لیا جائے اس سے زیادہ ناممکن۔

نیاز مند

جلیل حسن جلیل سکریٹری دفتر

## امیر اللغات اور مالی مشکلات :

امیر اللغات کی تالیف ان حالات میں شروع ہوئی کہ اسے کوئی باقاعدہ کاری یا غیر سرکاری امداد حاصل نہ تھی۔ اس میں شک نہیں کہ ابتداء میں اس کی بہت پذیرائی ہوئی۔ بعد ازاں یہ صورت بھی باقی نہ رہی اور طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

امیر اللغات کی مالی حالت کا اندازہ ممتاز علی آہ کے ان خطوط سے ہوتا ہے جو انھوں نے رام پور سے مختلف اصحاب کو لکھے تھے۔ ریاض خیر آبادی کو ایک مکتوب میں تحریر کرتے ہیں۔

”نفت میں ہزاروں روپے کی قرضداری ہوگئی۔ ایک جلد نہیں بچی۔  
کیڑا کھائے جاتا ہے۔ یہ قرض کس کے گھر سے ادا کیا جائے اور پھر  
ٹھوڑا نہیں پندرہ سولہ ہزار روپے اور آگے کی تالیف بند ہوئی جاتی ہے  
کس کی گمرہ کاٹی جائے۔“ (تحقیق، ص ۳۲۲)

ایک اور خط جو محمد حسین دیوان ریاست کھیرا گڑھ کا موسومہ ہے۔ اس میں امیر اللغات کی مالی حالت کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

”سوئے ریاست بھوپال کے اور کسی ریاست نے کچھ امداد نہیں کی۔  
اس ریاست سے کچھ اور بھی قرضہ ملا تھا۔ وہ بھی ختم ہو گیا۔ ملک نے  
اور کوئی قدر نہ کی نتیجہ یہ ہوا کہ پندرہ ہزار روپیہ ریاست کا اس کتاب کی

لے ممتاز علی آہ ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے۔ وہ ۱۸۸۹ء میں امیر کے طلب کرنے پر رامپور آئے اور دفتر کے معتمد مقرر ہوئے امیر مینائی کی شریک حیات کے خاندان کی رشتہ داری ممتاز علی آہ کے گھرانے سے تھی۔ اسکے علاوہ ممتاز علی آہ، محمد احمد مینائی (امیر کے خلف اکبر کے شریک حیات کے سگے چھوپی زاد بھائی تھے۔ (جادید اقبال - تحقیق، ص ۳۳۲)

لے۔ نواب مشتاق علی خاں والی رامپور نے پندرہ ہزار روپے لغات کیلئے قرض دیئے تھے۔ یہ قرض امیر اپنی زندگی میں ادا نہ کر سکے امیر کے بعد یہ روپے ان کے بیٹے محمد احمد مینائی کی تنخواہ میں وصول ہو گیا۔

بدولت منشی صاحب پر قرض ہو گیا ہے،“ لے

بعد ازاں امیر اللغات پر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اس کا دفتری مالی مشکلات سے اور بھی دوچار ہو گیا جس کے باعث حضرت امیر میاں نے دفتری کاروبار خود اپنے ہاتھ میں لے لئے اور اس طرح اہل دفتر کے لئے بیروزگاری کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس خبر سے جلیل کے اعزہ کو بھی ٹکریں دامنگیر ہو گئیں۔ اس بارے میں جلیل نے اپنے برادر بزرگ حافظ خلیل حسن کو جو خط لکھا تھا اس سے امیر اللغات کی صحیح صورتِ حال کا اندازہ ہوتا ہے۔ خط کا اقتباس درج ذیل ہے۔

دفتر امیر اللغات۔ ریاست رامپور

۳۱ دسمبر ۱۸۹۳ء

بھائی صاحب

..... وہ رقم جس سے امیر اللغات کی پرورش ہو رہی تھی داخل خزانہ ہونے سے امیر اللغات قالبِ بیجان ہو کر رہ گیا ہے اب اس کے مُردہ جسم میں رُوح پھونکنے والا حضورِ مہرِ لورہ کی توجہ کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ ممبرانِ کونسل کنارہ کش ہو گئے حضرت قبلہ کذاتِ خود اتنی قدرت کہاں کہ وہ اس بارِ عظیم کے متحمل ہو سکیں۔ یہ بالکل غلط خیال ہے کہ رام پور سے نکلتے ہی ہر طرف سے لوگ آغوش کھول کر جلیل کو لینے کے لئے دوڑیں گے۔ جلیل چیزِ ہر کیا ہے۔ بھائی صاحب دُنیا کا رنگ بیڑھب ہے۔ ہاں اطمینان کی بات فقط اتنی ہے کہ مجھے اس تغیرِ روزگار سے ہراس نہیں ہے

کارِ خویش را بخداوند کار ساز

بسیرہ ایم تا کرم او چہا کند

حضرت والدین یا کسی کو ذرا تردد نہ کرنا چاہیے اور کرنا کیا چاہئے۔ دعا جلیل

لے جاوید اقبال تحقیق۔ پاکستان شمارہ (۵) ۱۹۹۱ء ۳۲۹ لے نواب حامد علی خان دانی رامپور  
اسوقت پور کی سیاحت پر تھے۔ لے کارنامہ جلیل۔ ص ۲۶، ۲۷

امیر اللغات کے یہی وہ غیر یقینی حالات تھے جس نے آمیر میناں کو جناب جلیل کی طرف سے فکر مند کر دیا تھا۔ اس صورت حال اور مالی دقتوں کے سبب ملازمت کا سلسلہ جاری رکھنا ممکن نظر نہ آتا تھا۔ حالات کل کیا موڑ اختیار کرتے اس کا اندازہ ہو چکا تھا۔ حضرت امیر جناب جلیل کو کسی قیمت پر چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ دفتر بند ہو جانے کی صورت میں ان کے لیے کوئی متبادل ملازمت کی تلاش ضروری معلوم ہوئی چنانچہ اس تعلق سے انہوں نے جو خط اپنے شاگرد و عزیز حکیم عابد علی کو تحریر فرمادی کو دکھا وہ امیر کے اپنی خیالات کی تفسیر ہے۔

رامپور

پیارے کوثر بلقوت کاغذ میں لکھوا کر بھیجتا ہوں۔ اسے آپ دیکھ کر اپنے مراسم کے موافق احمد علی خان منصور آبادی کو جلد لکھ کر بھیج دیں اور کوئی دقیقہ کار برآری کا فروگزاشت نہ کریں۔ مجھے محبی جلیل سے سخت انفعال ہے اور ان کی کامیابی کا نہایت خیال ہے۔ افسوس عوارض و مکارہ کا وجہ سے میں سفر نہ کر سکا ورنہ ضرور ان سے وعدہ و ناکرتا اور یہ سبب اس کے کہ جلیل کو دفتر سے علیحدہ ہونے دینا مجھے پسند نہیں ان کے والد مدد و پیش خدمت ضعیف دنیا کے تعلقات سے ناکارہ مکان پر ہیں۔ ان سے کوئی دنیاوی کارروائی نہیں ہو سکتی بلکہ وہ خود پیرہ سال سے ایک دسویں خدمت گزار کے محتاج ہیں۔ ان وجہ سے جلیل دور جانا نہیں چاہتے ورنہ دکن میں ان کا نوکر رکھوانا ممکن تھا آدمی یہ ایسے اچھے ہیں کہ جہاں ہوں وہاں اسلامی برکات پھیلیں۔ میں ان کی علمی لگی کو اپنی بد قسمتی جانتا ہوں مگر مجبوری گوارا کرتا ہوں بشرطیکہ اس جوار یعنی قریب وطن میں ان کے بسر وقات کی کوئی صورت نکلے۔ مجھے غیب معلوم ہے کہ اس جوار میں عموماً لوگ تمہارے معتقد ہیں اور خصوصاً احمد علی خاں کو تمہارا بہت ہی لحاظ ہے تم تہہ دل سے کوشش کرو گے تو جلیل کامیاب ہو جائیں گے۔ لہذا بہت ہی اصرار سے

لکھا ہوں کہ سرگرم حاجت روائی ہو جئے۔ آج کل پریشانیاں بڑھی ہوئی  
ہیں امداد رحم فرماتے۔ میں بہت منتظر رہوں گا کہ کب آپ احمد علی خاں صاحب  
کا خط شعر طلب جلیل بھیجیں گے۔ تعمیل دیکھیں گے ساتھ کوشش کیجئے۔

امیر فقیر

اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت امیر امیر اللغات کے مستقبل سے مالوس تھے اور  
اب اُن کی تمام تر توجہ اس بات پر مرکوز تھی کہ دفتر بند ہو جانے سے پہلے جلیل کوئی مستقل ملازمت  
کی صورت پیدا ہو جائے۔

بعد کے حالات بتاتے ہیں کہ نواب حامد علی خاں والی رام پور کی یورپ سے واپسی  
پر حالات نے کچھ سنبھالا لیا اور کچھ عرصہ کے لئے جلیل کو فیکرِ معاش سے چھٹکارا ملا۔ سانس لینے  
کو ذرا سی بہت مل گئی جیسا کہ جلیل کے اس خط کے اقتباس سے ظاہر ہے جو مایکپور بھیجا گیا  
تھا۔

ریاست رام پور

جناب بھائی صاحب۔ تسلیم و تحریم

..... حضرت قبلہ [امیر مینائی] حضور میں حاضر ہوئے عظمت

و شان سے پیش آئے۔ بہت سی باتیں ہوئیں جن سے مفید نتیجہ نکالا  
جا سکتا ہے۔ امیر اللغات کا دو سرا حصہ بڑی دلچسپی سے ملاحظہ فرمایا  
اور خوش ہوئے۔ .....

میں دفتر امیر اللغات کی طرف سے آپ لوگوں کو اطمینان دلانا ہوں۔  
جہاں تک خیال کیا جاتا ہے کوئی مقام تردد اور خدشہ کا نہیں حضور  
کی توجہ اور التفات اس لغت کی طرف اُمید سے زیادہ پائی گئی۔

۱۔ احسن اللغات ثاقب۔ مکتب امیر مینائی ص ۱۱۶ ۳۔ متنازع علی آہ اپنی سوانح امیر میں لکھتے  
ہیں۔ ”امیر مینائی ۱۸۸۸ء میں لغت کی امداد کیلئے لکھنؤ تیار ہوئے پٹنہ تک کا سفر کیا اس سفر پر  
حضرت یاقین اور دو چار شاگرد بھی ہمراہ تھے۔ مالی امداد کی کہیں کوئی صورت نظر نہ آئی۔ واپسی پر نواب علی عثمان یوں نے دنگی  
فرمائی کہ دوسلوں میں ۱۶ ہزار روپے لغت کی تالیف کیلئے ریاست سے قرض لیے جائیں۔“ امیر مینائی ۱۹۲۱ء ص ۱۲۵

بار بار کہا مٹی صاحب [ جناب امیر ] اس نے بے ہا کتاب کو جلد مکمل کیجئے  
جلتیل

۱۲ جنوری ۱۸۹۲ء

اس طرح نواب سوصوف کی توجہ سے دفتر امیر اللغات کی شکلات جو درپیش  
تھیں وہ گویا کچھ عرصہ کے لئے ٹٹی گئیں۔

## سفر بھوپال و بنارس

امیر اللغات کا کام لوں تو جاری تھا لیکن حضرت امیر نے یہ اندازہ اچھی طرح لگا  
تھا کہ یہ صورت بھی عارضی ہے۔ کہیں آدھی کوئی مستقل سبیل نکلتی چاہیے۔ ان کی نظر میں ریاست  
بھوپال اور ریاست حیدرآباد دو ہی مقامات ایسے تھے کہ جہاں مقصد برآری کی اُمیدیں دلستہ  
کی جاسکتی تھیں۔

اس وقت نواب شاہ جہاں بیگم والیہ ریاست بھوپال تھیں۔ شاعرہ بھی تھیں۔  
تاہم جو رخصت تھا۔ ان کی صحبتوں میں امیر مینائی کا ذکر اکثر آتا تھا۔ رسم خط و کتابت بھی جاری تھی۔  
اس درمیان ۱۸۹۷ء میں جناب امیر اپنے ایک شاگرد نواب سید بنیاد حسین جاہ کے اصرار پر  
کانپور تشریف لے گئے تو وہاں سے بھوپال کا قصد کیا۔ سفر میں اپنے فرزند دل کے ساتھ  
جلیل کو بھی اپنی ہمری میں رکھا تھا۔ انھیں کانپور سے قبل از قبل بھوپال روانہ کیا گیا تاکہ  
ان کے آنے کی اطلاع پہنچا دیں۔ جلیل بھوپال آئے۔ حکیم برہم صاحب کے پاس ٹھہرے۔  
والیہ ریاست سے صورت حال عرض کی۔ سرکار عالیہ نے حضرت امیر کے آنے پر اظہارِ مسرت  
فرمایا۔ جلیل نے ذریعہ تار حضرت امیر کو اطلاع دیدی۔ امیر کے آنے تک جلیل، حکیم برہم  
کے پاس مقیم رہے۔ باریابی پر جناب امیر سے کلامِ سنالے کی فرمائش ہوئی تو جلیل ہی نے  
امیر کی تازہ غزل سنائی۔ یہاں قیام اگرچہ زیادہ دنوں رہا لیکن کوئی کام حسبِ دلخواہ نہ نکلا۔

لے کارنامہ جلیل۔ ص ۲۸، ۲۹

لے حکیم برہم صاحب نے حضرت امیر کے مدعوں شاگرد تھے گورکھپور کے رہنے والے تھے اور  
وہیں سے انجمنِ مشرق ایک مدت تک اپنی ادارت میں نکلے رہے۔

والی دکن میر محبوب علی خاں آصفیہ سادس سنخو رکھی تھے اور صاحبِ ذوق بھی۔  
 تخلص آصف تھا۔ امیر کی شاعری سے بہت متاثر تھے۔ حسن اتفاق کہ ۱۸۹۹ء میں شاہ  
 آصف ملکنہ تشریف لے گئے تو حضرت امیر کو اطلاع دی گئی کہ آملی حضرت ملکنہ سے واپسی  
 میں بنارس میں قیام فرمائیں گے۔ یہ موقع اتفاق سے ہاتھ آیا تھا۔ امیر اس بار بھی خداداد  
 اور جلیل کو لیکر بنارس گئے۔ اسادشاہ مرزا داغ دہلوی بھی آصف کے ساتھ تھے۔  
 جلیل اور داغ کی پہلی ملاقات بنارس میں ہوئی۔ جناب امیر بارگاہِ خسروی میں یارِ یاب ہوئے  
 صحبت کے احتتام پر شاہ آصف کا ارشاد ہوا۔ آپ ہمارے ساتھ حیدر آباد چلے رہے  
 اس ملاقات کا ذکر جناب امیر اپنے ایک شاگرد زاہد کے موسومہ مکتوب میں  
 یوں کرتے ہیں۔

”حضرت نظام عالی مقام دکن خلد اللہ ملکیم داتا بہم سے بنارس  
 میں بلا سجد و اطلاع مجھے یاد فرمایا اور جو نظم میں نے مناسب مقام  
 راہِ مرتب کی تھی اس کو بحال التفاتِ میری زبان سے سادت  
 فرما کر دادِ سخن دی اور وسعتِ اخلاق و مروت و قنوتِ فطری  
 سے میرا اعزاز بڑھایا۔ رضی مبارک کے مطابق ان کے معزز  
 ارکانِ اشاف نے مجھ سے ہر کتابِ سعادت ہونے کا امر کیا۔  
 ناچار آغازِ موسمِ گرما میں شرفِ حضوری کا وعدہ کر کے چلا آیا۔“

— — —

## تیسرا دور

### جلیل کی حیدر آباد میں آمد

بنارس میں شاہ آصف نے حضرت امیر میانی کو حیدر آباد ساتھ چلنے کے لئے کہا تھا۔ اس وقت تو امیر نے عقد کیا لیکن رامپور واپس ہونے کے بعد ارادہ کر لیا۔ اس وقت ان کے پیش نظر دو باتیں تھیں۔ ایک یہ کہ امیر اللغات کی تکمیل ہو جائے دوسرے یہ کہ لڑکے جو خدمت کے قابل ہیں ان کا بندوبست بھی ہو جائے جیسا کہ جلیل کی اس تحریر سے ظاہر ہوتا ہے۔

”حضرت امیر کے بعض فرزند جو ملازمت کے خواہاں تھے اور حضرت کو بھی ان کی بیماری گراں تھی۔ ان کی کوشش و ترغیب بار بار حضرت کو اس جانب مائل کرتی تھی کہ سفر و گن اختیار کیا جائے۔۔۔۔۔ فرزندوں کی خواہش کے ساتھ تکمیل امیر اللغات کا خیال بھی حضرت کو کم نہ تھا۔“

اس فہرست میں جلیل بھی شامل تھے۔ چنانچہ امیر میانی دربار رامپور سے رخصت حاصل کر کے راستے میں حضرت بندہ نواز گیسو دراز قدس سرہ کی زیارت سے مشرف

ہوتے ہوئے ۱۰ جمادی الاول ۱۹۰۰ء ۱۳۱۸ھ کو حیدر آباد پہنچے۔ اس وقت ان کے ہمراہ ان کے دو فرزند لطیف احمد اختر مینائی، مسعود احمد ضمیر مینائی برادر زادہ لیاقت حسین مینائی اور جناب جلیل تھے۔ استاد شاہ مرزا داغ نے مہانداری کا انتظام کیا تھا۔ انہی کے یہاں فرڈکش ہوئے۔ بعد ازاں مرزا داغ نے اسمیر کی خواہش کے مطابق جو دو مکان کرائے سے لے کر آراستہ کر دیئے گئے تھے ان میں منتقل ہو گئے۔ بازیابی نہ ہونے پائی تھی کہ جناب اسمیر علیل ہو گئے۔ افاقہ کی کوئی صورت نہ ہوئی۔ ایک ماہ ۸ دن علیل رہ کر انتقال فرمایا۔ درگاہ یوسفین میں تدفین عمل میں آئی۔

اسمیر مینائی کا چانک وصال بڑا سانحہ تھا۔ عالم غربت میں واحد سہارے کا ٹوٹ جانا جناب جلیل کے لئے قیامت سے کم نہ تھا۔ فوراً وطن لوٹ جانے کی بات بہت مایوس کن تھی۔ مسعود احمد مینائی اور لیاقت حسین مینائی تو واپس لوٹ گئے۔ جلیل حسین جلیل اور لطیف احمد اختر مینائی نے یہیں قسمت آزمائی کا ارادہ کیا۔ محلہ افضل گنج میں ایک کرایہ کے مکان میں سکونت اختیار کی۔

۱۔ آپ نے لکھا ہے کہ قیام میرے پاس لایہ ہوگا اگرچہ مکان اس قابل نہیں مگر شاید باوجود اس میرے پیارے داغ! غربت میں میری راحت کے سہارے داغ! اس سے زیادہ مجھے کیا خوشی ہوگی کہ غریب الوطن ہو کر اپنے مانوس لطیف ہمدرد کے پاس ٹھہروں مگر میرے حالات باعتبار عوارض کے اس قابل نہیں کہ تنگ مکان میں ٹھہروں۔ جس طرح ممکن ہو کوئی وسیع مکان میرے لئے مرتب کر رکھئے۔۔۔ میرے ہمراہی کئی افراد ہیں لطیف احمد، مسعود احمد، لیاقت حسین، حافظ جلیل حسن جلیل۔ ان کے علاوہ تین خدمت گزار۔ ممتاز علی آہ، اسمیر مینائی ص ۱۲۵ ۱۹۲۱ء۔

۲۔ اسمیر کے وصال پر جلیل نے جو تاریخ نکالی وہی مزار اسمیر پر کندہ ہے۔

اسمیر مینائی : خدا کے عاشق صادق درنی کے فقیر  
گئے جو غلہ بریں کو تو ان کی تربت : جلیل نے یہ لکھا۔ روضہ جناب اسمیر

۳۔ موسیٰ ندی کے کنارے واقع محلہ افضل گنج حیدر آباد کا نہایت آباد اور پُر رونق محلہ ہے اس کو نواب مختار الملک بہادر نے اعظم نواب افضل الدولہ بہادر کے نام نامی اور سرگرمی سے نبویمیا تھا۔ تید محمد بن خاں

## امیر مینائی کی جانشینی :

حضرت امیر کی وفات کے بعد ان کی جانشینی کا سوال پیدا ہوا لیکن یہ مسئلہ آسانی سے حل ہو گیا۔ اس سلسلے میں اختلافات کی بات بہت کم مٹنے میں آتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق نے امیر کی جانشینی کا ذکر چھڑتے ہوئے کئی مالیگا لوی کے حوالے سے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ امیر کے کئی ممتاز شاگرد جانشینی کے دعویدار تھے۔ کئی مالیگا لوی کے الفاظ میں :

”نواب میر محبوب علی خاں (دالی دکن) نے اس نزاع کو دیکھا  
تو ایک مصرع دے کر کہا کہ جس کی غزل سب سے بہتر ہوگی وہی  
استاد کا جانشین ہوگا۔ نواب صاحب کے مصرع پر جلیل نے  
تفصیل کی ہے۔

پایا بلند کیوں نہ بہارا ہواے جلیلیں  
پایا ہے فیض امیر سخن دستگا سے

اور ریاضی خیر آبادی کا

دینا پڑا ریاضی نہیں اس زمین میں  
گھٹ کر رہے جلیلیں سخن دستگا سے“

یہ روایت قطعاً درست نہیں۔ پہلی وجہ یہ کہ جانشین امیر منتخب کرنے کا مسئلہ شاہ دکن سے کوئی تعلق نہیں رکھتا تھا۔ دوسرے یہ کہ جلیلیں کی جس غزل کا حوالہ دیا گیا ہے وہ غزل حیدر آباد کے درگاہ فیض کے سالانہ مشاعرہ کی مجوزہ طرح پر کھی گئی تھی اور طرح شمس الدین فیض کے شاگرد مشرف جنگ نے جاری کی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ ریاضی نے جلیلیں کی غزل کے بعد اپنی غزل بھی ہو۔ چنانچہ یہ روایت محض قیاس ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس وقت امیر کے سیکرٹوں شاگرد موجود تھے جن میں ریاضی خیر آبادی، ممتاز علی آہ، جگر لبوانی، جناب

مظفر خیر آبادی، دل شاہ بہان پوری، حفیظ جونپوری، کسیم خیر آبادی اور شفیع عمادی بہت نمایاں تھے اور اچھی شہرت رکھتے تھے لیکن ان میں جناب جلیل مانچپوری کا نام سب فہرست تھا۔ ریحان خیر آبادی کی ادارت میں ”ریاض الاخبار“ نکلتا تھا۔ اس میں ریاض نے امیر مینائی کی جانشینی کا مسئلہ چھیڑتے ہوئے لکھا کہ بہت سے ایسے طلبہ امیر ہیں جو ابھی فارغ الاصلاح نہیں ہوئے، میں لہذا ضرورت ہے کہ امیر کے شاگردوں میں سے کوئی جانشین قرار دیا جائے تاکہ ضرورت کے وقت ان سے رجوع ہوں اور دبستان امیری کا سلسلہ جاری رہے۔ ریاض کی اس تحریر و تحریک سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا تھا کہ ریاض نے کوئی بہتر نام نظر میں رکھ کر اپنے آپ کو جانشینی کے اُمیدواروں کی فہرست سے الگ کر لیا تھا چنانچہ بعد کی تحریر میں انھوں نے اپنا خیال ظاہر کر دیا کہ جلیل مانچپوری کو جانشین مان لیا جانا مناسب ہوگا۔ اس پر یہ ہو سکتا ہے کچھ بحثیں چھڑی ہوں لیکن بالاتفاق سب نے جناب جلیل ہی کو جانشین تسلیم کر لیا۔ اس کے کئی وجوہ تھے۔

(۱)۔ جلیل کو اپنے خواجہ تاشوں میں یہ امتیاز حاصل تھا کہ انھیں اپنے استاد امیر مینائی کی صحبت سب سے زیادہ حاصل ہوئی۔ ۱۲ سال تک رفاقت رہی۔ استاد کے فیض سے پوری طرح بہرہ یاب ہوئے وہ امیری اسکول سے جب کامیاب ہو کر نکلے تو استاد بن کر نکلے اور یہ مرثبان کو استاد کی زندگی ہی میں مل چکا تھا۔

(۲)۔ جلیل امیر مینائی کے رنگ میں اس طرح رنگ گئے تھے کہ ان کی غزلوں پر امیر کی غزل ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ دیوان اول ”تاج سخن“ کی غزلیں اس کا ثبوت ہیں۔ مولف ”گل رعنا“ جناب عبدالحی نے تاج سخن کو دیکھ کر کہا تھا کہ اگر دونوں کا سلام مخلوط کر دیا جائے تو امتیاز مشکل ہے۔ سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں:

جلیل کو خود اس کا اعتراف تھا

شعر گوئی پہ تری سب کو گمان ہے کہ جلیل  
بزم میں روح امیر الشعر آئی ہے

”شاعری میں جو ادھات اور خصوصیات امیر میں تھے وہی جلیل میں تھے بلکہ امیر کے قدیم و جدید کے جو دو رنگ تھے وہی جلیل میں تھے..... استاد کا صحیح تنبیہ امیر کے تلامذہ میں کم کسی کو نصیب ہوا۔“ لے

(۳) جلیل حضرت امیر کے وصال سے بہت قبل ہی فارغ الاصلاح ہو چکے تھے۔

(۴) رامپور کے آخری زمانے میں پیرانہ سالی کے سبب امیر مینائی نے اپنے شاگردوں کے کلام کی اصلاح جناب جلیل ہی کے سپرد کر دی تھی۔ یہاں تک کہ خطوط کے استفسار اور جوابات بھی جلیل ہی کے قلم سے لکھے جاتے تھے۔

صدیق الزماں نبیۃ امیر مینائی کے بیان سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔

”حضرت جلیل کی مشقی سخن اتنی بڑھ گئی تھی کہ آخر زمانے

میں استاد کلام کی اصلاح بھی انہی کے سپرد فرما دیا کرتے تھے“

حسن احمد مینائی کی تحریر سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

”حضرت امیر مینائی نے اپنی حیات ہی میں اکثر شاگردوں کو اپنے

بعد حضرت جلیل سے رجوع ہونے کی رہبری فرمادی تھی۔“

(۵) بقول ذکی ساکوردی امیر خود بھی غالباً اپنے تلامذہ میں جلیل کو سب سے بہتر اور

اپنی جانشینی کے لائق سمجھتے تھے۔ جلیل جو ایک ثقہ راوی ہیں اور حتی الامکان ازراہ انکساری

داحتیاط اپنے ذکر سے بھی پرہیز کرتے تھے سواغ امیر مینائی میں نکلتے ہیں کہ

”ایک دن باہر سے بعض قابل لوگ حضرت امیر مینائی سے

ملنے آئے۔ مسائل شاعری کے متعلق استفسار کیا بعد ازاں حضرت

سے کہا کہ اللہ آپ کو دیر گاہ سلامت رکھے۔ آپ کے بعد ہم

لے ماہنامہ معارف۔ مارچ ۱۹۴۶ء ص ۲۳۵ لے ہندوستانی ادب۔ جلیل نمبر ۱۹۴۶ء ص ۹۲

۳ لے حسن احمد مینائی۔ حضرت جلیل امام فن۔ محلہ عثمانیہ جلیل نمبر ۱۹۴۶ء ص ۲۳۵

۴ لے ذکی ساکوردی۔ جلیل مانچوری ص ۲۶۔ ۱۹۴۸ء مکتبہ

حاجتمدد دل کو کس سے رجوع کرنا چاہیے۔ راقم الحروف الگ بیٹھا کچھ رہا تھا۔ حضرت نے ان کے جواب میں میری طرف اشارہ کر کے فرمایا۔ ان سے رجوع کرنا چاہیے وہ لوگ آئے اور مجھ سے مصافحہ کیا۔ ۱

[۶]۔ پہلی ناروی بھی نوری کے دیوان کے دیباچہ میں جلیق کی جانشین کے مسئلہ پر امیر کے شاگردوں میں اختلاف نہ ہونے کی بات تسلیم کرتے ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ انہوں نے جو وجہ بتائی ہے وہ ان کی ذہنی اختصار ہے۔ لکھتے ہیں:

”معلومت دقت اور اس خیال سے کہ دربار حضور نظام تک پہنچنے میں اس اعزاز کے سبب انہیں آسانیاں حاصل ہوں شاگردان امیر مینائی لکھنوی نے جانشین بنادیا۔ حالانکہ ان کے شاگردوں میں ایسی ہستیاں موجود تھیں جن کو خود بھی جانشینی کا دعویٰ ہو سکتا تھا مگر ان حضرات نے خاموشی اختیار کر لی اور بغیر کسی اختلاف کے وہ آسانی سے جانشین بن گئے۔“ ۲

[۷]۔ حضرت امیر کے شاگردوں میں مذکور بالا وجہ کی روشنی میں جناب جلیق کی شخصیت اتنی قدر آور تھی کہ امیر مینائی کے انتقال کے بعد ایسی صورت حال پیدا ہونے کا امکان ہی نہ تھا جیسا کہ مرزا داغ کی رحلت کے بعد جانشینی کے مسئلہ پر خود داغ کے شاگردوں میں جھگڑے اور طوائف الملوک پیدا ہو گئی تھی۔ جناب ریاض خیر آبادی جیسے استاد شاعری نے جناب جلیق کی جانشینی کی تائید کی تو سارے خواجہ نامش ان کے ہموا ہو گئے۔ ہمنوائی کا ثبوت ان کے یہ اشعار ہیں۔

۱۔ جلیق مانپوری۔ سوانح امیر مینائی ص ۲۸ ۱۹۲۸ء حیدرآباد۔

۲۔ ڈاکٹر عبدالحق۔ جلیق مانپوری ص ۵۷ ۱۹۸۹ء

## ریاض خیر آبادی

جلیل استاد کے تم جانشین ہو تمہیں کہتے ہیں ہم استاد فن بھی  
طبیعت میں دی استاد کار نگ دی شوخی دی لطف سخن بھی  
سمجھتا ہے تمہیں سرمایہ ناز ریاض خوشنوا شیریں سخن بھی  
تمہیں سب جانتے ہیں مانتے ہیں نہ اہل لکھنؤ اہل دکن بھی

## حقیقہ جو نیورے

حضرت استاد کا ثانی کہاں بھر غنیمت آج ہے ذاتِ جلیل  
جانشین ان کے ہی مانے گئے کیا یہ کچھ کم ہے کلماتِ جلیل

## وسیم خیر آبادی

چند فکر جانشین اسید کیا کھلائے ہیں بوستانِ سخن  
اس جہاں میں ہے ایک ذاتِ تری باعثِ ردنی جہاں سخن  
ہیں ترے خواجہ تاش شل نجوم تو ہے خورشیدِ آسمانِ سخن

## جگر بسوانی

قابل و حافظ جلیل شاعرِ نازک خیال خوش بایاں ہیں طبعِ عالی ہے نہایت نکتہ زرا  
جانشینِ حضرت استاد مرحوم آپ ہی آپ کے فیضِ سخن سے باغِ معنی ہے ہرا  
کیا مری تعریف میں ہوں ایک خادمِ خواجہ تاش ہر بخود ہو رہا ہے آپ کا مدحت سرا

## کوثر خیر آبادی

وہ جلیل القدر و لا منزلت وہ رفیع الشان وہ عالی مقام  
مسند آرائے اسید لکھنوی جانشینِ بادشاہِ شاعران

غرض جناب جلیل نے حضرت آئیر کی جگہ لی اور جانشینی کا ایسا حق ادا کیا کہ بقول قاضی عبدالغفار مرزا داغ کے بعد قدیم سلسلہ تلمذ کے آخری استاد قرار پائے۔

### حیدر آباد مرکز شعر و ادب :

یہ وہ زمانہ تھا کہ رامپور کی بساط سخن الٹ چکی تھی اور حیدر آباد شعر و ادب کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ اول اول دہلی اور لکھنؤ کے دانشور اور شعراء حیدر آباد کی جانب کم متوجہ ہوئے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس قدر دور و دراز کا سفر مرحلہ عظیم تھا لیکن جب اور کہیں جائے پناہ نہیں رہی تو ادھر کا رخ کرنا ہی پڑا۔ حیدر آباد کی علمی و ادبی روایات بہت زرخیز رہی ہیں۔ شہر حیدر آباد میں صدیوں سے علم و فضل اور شعر و سخن کا گہوارہ رہا ہے۔ اردو فارسی اور عربی زبانوں کے سکھڑوں بلند پایہ ادیب اور باکمال شاعر اس شہر میں پیدا ہوئے یا باہر سے آکر کچھ اس طرح گھل بی گئے کہ اپنوں اور بیگانوں میں کوئی فرق باقی نہ رہا۔ دکن میں کم و بیش ہر دور میں بڑی بڑی شخصیتیں موجود رہی ہیں۔ فارسی کے مشہور شاعر طبریزی اور مورخ فرشتہ اور مولانا عبدالعلی سہرا العلوم فرخی محل (لکھنؤ) نے بھی ترک وطن کر کے سرزمین دکن کو آباد کیا تھا۔

شاہان بیجاپور اور گولکنڈہ کے زمانے سے ہی دکن کا یہ خطہ علم و فن، شعر و شاعری کا مرکز اور ملکی و غیر ملکی اہل کمال اور شعرا کا لمجا و ماوا بن رہا تھا۔ یہاں کی دولت و سخاوت کی داستانیں عام تھیں۔ نظام علی خاں جب وارث سلطنت ہوئے تو شاہان بیجاپور اور گولکنڈہ کی طرح ان کے مذاق علمی اور سرپرستی کے بھی وارث ہوئے۔ چنانچہ بانی خاندان نظام الملک آصفجاہ اولؒ محض شاعروں اور شاعری کے قدر داں اور سرپرست ہی نہ تھے بلکہ خود شعر و ادب کا ذوق سلیم رکھتے تھے۔ آصفجاہ ثانی ناصر الدولہ کے عہد میں محسن الملک و قار الملک، اعظم یار جنگ، عماد الملک، فریدون الملک اور

لے ڈکٹر کوروی، جلیل بیکپوری ص ۲۶ ۱۹۷۸ء لکھنؤ۔

لے نظام الملک ناری زیادہ کہتے تھے تخلص شاکر تھا۔ مرزا عبدالقادر بیگ اصلاح لیتے تھے۔

خواجہ احسن اللہ خاں جیساں جیسی بلند پایہ شخصیتیں جمع ہو گئی تھیں۔ شاہ نصیر کی مرتبہ حیدر آباد آئے اور گئے۔ پھر کچھ عرصہ تک شاعری کا دربارِ قدرے سرد رہا یہاں تک کہ میر محبوب علیاں آصفیاء سادس کا دہ آ یا تو ان کے علم و فن اور شعر و سخن کی قدر دانی کی وجہ سے علمائے عصر اور شعرائے عہد کا جمع دار السلطنت میں ہو گیا تھا۔ حیدر آباد کے اس دور کے بارے میں نصیر الدین ہاشمی کا بیان ہے کہ جب سرکار آصفیہ کے دفاتر کی زبان ناری کے بجائے اردو قرار پائی تو اس کشش نے اساتذہ ہند کے اساتذہ اردو کو اپنے دامنِ عافیت میں کھینچ لیا اور حیدر آباد علم و فن کا مرکز بننے لگا۔

ان میں بعض شخصیتیں بہت نمایاں تھیں۔ مولوی چراغ علی، مولوی سید حسین بگلرامی، میر مہدی، مولوی نذیر احمد، سید علی بگلرامی، عزیز مرزا، اور مولوی مشتاق حسین وغیرہ حیدر آباد آچکے تھے اور اسی در دولت سے مولانا شبلی نعمانی، مولانا عبدالحلیم شرر، مولوی عبدالحق اور مولانا حالی فیضیاب ہو رہے تھے۔ لڑاکا، مرزا خاں داغ دہلوی فصیح الملک کا لقب پاکر اسٹا شاہ بن چکے تھے۔ ان کے علاوہ پنڈت رتن ناتھ سرشار، نظم طباطبائی، اصغر دہلوی، بیکل سہارنپوری، صباح دہلوی، ضامن کنٹوری، کاظم حسین شفیقہ لکھنوی، ظفر علی خاں سیکشن تھانوی، ظہیر دہلوی، بے نظیر وارثی، زار دہلوی، سائل دہلوی، اشک لکھنوی، عبدغفار ضعیف لکھنوی، نادر علی تبریز، احسن ماہروی، نادان دہلوی، درگا پرشادزکا، فردغ لکھنوی، یادگار خاندان آتش سُنخنی اور یادگار مومن ناٹک وغیرہ الیوان دکن کی لرینت تھے اور ان کی وجہ سے شعر و شاعری کا بازار گرم تھا۔

اس ماحول کو چھوڑ کر جلیل مائیکپوری وطن واپس جانا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن گزراوقات کا سوال تھا۔ اس عالمِ غربت میں ہمارا جہ سرکش پرشاد شاد نے جناب جلیل کی سرپرستی کی اور اس سہارے کو غنیمت جان کر جلیل سے رہ پڑے۔

امیر میانی کے انتقال کے بعد حیدر آباد میں جناب جلیل کی سرپرستی کے تعلق سے ایک غلط بیانی کا ذکر ضروری ہے تاکہ غلط فہمی کا امکان باقی نہ رہے۔ جوش ملیح آبادی

نے اپنی سوانح ”یادوں کی رات“ میں جہاں بہت سی حاشیہ آرائیاں کی ہیں وہاں ایک یہ بھی ہے کہ انھوں نے شاہ دکن آصف صالح سے ایک باریابی کے موقع پر یہ بات کہی تھی کہ ”حیدرآباد میں ان کے والد بشیر احمد، جلیل کے سرپرست تھے“ اس غلط بیانی سے شائد وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دربار نظام میں وہ باریاب رہا کرتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ دربار سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ باریابی شاذی ہوتی تھی۔ جوش شاہ عثمان کے پسندیدہ لوگوں میں نہ تھے۔

جہاں تک سرپرستی کا تعلق ہے حیدرآباد میں جوش کے والد بشیر احمد کے نام تک سے کوئی واقف نہیں۔ وہ حیدرآباد آئے بھی یا نہیں؟ اس کا بھی اشتباہ ہے۔ حیدرآباد کے تذکروں میں سے کسی میں بھی کسی حیثیت سے بشیر احمد کا نام نہیں ملتا۔ ان حقائق کی روشنی میں جوش کا بیان محض ایک اسٹٹ ہے اور دربار شاہ میں استاد جلیل کے عقاید میں جوش کے احساس کتری کا مظہر بھی۔ مہاراجہ شادی جلیل کے سرپرست و مربی تھے۔ مولانا سلیمان ندوی کی اس تحریر سے میرے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔

”غزبت اور مسافرت کے عہد میں مہاراجہ کش پرشاد نے جو شعر  
دُشمن کے شائق اور علوم مشرقی کے بڑے قدر دال تھے۔  
اتیر کے ان دونوں عزیزوں (جلیل و اختر) کی بڑی قدر کی  
اور ان کو فوراً اپنے سائے عاطفت میں لے لیا اس وقت سے  
ان دونوں صاحبزادوں نے حیدرآباد کو اپنا وطن بنا لیا اور  
تقریباً ۱۹۵۸ء تک صرف مہاراجہ کی سرپرستی میں زندگی  
 بسر کرتے رہے۔“

حیدرآباد کے مشاعرے :

حیدرآباد میں مشاعروں کا بڑا چرچا تھا اور کثرت سے ہوتے تھے لیکن ان میں

بعض مجتہدین اور محققین خاص تھے۔

(۱) درگاہ شمس الدین فیض کے سالانہ مشاعرے۔

(۲) ابراہیم خاں صاحب تحبلی کے مشاعرے۔

(۳) عبداللہ خاں ضعیف کے مشاعرے۔

(۴) منیر الدین جمعدار کے مشاعرے۔

(۵) مہاراجہ کشن پرشاد شاد کے مشاعرے۔

ان مشاعروں میں لکھنؤ اور دہلی کے مہاجر شعرا کے علاوہ مقامی شعرا کی ایک بڑی تعداد حصہ لیتی تھی۔ جن میں کشن پرشاد شاد، مظفر الدین معنی، نواز علی لمعہ میر یسین علی خان امیر، یادر الملک و ذبیحہ میرامداد حسین اعظم، غلام محمد زعم، لقمان الدولہ دلی، سید اعظم علی شائق، اقبال یار جنگ اقبال، احمد علی عصر، وحید الدین عالی، نصیر خاں خیال، حبیب اللہ ذکا اور ترک علی شاہ ترک قابلی ذکر ہیں۔

دکن کے اس دور کے شعرا کی فہرست میں کچھ اور ناموں کا اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ احمد نواز جنگ فانی، میر تراب علی زور، احمد اللہ داصل، عبد العلی طیش عبد الواث دارش، محمد علی ناظم، امیر حمزہ حمزہ، غلام علی جوش، شہاب الدین توقیر، محمد علی صولت جنگ عابد، شوق حسین صفی، یسین بخش لیسین، عبد الولی فردخ، خیرات علی سخی احتشام الدین علی، ضعیف جنگ سرسرا، وزیر علی خاں جوش، محمد علی بخش، شاہ ابراہیم غفور منتخب الدین تحبلی، وزیر الدین مہر، سید احمد افسر، ہمدی علی خاں کوکب، آغا شاعر فرید آباد اور ہمدی خاں ہمدی وغیرہ۔

حضرت امیر مینائی کے بعد تقریباً ایک ماہ تک ان کا سوگ رہا۔ اس مدت کے ختم ہوتے ہوتے حضرت فیض کے سالانہ مشاعرہ کی تاریخ آگئی۔ جناب جلیل اور

لے غار ابو الطالی، جعفر امام الفہم ۲ شمس الدین فیض یا نجوی صفحہ ۱ حکمران افضل اللہ کے عہد کے ایک نامور بزرگ شاعر تھے۔ ان کے دربار تھے شاعرانہ کمال اور علم تحریر کی بدست شاعر کی تھی۔ ان کی شاعری اور علم و فضل سے تمام دکن نے فیض حاصل کیا۔ ان کے شاگرد دہلی تلید دروے شاگرد تھے فیض کے وقت کے بہت صوفی اور مریدانہ جاتے تھے۔ ان کے حلقہ ولادت بہت وسیع تھا۔ جید آباد میں ان کا نژاد آج بھی جمع خلاق ہے۔ کتبہ نزار پر فیض کا نام اور سنہ ولادت ۱۱۷۵

لطیف احمد اختر مینائی (خلف امیر مینائی) کو بھی شرکت کے لئے مجبور کیا گیا جواب تک امیر کے غم سے سنبھل نہیں پائے تھے اور بہت دلریش و دل شکستہ تھے۔ جلیل فارغ الاصلاح ہونے کے باوجود استاد کو غزل ضرور سنا لیا کرتے تھے۔ امیر مینائی کے وصال کے بعد والد مرحوم کا یہ کہنا تھا کہ۔ جب کبھی دقتیں لاحق ہوئی ہوں ہم استاد کے مزار پر حاضر ہوتے حضرت کی توجہ سے ہمیشہ مشکل آسان ہوتی گئی اور کبھی کوئی مشکل ایسی پیش نہ آئی جو حل نہ ہوئی ہو۔

چنانچہ آپ نے اس کا اظہار اپنی غزل کے ایک مقطع میں یوں کیا ہے۔

اللہ کیا توجہ ہے کہ ہم اب تک جلیل

فیض پاتے ہیں مزار حضرت استاد سے

اختر مینائی بھی اپنے مقطع میں اسی خیال کا اظہار کرتے ہیں۔ کہتے ہیں:

کیوں رہے اختہ یہ بے دیکھی غزل

چل کے روضہ پر سُنائی حباے گی

درگاہ فیض کے سالانہ مشاعرے لواب مشرف جنگ فیاض کی زیر نگرانی کبھی

مزار پر اور کبھی ان کے مکان پر واقع بیرون لال دروازہ منعقد ہوتے رہتے تھے اور بالاتزام

ہوتے تھے۔ مزار فیض پر شامیانہ لگایا جاتا تھا اور چراغ روشن کئے جاتے تھے۔ مدخل کی رسم

کا بھی بڑا اہتمام ہوتا تھا۔ عرس کے دنوں میں لوگ کثرت سے جمع ہوتے تھے۔ سماع کی

جلس اور مولود خوانی کے علاوہ مشاعرہ بھی اس تقریب عرس کا اہم جزو تھا۔ ان مشاعروں

۱۔ جلیل حسن جلیل اور لطیف احمد اختر مینائی۔

۲۔ فیاض الدین نام۔ فیاض تخلص۔ مشرف جنگ خطاب۔ امرائے دربار آصفی میں تھے۔ بالمال

شاعر کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ شاگردوں کا حلقہ بھی کافی وسیع تھا۔ حضرت شمس الدین

فیض کے خاص شاگردوں میں تھے اور انھیں یہ امتیاز حاصل تھا کہ حضرت فیض کے انتقال

کے بعد ۳۵ سال تک عرس کے تمام انتظامات کرتے رہے اور گلدستہ فیض نکالتے رہے

فیض کے انتقال کے بعد ان کے فرزند عزیز یاد جنگ عزیز نے کوئی پانچ سال تک اس ریت کو قائم رکھا۔

میں کثرت سے شعرا شریک ہوتے تھے۔ جو شعرا شرکت نہیں کر سکتے تھے وہ اپنا کلام روانہ کر دیا کرتے تھے۔ ان تمام غزلوں کو اکٹھا کر کے مشرف جنگ فیاض ایک گلدستہ کی شکل میں بنام ”گلدستہ فیض“ شائع کرتے تھے۔ مشاعرہ سے قبل مصرع طرح جاری کئے جاتے تھے مثلاً

خیالِ فیض کہیں دل سے دُور ہوتا ہے۔

مزارِ فیض پر اللہ کی رحمت برتی ہے۔

فصل گُلِ آئی گھٹا چھائی ہے۔ ۲۔

## دکن کے پہلے مشاعرہ میں جلیل کی شرکت :

دعوتِ مشاعرہ پاکر جناب جلیل نے مجوزہ طرح پر غزل تیار کر لی تھی اور شریکِ مشاعرہ تھے۔ ۱۲ ارجب المرجب ۱۳۱۸ھ (۱۹۰۰ء) کو دوپہر ہی سے حضرت فیض کا مشاعرہ شروع ہو چکا تھا۔ اس مشاعرہ میں جو شعراء شریک تھے ان میں قابلِ ذکر نواب آصف الملک وزیرِ کشن پرشاد شاد، رتن ناتھ سرشار، حبیب کنھوری، سید کاظم حسین شیفٹہ، محمد باقر شیدا، مشرف جنگ فیاض، حفیظ الدین یاس اور احمد علی تھرو وغیرہ ہیں۔ دیگر شعراء کے نام ہمیشہ طوالت میں کیوں کہ مجموعی تعداد بہت زیادہ تھی۔ کوئی پانچ بجے شام کے قریب اساتذہ کی نوبت آئی۔ یوں تو جناب جلیل کی شہرت ان سے پہلے ہی دکن پہنچ چکی تھی۔ آمیرِ بنیائی کے جانشین ہونے کے بعد اور بھی پیرِ پرواز لگ گئے تھے۔ شمع گردش کرتے ہوئے جب جلیل کے سامنے آئی تو بندرت رتن ناتھ سرشار نے کھڑے ہو کر بادِ بلند اعلان کیا کہ حضرت آمیرِ بنیائی کے شاگرد و جانشین حافظ جلیل صحنِ جلیل اپنی غزل پڑھتے ہیں۔ حضرا متوجہ ہو جائیں۔ یہ سنا تھا کہ سب ہم تن گوش ہو گئے۔ مجمع قریب سے قریب تر سمٹ آیا

۲۔ لائقِ صلاح۔ میرس الدین فاضل حیدر آباد ۱۹۰۹ء ص ۸۸

۱۔ رتن ناتھ سرشار فاضل آزاد کے مصنف اور شاعر ۱۸۹۵ء میں حیدر آباد آ گئے تھے۔  
 ۲۔ البتہ کان شاد سے تھے۔ مباراجہ شاد کو ان سے بڑی عقید اور محبت تھی۔ انہوں نے اپنے اکثر ناول سرشار کو دکھائے تھے بشا نے ان کا مشاہرہ بھی مقرر کر دیا تھا۔ سنا ہے کہ شاد کی غزلیں سرشار اکثر مشاعرہ میں پڑھا کرتے تھے ۱۹۰۹ء میں ان کا انتقال حیدر آباد میں ہوا۔

اور تب جناب جلیل نے دکن کی سرزمین پر پہلی مرتبہ اپنی غزل کا مطلع پڑھا:

اب کون بھر کے جائے تری جلوہ گاہ سے

اے شورش چشم بھونکدے برقی نگاہ سے

مطلع کا سُنا تھا کہ مشاعرہ سمٹ کر اور قریب آگیا۔ واہ واہ کا شور بلند ہوا اور بار بار مطلع پڑھنے کی فرمائش ہونے لگی۔ اسی طرح ہر شعر کی کئی مرتبہ پڑھا جاتا رہا اور کوئی گھنٹہ بھر میں غزل ختم ہوئی۔ اس غزل کے کچھ اشعار یہ تھے:

کس شان سے جلا ہے مرا شہسوارِ حسن      فتنے پکارتے ہیں ذرا ہٹ کے راہ سے

دیکھو پھر ایسے دیکھنے والے نہ پاؤ گے      کیوں خاک میں ملائے ہو سچی نگاہ سے

دل چسپ ہو گئی ترے چلنے سے گہر      اٹھا اٹھ کے گرد راہ لپٹی ہے راہ سے

میزال کھڑی ہوئی مرے آگے نہ روڑِ حشر      دینا پڑا اُسے مرے بارِ گناہ سے

کثرت سے مے جو پی ہے نظرِ مال پر      رعشہ نہیں ہے کانپ رہا ہوں گناہ سے

بابا بلند کیوں نہ ہمارا ہو اے جلیل

پایا ہے فیضِ امتیر سخن دست گاہ سے

داؤد علی خاں واقف جو جناب جلیل کے اولین شاگردوں میں تھے اور مشاعرہ میں بحیثیت سامع شریک تھے مجھ سے بیان کرتے ہیں کہ جب مشاعرہ ختم ہوا تو اہلِ محفل کی زبان پر جلیل کا یہی مطلع تھا۔

اب کون بھر کے جائے تری جلوہ گاہ سے

اے شورش چشم بھونکدے برقی نگاہ سے

درحقیقت اسی مشاعرہ سے جلیل کی شہرت و مقبولیت کا آغاز دکن میں ہوتا ہے

مرزا داغ دہلوی اس مشاعرہ میں شریک نہ تھے انہوں نے غزل بھیج دی تھی۔ مشاعرہ کی

کیفیت اڑتی ہوئی ہر طرف پھیل چکی تھی۔ چنانچہ مرزا داغ دوسری صبح ہی جلیل کے یہاں تشریف

لے۔ مکان قریب ہی تھا۔ درمیان میں شکر تھی۔ فرمایا میں تمہاری غزل سُنے آیا ہوں

غزل سُنی اور بہت داد دی

## ابراہیم خان صاحب تجلی کا مشاعرہ :

دوسرا مشاعرہ جس میں جناب جلیل نے شرکت کی وہ ابراہیم خان صاحب تجلی کا شعر تھا۔ یہ سرکاری مشاعرہ کہلاتا تھا کیوں کہ شاہ آصف میر محبوب علی خاں خود مصرع تجویز فرماتے تھے اور مشاعرہ کی خاص خاص غزلیں منگو کر ملاحظہ فرماتے۔ یہ مشاعرہ اس لئے بڑی اہمیت کا تھا کہ اس میں پہلی مرتبہ مرزا داغ اور جناب جلیل دونوں شریک تھے۔ جلیل کی غزل نے مجددیے حساب داد پائی۔ یہ وہی غزل ہے جس کا مطلع جلیل مانچوری کی پہچان اور غزل کی آبرو ہے :

نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں  
وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

اس غزل کے چند اشعار یہ تھے :

وہ کمسنی کے سبب واقف عتاب نہیں      دم سحر ہے ابھی گرم آفتاب نہیں  
ہیں تو دور سے آنکھیں دکھائی جاتی ہیں      نقاب لپٹی ہے اس پر کوئی عتاب نہیں  
گنہ گنہ نہ رہا اٹھی بادہ نوشی کی      اب ایک شغل ہے کچھ لذت شراب نہیں  
جلیل ختم نہ ہو دور حجام مینائی  
کہ اس شراب سے بڑھ کر کوئی شراب نہیں

جلیل کی غزل حاصل مشاعرہ رہی مطلع تو اتنا مشہور ہوا کہ دور حاضر بھی جلیل کی شاعری کا قد اسی مطلع سے ناپتا ہے۔ اعلیٰ حضرت آصف کے ملاحظہ میں غزلیں پیش کی گئیں تو جلیل کی غزل کے بہت زیادہ اشعار منتخب فرمائے اور پھر بالالتزام استاد داغ کی غزل کے ساتھ جلیل کی غزلیں بھی ملاحظہ کرنے لگے۔

پھر ایک اور مشاعرہ ابراہیم خاں تجلی کے یہاں ہوا۔ یہ مشاعرہ بھی بڑے معرکہ کا

ابراہیم خان صاحب تجلی والی دکن شاہ آصف کے خانہ سال تھے۔ ادبی ذوق و شوق اور اپنی شاعری کے سبب مقبولیت حاصل کی۔ اس مقبولیت کا ایک بڑا سبب وہ مشاعرے تھے جو وہ بالالتزام پڑے بیٹے پکڑتے تھے۔ دربار سے تعلق رکھنے کے سبب یہ مشاعرے بہت مستند و معتبر سمجھے جاتے تھے۔

تھا کیونکہ اس میں مرزا داغ کے علاوہ اور کئی کہنہ مشق استاد سخن شریک تھے مثلاً علی حیدر طباطبائی شفیقہ کنتوری، حبیب کنتوری اور خواجہ باقر شیدا بکھنوی وغیرہ نے بھی حصہ لیا تھا۔ جناب جلیل کے اس شعر پر

مہر کی ان پر ضرورت کیا ہے اے پیر مفاں ایک اک خم ہو گئی ہے آنکھ ہر میخوار کی  
حضرت داغ نے فرمایا کیا مہر لگائی ہے۔ علی حیدر طباطبائی اس شعر پر جھوم اٹھے۔  
جیسے شرمیلی دلہن گردن ٹھکرائے شرم سے وہ ادا ہے خون میں ڈوبی ہوئی تلوار کی  
اور یوں داد دی کہ یہ خاص رنگ بکھنوی رنگ ہے جو کسی کو نصیب نہیں ہو سکتا۔

مشاعروں کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ایک مشاعرہ میرالدین صاحب ضمیر جمہدار کے یہاں  
اردو شریف میں ہوا۔ پھر عبداللہ خاں ضعیف نے ایک تاریخی مشاعرہ کا اہتمام کیا۔ یہ مشاعرہ  
مہاراجہ کشن پرشاد شاد کے استقلال و زادت کی مسرت میں نواب جعفر علی خاں صاحب  
کی دیوڑھی پر ترتیب دیا گیا تھا۔ اس مشاعرے کا مصرع طرح یہ تھا۔

خدا رکھے بڑی فیاض یہ سرکار عالی ہے

جناب حلی کو غزل کہنے کی فرصت نہیں ملی لیکن ضعیف صاحب کے اصرار و تعلقاً  
کی بناء پر شرکت ضروری ہو گئی۔ وہ خود اپنے پنج گئے۔ چنانچہ سواری میں بیٹھنے کے بعد فکر  
شروع کی۔ وہاں پہنچے تو محفل رقص و سرور گرم تھی۔ چونکہ آپ ایسی محفولوں سے محترماً  
تھے اور مشاعرہ کے لئے کافی وقت تھا آپ جوک کی مسجد میں آ گئے۔ بیرون صحن ایک  
گوشے میں بیٹھ کر غزل مکمل کی۔ مرزا داغ بھی مشاعرہ میں شریک تھے۔ آپ کی غزل  
نے بہت رنگ جمایا۔ اس کے چند اشعار یہ ہیں۔

۱۔ کارنامہ جلیل ص ۷۷

۳۔ ضعیف بکھنوی کا مولد و منشا شہر بکھنو تھا۔ ۱۲۶۵ھ میں حیدر آباد دکن آئے۔ شعر گوئی  
کا شوق فطری تھا۔ نواب عباس حسین خان شہر سے تلمذ حاصل تھا پھر حکیم نیاز احمد خان  
کو اپنا کلام دکھایا۔ شعر گوئی کے فریفتہ تھے۔ شعر گوئی اور شاعروں کے کلام کی جستجو میں بڑی جانفشانی  
دوستی کرتے تھے بھلام بھنگی اور شائستگی پائی مائی خوش و غم خوش خلق اور سگفتہ طبع تھے۔

لغات سے مراحوب تصویر خیالی ہے وہ پہلو میں ہے اور پہلو مرا خالی کا خالی ہے  
 فروغ رخ نے اندھا کر دیا نظارہ بازوں نے نقاب میں نے اٹھا کر اور بھی صورت چھپائی ہے  
 قیامت کا مجھے ڈر کیا جو کل آتی تھی آج آئے تمہارے ساتھ کی کھیل ہے میری دکھیں بھائی ہے  
 وہ دیکھو کس بھی کچھ آئے میں کہتا جاتا ہے ہلا کر تم نے لب تصویر میں کیا جان ڈالی ہے  
 پھر ایک مشاعرہ ہمارا جہ چند دلال کی بارہ درمی میں ہوا۔ اس مشاعرہ کی حیثیت  
 بھی سرکاری تھی جیسا کہ مصرع طرح سے ظاہر ہوتا ہے۔

شنا آصف کی خارج ہے بیاں سے

یہ خصوصی مشاعرہ تھا۔ اس میں شرکت کرنے کے لئے صرف اساتذہ سخن کو مدعو کیا گیا تھا۔  
 جناب جلیل کی غزل کو سب سے زیادہ داد ملی۔ غزل بھی معرکہ کی تھی جس کے چند شعر یہ ہیں:

کہوں کیا اضطرابِ دل لبوں سے	رہے جاتے ہیں سب پہلو بیاں سے
زمین شعر ہم کرتے ہیں آباد	چلے آتے ہیں مضمون آسماں سے
ہم ایسے ناتواں وہ ایسے نازک	اٹھائے کون پردہ درمیاں سے
شیم گل نے بڑھ کر جال مارا	قلم باہر جو رکھا آسماں سے
بگاہ گل سے بلب یوں گری ہے	گرے جس طرح تنکا آسماں سے

اس مشاعرہ میں رتن ناتھ سرشار ترک علی شاہ ترکی، فصیح الملک داغ اور ان  
 کے خواجہ تامل ظہیر دہلوی بھی شریک تھے۔ جناب داغ نے غزل نہیں پڑھی۔ مشاعرہ سے  
 اٹھ کر چلے گئے یہ

لے چند دلال شاداں آصف جاہ ثانی کے عہد میں مدارالمہام تھے۔ ان کی سخاوت  
 اور اہل کمال کی سرپرستی مشہور زمانہ ہے۔ چند دلال نے حیدر آباد میں بہت سی عمارتیں  
 بنوائیں جن میں ان کی بارہ درمی ۲۵ لاکھ صرفہ سے تعمیر ہوئی تھی۔ یہاں کثرت سے  
 شاعروں کی محفلیں جمتی تھیں۔

(ڈاکٹر زور۔ داستان ادب حیدر آباد ص ۱۳۷)

یہ تفصیلات ”داغ و جلیل“ عنوان کے تحت ملاحظہ فرمائیں۔

## شاد اور جلیل کے مراسم

اُدپو کی سطروں میں نکھا جا چکا ہے کہ مہاراجہ سرکشن پر شاد کی سرسبز حاصل نہ ہوتی تو جلیل کو عالم غربت میں پھیلنے پھولنے کا موقع نہ ملتا۔ انہوں نے جلیل کو اپنے زمرہ مصاحبین میں شامل کر لیا تھا۔ وطن سے دور حیدر آباد میں بحالت پریشانی و بچاگی مہاراجہ شاد کا جو سہارا ملا اس کا ذکر جلیل کے ان اشعار میں ملتا ہے۔

وطن سے ہم جو آئے حیدر آباد      لی یاں دولتِ خوشنودی شاد  
پھلے پھولے نہالِ گل کی صورت      ہوئے نغمہ سرا بلبل کی صورت  
ہوا زندہ چمک کر مہرِ تاباں      بنا قطرہ جوابِ بحرِ عمال  
بغیرِ شاد یہ اعزاز پایا

ہوا غربت میں عزت کا پہ سانا

یہ وہ حوصلہ افزائی تھی کہ جناب جلیل نے دکن میں اپنی سکونت کے وقفہ کو طویل کر دیا تھا۔ وہ حیدر آباد ہی میں رہے جب کہ اہل و عیال مانچور میں تھے۔ یہاں ملازمت کی کوئی مستقل صورت نکلنے تک مہاراجہ کا بہرہ ورانہ و مہربانہ سلوک تسکینِ قلب کا باعث تھا۔ مہاراجہ جلیل کے شاعرانہ کمال ہی کے معترف نہ تھے بلکہ ان کے حسنِ اخلاق اور پاکیزہ سیرت کے بھی گرویدہ تھے۔ غریب الوطنی کے پیشِ نظر ان کی ضروریاتِ زندگی کی بہر قدم کفالت کرتے رہے۔ بعد میں مشورہ سُنن بھی فرمانے لگے۔ شاگردی اور اساتذی کا

۱۔ مہاراجہ سرکشن پر شاد شاد کی ذات حیدر آباد میں شاعری علمِ ودیعی اور تہذیبِ شائستگی کا سمبل رہی ہے۔ اپنے نانا مہاراجہ چند دلال کی روایات کو برقرار رکھا۔ دولتِ اصفیہ میں پیشکاری سے وزارتِ عظمیٰ کے عہدہ تک پہنچے۔ راجہ راجگاں مہاراجہ بہادر اور یمن السلطنت کے القاب پائے۔ اردو کے شاعر و ادیب ہی نہیں اردو کے عظیم مرثیہ سرسبز اور محسن بھی تھے۔ بیکروں ادیبی شاعران کے در دولت سے وابستہ تھے ہندوستان کی شاہی کویٰ ایسی مژدہ دہی ہو جس مہاشا کے سرانم ہے ہوا انہوں نے اپنی داد و دوش اور سرسبز سے جو خدا انجام ہیں ادیب

یہ سلسلہ تادم آخر قائم رہا۔ شاد کے ایک نجی مکتوب میں اس کا حوالہ یوں ملتا ہے  
حضرت استاد جلیل

ایک عرصہ سے غیر حاضر رہا۔ اس کا سبب پریشانی اور کچھ  
علاات بھی تھی۔ ایک فارسی اور ایک اردو دو غزلیں بھیجتا  
ہوں۔ نظر ثانی کے بعد عنایت ہوں۔ آپ کی خدمت میں  
عید کا تحفہ روانہ کرتا ہوں۔

برگ سبزا ست تحفہ درویش  
فقر کش پر شاد شاد

جلیل کی امداد کے لئے جناب شاد نے اپنی نگرانی میں نکلنے والے دو ماہناموں  
”دبدبہ آصفی“ اور ”محبوب الکلام“ کی ادارت جلیل کے سپرد کر دی تھی۔ اس کے علاوہ ایوان  
شاد کے دیگر ادبی و شعری مشاغل میں بھی جلیل کی شرکت کو ضروری سمجھا۔ مہاراجہ نے چند ادبی  
شخصیتوں پر مشتمل ایک مجلس اتحاد کی بنیاد ڈالی تھی جس میں شعرا اپنا طرخی و غیر طرخی کلام سناتے  
تھے۔ ان محفلوں میں شعرا کے کلام پر فن و زبان کے اعتبار سے تنقیدیں بھی ہوتی تھیں۔  
مجلس اتحاد کے اراکین میں قابل ذکر غلام مصطفیٰ رسا، ظہیر دہلوی، سراج الدین علی خاں  
ساکل، ضیاء یار جنگ، فصاحت جنگ جلیل اور اختر یار جنگ اختہ تھے۔

لے دبدبہ آصفی، میر محبوب علی خاں آصف کی تقریباً سائیکھ کی تنہیت میں (۱۳۱۵ھ) زیر نگرانی شادیہ ماہنامہ جاری  
ہوا۔ یہ ایک علمی و ادبی ماہنامہ تھا جس میں اخلاقی، سماجی اور نظریاتی قسم کے مضامین چھپتے تھے۔ ہر ماہ کی  
چھٹی تاریخ کو شائع ہوتا تھا۔ ہمت افزائی کے لئے بہترین لکھنے والے کو ہر ماہ ایک اشرفی انعام کے طور  
پر دی جاتی تھی۔ شاہ آصف کی حیات تک جاری رہا۔ (مہاراجہ کشن پر شاد، ڈاکٹر حبیب ص ۲۷۴)

یہ رسالہ ابتداء میں پنڈت رتن ناتھ سرشار اور مولوی حبیب الرحمن صاحب دلی کی ہمتی میں رہا۔ پھر  
جلیل حسن جلیل مانیکپوری کے زیر اہتمام نکلنے لگا۔ (مانک راؤ و مٹھل راؤ، بستان آصفیہ ص ۱۳۲، ص ۹۷۸)  
لے محبوب الکلام دبدبہ آصفی کے بعد ہی (۱۳۱۶ھ) مکمل شروع ہوا اس سال میں ہر ماہ دینے ہوئے معرہ طرح  
پر اردو اور فارسی کی غزلیں شائع ہوتی تھیں۔ شاہ آصف اور شاد کی غزلیں بالالغت تمام سلیب صفحات پر چھپتی  
تھیں ڈاکٹر معنی تبسم، قادی بدایونی ص ۸۳، ۸۴، ۱۹۶۹ء حیدرآباد مہاراجہ کشن پر شاد ص ۲۷۴، ۲۷۵

حیدرآباد میں جلیل کے قیام کا مقصد دربار نظام تک رسائی حاصل کرنا تھا اور اس کے لئے مہاراجہ شاد کی خوشنودی و فردوسی تھی اور یہ مرحلہ وہ طے کر رہے تھے اسی درمیان جب پیشکاری کے عہدہ سے ترقی کر کے مہاراجہ بہادر قلمدان وزارت سے سرفراز کئے گئے تو جناب جلیل نے مصاحب ہونے کی حیثیت سے بطور تہنیت مدحیہ قطعات و رباعیات موزوں کئے۔ چند رباعیاں درج ہیں :

سردنتر اربابِ فضیلت ہیں شاد      سرمایہٴ نازشِ حکومت ہیں شاد  
کہتا ہے یہ اقبالِ خدا ہو ہو کو      زیبا نشِ سند وزارت ہیں شاد

اس جنِ طرب سے اہلِ عالم ہیں شاد      منموم جو تھے کہتے ہیں اب ہم ہیں شاد  
کیا دور ہے اس دور کے قربانِ جلیل      آصفِ سلطان و وزیرِ اعظم ہیں شاد

لو بختِ دکن کا آج تارا چمکا      سرکار کا کچھ پا کے اشارا چمکا  
ایسی ہوئی خلعتِ وزارت کی خوشی      ہم سمجھے کہ اقبالِ ہمارا چمکا

دلی کا سفر مہاراجہ شاد کی ہمراہی میں،

۱۹۱۳ء میں ملکِ معظم ایڈورڈ ہفتم کے دربارِ تاجپوشی میں شرکت کے لئے مہاراجہ بہادر نے والی دکن کے ساتھ دلی کا سفر کیا تو اپنے اسٹاف میں جلیل کو بھی ساتھ رکھا اختر مینائی بھی ہمراہ تھے۔ دورانِ سفر میں انہوں نے شکرگزاری کے طور پر حسبِ ذیل قطعات شاد کی نذر کئے۔

دلی کا بھی کیا فرحتِ اثر ہے یہ سفر      ہے کھٹکِ حضوری تو حضور ہے یہ سفر  
کہتا ہے یہ مٹبہ بڑھ کے دقارِ سرکار      سرکارِ وسیلۃ الظفر ہے یہ سفر

۲۷ اکتوبر بروز پنجشنبہ کو مہاراجہ مدارالہمام بھی دلی روانہ ہوئے گئے۔ اختر اردو حافظِ جلیل ان کے ہمراہ ہوں گے۔ (مکتوبِ داغ بنامِ احسن ماہروی، ص ۲۳)

ہے شاد کا شمیم شادمانی کی مثال اور اس میں الف ہے اس نشان اقبال :-  
 کس شان کے یہ حرف ہیں قربانِ جلیل آخر میں جو دال ہے وہ دو پہ ہر دال  
 دربار دلی کے اس موقع پر جلیل نے جو تاریخی قصیدہ کہا وہ ہندوستان کے  
 رسائل میں چھپا اور بہت مقبول ہوا۔ یہ طویل قصیدہ (۱۳۸) شعروں پر مشتمل تھا اس  
 قصیدے سے جلیل کے جوش طبع کا اندازہ ہوتا ہے۔ طوالت کو نظر انداز کرتے ہوئے  
 یہاں صرف قصیدے کے چند آخری اشعار پر اکتفا کرتا ہوں۔

دربار دہلی کے موقع پر تمام دالیان ریاست کو مدعو کیا گیا تھا۔ جلیل ان سب  
 کا ذکر کرتے ہوئے والی دکن شاہ آصف کی مدح پر آتے ہیں۔

میر محبوب علی خان بہادر آپ ہیں ہیں انھیں کے ساتھ تائید علی آئی ہوئی  
 مر حبا آراستہ کیا قیصری دریا ہے جسکے شوق دید میں خلوق سودائی ہوئی  
 اور پھر مہاراجہ شاد کے اوصاف بھی گنائے ہیں۔

کون ہیں یہ سر مہاراجہ کشن پرشاد ہیں شاہ آصف کی وزارت جنگی شیدائی ہوئی  
 آپ کے اقبال سے چکا لھیا ملک کا آپ کے دم سے حکومت کو تو انائی ہوئی  
 شاد رکھا آباد رکھ یارب جناب کو تیری رحمت کی گھٹاسر پر چھائی ہوئی

## امید واری اور بے اطمینانی کا دور :

اس طرح دقت گزرتا گیا اور جلیل کے دکن میں سکونت پذیر ہو جانے کی کوئی مستقل  
 صورت نہیں نکلی۔ یہ دور جلیل کے لئے بڑی بے اطمینانی اور پریشانی کا دور تھا انہوں نے  
 اگرچہ دکن سے اپنی وابستگی کو مستحکم کر رکھا تھا لیکن اس کی حقیقت یہ تھی کہ جلیل موجودہ دور  
 حال سے مایوس و پریشان تھے۔ اس بے اطمینانی کا اظہار ان کے حسب ذیل شعروں سے  
 ہوتا ہے جو انہوں نے اس دقت بڑی مایوسی کے عالم میں کہے تھے۔

دل پہ تازہ ہے ابھی داغِ امید گو جدائی کو یہ چوتھا سال ہے  
 تھی انھیں تک اپنی ساری آبرو اب نہ وہ عزت نہ وہ اقبال ہے  
 غربت و افلاس کا ہے دور دور کشورِ دل غم سے مالا مال ہے

لے مبارک تجھ کو اے افتادگی      یاں شکستہ پائے استقلال ہے  
 اٹھ ہے اور اسٹکاری رات دن      ابر کا ٹکڑا مرا دو سال ہے  
 کیا ہمارے ہی لئے اے آسمان      جن راحۃ کا جہاں میں کال ہے  
 رہ گئی فسر سخن باوئے طاق      اب یہاں فکرن و اطفال ہے  
 ایک جال زار لا کھول تسید غم      سینہ اپنا غیرت غریب ہے  
 اس کے بھلے بھولنے کی کیا اُمید      جس کی کشت آرزو پا مال ہے  
 شکوہ اب کس سے بحر تقدیر کے      قول سعدی کا یہ حسبِ حال ہے

از چشیں بد زندگانی مردہ بہ

جلیق کی بیاض یادداشت میں ایسی کئی نظمیں محفوظ ہیں جن سے ان کی حیات  
 کے اس پہلو پر روشنی پڑتی ہے ان میں سے دو ایک جناب شاد سے منسوب ہیں جن  
 میں انھوں نے بے تکلف عرضِ حال کیا ہے مثلاً

ہم نے مانا کہ دشتِ غربت میں      ٹٹ گئی اپنی آرزو ساری  
 لیکن اس میں بھی شک نہیں کوئی      شاد کا بحرِ فیض ہے حبابِ ساری  
 سارے عالم پہ رحمت کی نظر      ساری خلقِ خدا انھیں پیاری  
 غیر سے غیر جو ہیں ان کی بھی !!      ہوتی ہے دلہی و غنچواری  
 کیوں نہ پھر ان سے عرضِ حال کر دوں      اے شہِ آسمانِ سرداری

دوستانِ راکبِ کئی محروم

تو کہ بادِ شہاں نظرِ داری

مرزا داغ دہلوی کی رحلت :

حیدر آباد آکر استاد شاہ بننے سے پہلے مرزا داغ رام پور میں تھے۔ ۱۸۸۶ء  
 میں رام پور چھوڑ کر دلی چلے گئے۔ ۱۸۸۸ء میں پٹی مرتبہ حیدر آباد آئے تھے اور مقصدِ بکری  
 نہ ہونے سے دلی واپس ہو گئے تھے۔ دوسری مرتبہ سرگاماں جاہ کی طلبی پر ۱۸۹۱ء میں  
 دوبارہ حیدر آباد آئے اور استاد شاہ بن کر فیض الملک خطبہ پایا۔ مجدد سالِ ہجری

سفین

میر محبوب علی خاں آصف کے دربار سے وابستہ رہ کر ۱۹۰۹ء میں انتقال کیا۔ درگاہ یوسف  
میں اقمیر مینائی کی تربیت کے قریب مدفون ہوئے دکن اور شمالی ہند کے اخباروں اور  
رسائل میں مرحوم کے تعلق سے سیکڑوں مادد تاریخ لکھائے گئے۔

جلیل نے اپنی نگرانی میں شائع ہونے والے ”دہدہہ آصفی“ میں مرزا داغ  
پر ایک بسیط مضمون لکھا۔ اس کے ساتھ ایک طویل قطعہ تاریخ بھی موزوں کیا جس کے  
کچھ اشعار یہ ہیں۔

تھا دل میں استیر کا جہاں داغ      گل تازہ کھلا گئے وہاں داغ  
کل داغ سے انجمن تھی روشن      آباد ہے آج ان سے مدفن

باتوں میں وہ سحر سازی ان کی      برجستہ سخن طرازی ان کی  
گرمی وہ بیان میں غضب کی      شوخی وہ زبان میں غضب کی  
دلکش وہ ترانہ تغزل      وہ رنگ کہ دنگ جس سے بلبلیں

دہلی کا چمن بخت مولدان کا      بنتا تھا دکن میں مردان کا  
تلمیذ جناب ذوق مغفور      استاد سے بھی زیادہ مشہور

فردوس کو ہو گئے روانہ      وہ چل بے رہ گیا فساد  
ہے مہر سال رحلت داغ      صد حیف وہ دل کو دریغ

۶۲ ۱۳۷۶

رامپور جسے جلتیل کی طبعی :

دکن میں اُمیدواری کے اس زمانے میں جب کہ ملازمت کی کوئی مستقل صورت  
نہیں تھی تھی نواب حامد علی خاں دالہ رام پور کے سکریٹری مصطفیٰ علی خاں شر حیدر آباد  
آئے اور جلتیل سے رامپور چلنے کے لئے مجید اصرار کیا۔ حاذق الملک حکیم اجمل کے بھی مشورہ

خطوط آئے کہ لڑاب صاحب رامپور آپ کو یاد فرماتے ہیں۔ لڑاب موصوف کو شاعری سے ذوق تھا اور یہ موقع ایسا تھا کہ حیدر آباد میں کوئی مستقل صورت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ لڑاب رامپور کے طلب فرمانے پر جلیل حیدر آباد کو خیر یاد کہہ کر واپس جاسکتے تھے لیکن انھوں نے آمادگی ظاہر نہیں کی۔ اس کے کئی وجوہات تھے۔ ایک یہ کہ دکن میں جلیل کی شاعری کا سنگ بیٹ چکا تھا اور وہ مستقل سے ابھی پوری طرح ناامید نہیں ہوئے تھے۔ دوسرے یہ کہ خلف امیر مینائی لطیف احمد اختر مینائی ان کے ہمراہ تھے اور ان کے رد کی کوئی صورت نہیں نکلی تھی۔ ان کو حیدر آباد میں تنہا چھوڑ دینا ممکن نہ تھا۔ تیسرے یہ کہ استاد زادے کا پاس ادب مانع ہوا چنانچہ آپ نے فرستادہ لڑاب جناب شر سے کہا کہ رامپور میں استاد کے بڑے صاحبزادے محمد احمد صریہ مینائی کی موجودگی میں میری کیا ضرورت ہے۔ اس واقعہ کے بعد دو ایک بار وطن مانچند گئے لیکن کبھی رامپور کا قصد نہیں کیا۔

## مہاراجہ کشن پرشاد شاد کا مشاعرہ:

حیدر آباد میں اردو کو سر بلند کرنے میں جو عوامل کار فرما رہے ہیں ان میں سب سے زیادہ طاقتور عامل شاد کے وہ خاص مشاعرہ ہیں جو ان کی سرپرستی اور نگرانی میں منعقد ہو کر تے تھے۔ پیشکاری کے جذبہ پر سر فراز ہونے کے بعد ہی سے مہاراجہ کے مشاعروں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو ایوان شاد میں ترتیب دیے جاتے تھے۔ ابتدا میں عموماً مہینے میں دو بار مشاعرہ کی محفلیں جمتی تھیں جو صبح سے شام تک جاری رہتی تھیں۔ شعرا کی تواضع اور مہانداری کا اہتمام مہاراجہ ہی کی طرف سے ہوتا تھا۔ ان مشاعروں میں کسی خاص مصرع کی پابندی نہیں ہوتی تھی۔

ایوان شاد میں منعقد ہونے والے ان مشاعروں میں بالعموم جو اساندرہ حصہ

لے مریر مینائی خلف امیر مینائی جن کو لڑاب رامپور امیر کے دھمال کے بعد اپنا سلام دکھانے لگے تھے۔

لیتے ہیں میں غالب ذکر استاد الملک شومسری، عبد الجبار خاں آصفی، گردھاری لال بائی،  
عبد العلی وآلہ، ترک علی شاہ ترکی، غلام قادر گرامی، ظہیر دہلوی، سراج الدین سائل،  
ہیاد یار جنگ، حیدر علی نظم طباطبائی، غلام مصطفیٰ خاں رستا، ضامن کنٹوری، آزاد انصاری،  
نواب وزیر الدولہ نادر علی برہنہ، عبدالصمد آصفی، مہدی حسین آلم، محبوب راج محبوب،  
عابد علی بیگم اور اجملال وغیرہ۔

جس مشاعرہ کا ذکر یہاں مقصود ہے، وہ خصوصی مشاعرہ ہے جس کا اہتمام  
ہمارا جہ شاد نے مرزا داغ دہلوی کی رحلت کے دوسرے سال میر محبوب علی خاں آصف والی  
دکن کی جشن جوہلی کے موقع پر کیا تھا۔ یہ مشاعرہ کئی وجوہ کی بناء پر بڑی اہمیت کا حامل ہے  
ایک اپنی تاریخی نوعیت کے اعتبار سے اور دوسرے اس لحاظ سے کہ اس نے جلیل کی  
زندگی کو معراج کمال تک پہنچایا۔ تیسرے یہ کہ جشن جوہلی کا مشاعرہ ہونے سے خود  
اعلیٰ حضرت شاہ آصف اس محفل شعر و سخن میں رونق افروز تھے۔ یہ پہلا مشاعرہ تھا جس میں  
جلیل کو شاہ دکن نے دیکھا اور سنا اس مشاعرہ میں مرن متاد شعرا کی مدعو کئے گئے تھے۔  
مولانا حالی جو اس وقت حیدر آباد آئے ہوئے تھے وہ بھی موجود تھے۔ لطیف احمد  
اختر مینائی جو اس محفل میں شامل تھے اس مشاعرہ کا آنکھوں دیکھا حال یوں بیان کرتے

”ہمارا جہ بہادر کے آئینہ خانہ میں مشاعرہ ترتیب دیا گیا تھا  
اعلیٰ حضرت (شاہ آصف) کے لئے تخت پر زرین کرسی رکھی  
گئی تھی مگر اسے نظر انداز کرتے ہوئے تخت سے تکیہ لگا کر فرش  
پر بیٹھ گئے اور شعرا کو اشارے سے بیٹھنے کی اجازت دی۔  
جناب شاد نے شعرا کی فہرست مکمل و مرتب کر لی تھی۔ شعرا کو  
مرن (۱۲) شعر پڑھے گا یا بند کر دیا گیا تھا۔ فہرست میں جلیل  
کا نمبر ایک سو الٹا تھا۔ مشاعرہ شروع ہوا۔ ہمارا جہ شاد یکے بعد دیگر

لہ اختر مینائی غلط آئینہ مینائی ترک رامپور کر کے جناب جلیل کے ہمراہ ہی دکن میں مقیم تھے لہذا  
میں اختر یار جنگ کا خطاب پایا اور ناظم مرن ہوئے۔ دونوں نے رفاقت نبائی اور ناظم مرن کے دو قلم

تخلص سے پکارتے۔ شاعر سامنے جا کر آداب بجالاتا اور بیٹھ کر اپنا قصیدہ پڑھتا۔ قصیدہ پڑھنے کے بعد نقش و نگار سے مزیں فریم ملاحظہ اقدس میں پیش کر دیا جاتا جسے شاہ آصف اپنے ہاتھوں میں لے کر لوہا ابصر الملک کے حوالے کر دیتے۔ یہ سلسلہ چلتا رہا کئی شعر اپنا کلام سنا چکے مگر اعلیٰ حضرت نے کوئی جنبش نہ فرمائی۔ سکوت کے ساتھ کلام سنتے رہے۔ ساری محفل میں ایک سناٹا تھا۔ صرف پڑھنے والے کی آواز گونجتی تھی۔ جب محفل کا یہ رنگ دیکھا تو شاہ نے مہاراجہ بہادر سے کچھ فرمایا اور مہاراجہ شاد نے فہرست کے خلاف سلسلہ نمبر توڑ کر بلند آواز سے جلیل صاحب جانشین امیر مینائی کہہ کر پکارا۔ حافظ صاحب کا نمبر دُور تھا۔ وہ اطمینان سے اپنی جگہ بیٹھے رنگ محفل دیکھ رہے تھے۔ اپنے نام کی پکار سن کر چونکے۔ میں باز وہی بیٹھا تھا۔ مجھ سے پوچھا کیا مجھے پکارا ہے۔ میں نے تصدیق کی۔ فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اعلیٰ حضرت کے سامنے جا کر آداب بجالائے اور حسب دستور روبرو بیٹھ کر قصیدہ کا پہلا مصرع پڑھا۔

حسن شایر میں عجب رنگ اُچھلتے دیکھا  
اس مصرع کو سنتے ہی اعلیٰ حضرت جو تخت سے تکیہ لگائے ہوئے نیم دراز تھے سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ دوسرا مصرع پڑھا گیا۔

ساغر عیش کو بے پاؤں کے چلتے دیکھا  
شاہ نے بیساختہ فرمایا۔ کیا کہتا۔ آصف کی اس تملیہ پر

معاہدین اور امرانے نعرہ تحسین بلند کیا۔ محفل پر جو جمود طاری  
تھا وہ دفعۃً واہ واہ کے شور سے بدل گیا۔ اس کے بعد  
اعلیٰ حضرت ہر شعر پر داد دیتے رہے۔ مہنا جہ کی ہدایت صرف  
[۱۱] شعر پڑھنے کی تھی۔ اس ہدایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے  
مقطع کا گیارہ حوالہ شعر پڑھا۔

بدیع شاہی میں یہ رہیں سخی راہ جلتیل  
آج تو ہم نے تجھے نعل اُگلتے دیکھا  
ارشاد ہوا۔ بیشک تم نے نعل اُگلا ہے۔ آپ آداب شاہی  
بجالاتے ہیں جگہ واپس آئے۔

اسی کے بعد ہر دست کے لحاظ سے پھر سلسلہ قائم ہوا لیکن  
محفل پر وہی جمود و سکوت طاری ہو گیا۔ کسی کا رنگ نہ جما۔  
محفل برفاست ہوئی تو جلتیل نے بھی واپسی کا قصد کیا۔ ابھی  
دروازے کے پاس پہنچے ہی تھے کہ کسی نے پشت پر ہار  
رکھا۔ پلٹ کر دیکھا تو خود مہاراجہ بہادر تھے۔ انھوں نے  
اہستہ سے فرمایا پیچھے آؤ۔ آپ پھر اسی مشاعرہ ہال میں  
پہنچے۔ اعلیٰ حضرت ایستادہ تھے۔ شمشیر مرصع ہاتھ میں تھی  
ہال خالی ہو چکا تھا۔ صرف اُمرانی جگہ کھڑے تھے۔ شاہ  
اصف نے جلتیل سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا۔ میں تم سے  
پورا قصیدہ سنانا چاہتا ہوں افسر الملک کو حکم ہوا کہ فریم کیا  
ہوا قصیدہ نکالا جائے۔ فریم کی تلاش میں دقت ہوئی تو  
جناب جلتیل نے عرض کیا کہ ندوی کے پاس نقل موجود ہے  
پوچھا گیا سب اشعار ہیں۔ آپ نے عرض کیا سب ہیں۔

شروع سے مکرر قصیدہ سنانا شروع کیا۔ ہر شعر پر اعلیٰ حضرت  
داد دیتے رہے۔ تلوار کو زمین پر ٹیک کر کئی بار ارشاد فرمایا

افسوس کہ اتیر بھی نہیں داغ بھی نہیں۔ اسی عالم میں تقریباً

۲ بجے صبح دربار برخواست ہوا۔

[۲۷] اشعار کے اس قصیدے کے کچھ شعر یہ تھے:

وہ چمن آج مقدر لے دکھایا ہم کو      نخلِ اُمید جہاں پھولتے پھلتے دیکھا  
گھر سے نکلتے بھی اس جشن کے نظار کو      ایک اک دل سے تمنا کو نکلتے دیکھا

روشن افروز ہی سرکار کا مژدہ سنکر      نگہِ شوق کو آنکھوں میں مچلتے دیکھا  
اس خبر سے کہ سرِ شامِ جمے کا دربار      ہم نے ڈویے ہوئے تاروں کو نکلتے دیکھا  
ہمسری کر کے سنا مہرِ فلک نے پائی      وہ لگی آگ کہ دن بھر سے جلتے دیکھا

سیرگاہیں ہیں نرالی شہِ والا کے لئے      کبھی آنکھوں میں کبھی دل میں ٹپکتے دیکھا  
تاجِ حکم ہے آصف کا زمانہ ایسا      کہ اشارے یہ شب و روز کو چلتے دیکھا  
اس زمانے میں وہ آرام کا سامان ہوا      کہ زمانے کو بھی کروٹ نہ بدلتے دیکھا  
فتنہ گر فتنہ و شر سے ہوئے تاباں ایسے      عطرِ فتنہ بھی نہ پوشاک پہ ملتے دیکھا  
یا خدا عمرِ خضر ہوش و لا کو نصیب      اس دعا کو دلِ علم سے نکلتے دیکھا  
اس مشاعرے نے مستقبل میں جلیل کی ترقی و منزلت کے لئے راہ ہموار کر دی۔

لقب جلیل القدر :

۱۹۰۸ء ۱۳۲۶ھ میں جلیل کی ایک بہت اہم نثری تالیف ”تذکرہ ثنائیت“ شائع ہو کر  
منظرِ عام پر آئی۔ اس کتاب کے ذریعہ اردو زبان کی ایک اہم خدمت انجام دی گئی۔ اس میں  
سات ہزار الفاظ کا تذکرہ ثنائیت بیان کی گئی ہے اور مثال میں اشعار دیئے گئے ہیں۔  
یہ اپنی نوعیت کا پہلا لغت تھا جس سے جلیل کی زبان دانی کا پتہ چلتا ہے۔ مولانا عبدالحکیم  
لکھنوی نے اس کتاب کا جو دیباچہ لکھا ہے اس سے اس کی ضرورت و اہمیت کا اندازہ  
ہوتا ہے۔

یہ نایاب تالیف جلیل نے اعلیٰ حضرت کی خدمت میں پیش کی تو شاہ آصف کچھ دیر تک کتاب کو ملاحظہ فرماتے رہے پھر یہ مصرعہ برجستہ ارشاد ہوا:

جلیل القدر ہو صاحب تمہاری بات کیا کہنا

اس لقب کی سرفرازی پر جلیل نے اسی مصرعہ پر ایک مدحیہ قصیدہ منقول کر کے ہمارا جہ شاد کے توسط سے بارگاہِ خسروی میں گزارا۔ اس قصیدہ کا مطلع یہ تھا،

جلیل القدر ہو صاحب تمہاری بات کیا کہنا

یہ وہ مصرع ہے جس پر چاہئے صدمہ صحت کہنا

جلیل القدر لقب کی سرفرازی کے یہ معنی تھے کہ شاہ آصف کی نگاہ انتخاب میں جلیل کے کمال آگئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ نواب مرزا داغ کی وفات ہو چکی تھی اور اعلیٰ حضرت کی نگاہِ جوہر شناس کسی موزوں شخصیت کی تلاش میں تھی۔

## رود موسیٰ کی طغیانی:

عالمِ غربت میں جلیل اور اختر مینائی نے محلہ افضل گنج میں ایک مکان کرایہ پر لے لیا تھا۔ وہیں رہتے تھے۔ ۲۸ دسمبر ۱۹۰۸ء ۱۳۲۶ھ کو اچانک ایک بلائے ناگہانی آئی شہر حیدرآباد کے درمیان سے ہو کر بہنے والی موسیٰ ندی کی پانی کی سطح بڑھنا شروع ہوئی یوں تو بارش کا سلسلہ کئی دنوں سے جاری تھا لیکن ماہ رمضان کی پہلی شب کورات بھر پانی برستا رہا۔ ابھی صبح ہونے میں کچھ دیر تھی کہ سڑکیں پانی میں ڈوبنے لگیں۔ ایک رات اور دن میں (۱۷) انچ بارش ہوئی۔ طغیانی کے دن لوگوں کو مصیبتوں اور آفتوں کا ناقابلِ بیان سامنا کرنا پڑا۔ کچھ عجب بے بسی ویسے کسی کا عالم تھا۔ جدھر دیکھو پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔

لے موسیٰ ندی شہر حیدرآباد کو دو حصوں میں بانٹتی ہے اور اس پر پانچ پُل بنے ہوئے ہیں یہ ندی انت گیری (وقار آباد) کی پیٹریوں سے نکلتی ہے اور حیدرآباد کے شمالی جانب سے ۱۲ میل تک مشرق کی جانب بہتی ہوئی شہر میں داخل ہوتی ہے کئی مقامات سے تالوں کے لئے کئی نہریں نکالی گئی ہیں اس ندی میں پہلی طغیانی بعد سلطان عبداللہ قطب شاہ ۱۶۲۳ء میں آئی تھی۔

قریب کے محلے جو متاثر ہوئے ان میں افضل گنج، محبوب گنج، چھتہ بازار، بازار سدی عنبر اور گوشہ محل قابل ذکر ہیں۔ اکثر لوگ اس دھوکے میں رہے کہ پانی ان کے مکانات نہیں آئے گا۔ طبع ہونے تک طفیانی شباب پر آچکی تھی۔ تمام لوگ جو ندی کے قریب سکونت رکھتے تھے اور جو نامہ پر رہتے تھے دونوں اپنے اپنے مکانات چھوڑ کر بھاگنے لگے۔

جلیل واختر نے بھی سوچا نہ تھا کہ ایسی صورت حال پیدا ہوگی۔ جان بچانے کی فکر میں سارا سامان گھر پر چھوڑ دوڑوں مکان سے باہر نکل آئے۔ اختر میٹائی نے دیوان تاج سخن کا مسودہ ہاتھ میں لے لیا۔ بلا تعین منزل آگے بڑھنے لگے۔ سدی عنبر بازار تک پہنچے تھے کہ پانی کا زور بڑھ گیا۔ اس پانی سے بدقت تمام گزرے تو ثواب عزیزی جگ بہادر اس ہنگامہ میں بل گئے اور سیلاب کی زد سے نکلنے ہوئے اپنے مکان پر لے گئے اور پناہ دی۔ دوسرے دن جب طوفان کا زور کچھ ٹوٹا تو جلیل واختر اس امید پر مکان دیکھنے گئے کہ شاید کچھ اناٹہ بچا ہو لیکن سب کچھ نذر آب ہو چکا تھا۔ ہمارا جہ بہادر شاد بھی معائنہ کی غرض سے افضل گنج تشریف لائے۔ جلیل کو دیکھ کر خیر دریافت کی جلیل نے صورت حال عرض کی۔ فرمایا دیڑھی میں آجائیے چنانچہ جلیل اور اختر کچھ روز تک ہمارا جہ شاد کے یہاں مقیم رہے۔ اس کا تذکرہ جلیل کے ایک مکتوب میں یوں ملتا ہے جو صفدر مرزا پوری کا موسومہ ہے۔

”آپ کو اخباروں سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ حیدر آباد سیلاب عظیم کے آنے سے تباہ و برباد ہو گیا۔ ہزار ہا حائمی نذر آب ہوئیں اور محلے کے محلے ماف ہو گئے۔ اللہ سبحانہ نے اپنے فضل سے ہم لوگوں کو بچایا۔ مکان اور سارا سامان ہمارا بھی دریا بڑے ہو گیا۔ فی الحال دیوان وزارت میں پناہ ہے۔ مکان کی تلاش ہے۔ آج کل بلدہ حیدر آباد میدانِ حشر کا نمونہ ہے۔“

## چوتھا دور

### جلیل بحیثیت استادشاہ

حیدرآباد میں جلیل کی اُمیدواری اور حاشی نا آسودگی کا زمانہ تقریباً ۹ سال پہلے مرزا داغ کے انتقال کے بعد تیر محبوب علی خاں آصف نے ایک عرصہ تک کسی سے مشورہ نہ سُنن نہیں کیا۔ دکن اور شمالی ہند کے نامور شاعروں میں سے ہر ایک اس انتظار میں تھا کہ دیکھیں قرعہ فال کس کے نام پڑتا ہے۔ اس ورمیان جلیل کا یہ دستور رہا کہ ہر سرکاری تقریب کے موقع پر کچھ نہ کچھ لکھ کر ضرور گزرا نیتے۔ لیکن منزل کا پتہ نہ تھا۔ سنبھالا تھا تو بس یہ کہ دنیا فتناً شاہ آصف کے جو رجحانات ظاہر ہوتے تھے اس نے تاریکی میں روشنی پیدا کر رکھی تھی۔ جلیل کو اپنی شاعری پر اعتماد تھا جس کے سہارے دن گزرتے تھے۔

### ایوان شاہی (چومحلہ) میں جلیل کی طلبی

ایک دن کسی شاہی تقریب کے موقع پر شاہ آصف نے ایک قطعہ سونوں کیا۔ غالباً کس شاہزادے کی بسم اللہ کی تقریب تھی۔ اس کے لئے جو اشعار کہے تھے ان میں ایک محاورہ باندھا۔ اس میں اشتباہ تھا۔ مطلب براری بھی برابر نہیں ہو رہی تھی۔ تقریب کے آغاز میں کچھ دیر باقی تھی۔ ہماں سب آچکے تھے۔ ریجنڈنٹ کے

کے آنے کا انتظار تھا۔ ہمارا جہ شاد دہاں موجود تھے۔ ان سے ارشاد ہوا کہ جلیل صاحب کو بلواؤ۔ ہمارا جہ ایک مدت سے اسی گھڑی کے منتظر تھے۔ چاہتے تھے کہ باریابی کی کوئی صورت نکلے۔ فوراً سواری کے ساتھ جو ہدار کو بھیج کر مسکن سے بلوایا۔ جلیل کے آنے میں کچھ دیر ہوئی۔ چوملہ میں اعلیٰ حضرت بے چینی سے منتظر تھے اور بار بار دریافت فرماتے تھے جلیل صاحب آئے۔ ہمارا جہ بے کیف ہو کر سڑک پر آگئے۔ اس اثناء میں آپ کی مٹاڑی پہنچی۔ ہمارا جہ نے کہا استاد غضب ہو گیا۔ سرکار دیر سے یاد فرما رہے ہیں۔

جناب شاد آپ کو ہمراہ لے کر تیز قدم اس کمرے کی طرف گئے جہاں شاہ رفیق افروز تھے۔ آپ کمرے میں داخل ہوئے تو دیکھا۔ والی دکن ایک کرسی زریں پر جلوہ فرما رہی۔ سامنے ایک چھوٹی کرسی رکھی ہوئی ہے۔ آپ آداب شاہی بجالائے۔ خالی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ ہوا۔ بلند آواز سے پوچھا گیا۔ کیا تم ہی جلیل ہو۔ مودیانہ عربی کہ فدوی ہی جلیل ہے۔ اعلیٰ حضرت کے ہاتھ میں ایک پرچہ تھا۔ جس پر کچھ اشعار لکھے تھے۔ ایک لفظ کے متعلق ارشاد ہوا اسے تبدیل کرنا ہے۔ اسی لمحہ دوسرے لفظ کے ساتھ جلیل نے مصرع پڑھا۔ شاہ کی طرف سے خاموشی دیکھ کر دوسرا اس کے بعد تیسرا پھر نئے لفظ کے ساتھ چوتھی بار مصرع پڑھا۔ چوتھے مصرع پر اعلیٰ حضرت بہت محفوظ ہوئے۔ ارشاد ہوا۔ یہ خوب ہے۔ میں یہی چاہتا تھا۔ اسی دقت پٹیل سے ٹوٹ فرمایا گیا اور تب وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ جلیل واپس ہوئے تو ہمارا جہ ہمارے دور تک چھوٹنے آئے اور شانے پر ہاتھ رکھ کر مبارکباد دی۔

اس واقعہ کے چند دن بعد ایک فرمان کے ذریعہ نظام دکن میر محبوب علی خاں آصف نے جلیل کو داغ کی جگہ منصب استاد بخشا۔ فرمان مبارک جو مرخصی سے جاری ہوا یہ تھا۔

نقل فرمان

مراسلہ محکمہ معتمدی مرخصی پیشی خداوندی واقع ۱۶ شوال ۱۳۲۶ھ

م ۲۱، آذر ۱۳۱۹ھ نشان ۳۶

منجانب نواب تھورا ملک بہادر منصرم { بشرف صدر فرمائندہ ۱۵ شوال ۱۳۲۶ھ  
و معتمد اطلاع دفتر تنخواہ محلات مبارک }

بایں حکم کہ جلیل حسن صاحب جلیل کے نام داغ مرحوم کی جائداد میں سے پانچ سو روپیہ حالی ماہوار صرفہ خاص سے جاری کی جائے۔ ترقیم ہے کہ حسب عمل کیا جائے۔  
 ۱۔ داغ ہو کہ داغ صاحب کے نام پیر ماہوار ذریعہ مراسلہ محکمہ ہذا نشان ۳۶۱۲ مورخہ ۷ ربیع الاول ۱۳۱۲ء اجرا ہوئی ہے جس سے واضح ہو گا کہ علاقہ دیوانی میں پیر ماہوار جاری ہو کر خزانہ صرفہ خاص میں داخل اور ذریعہ دفتر تقسیم محلات مبارک ایصال ہو ا کرتی ہے۔  
 ۲۔ ایک ایک شے دفتر صدر محاسبی صرفہ خاص اور حافظ جلیل حسن جلیل کے نام میں ہے۔  
 شہد سخط مستند

اس منصب استاد کے شکریہ میں جلیل نے ایک معرکتہ الآرا قصیدہ پیش کیا۔ اس قصیدہ میں (۵۷) اشعار ہیں۔ نمونہ صرف چند اشعار درج کئے جاتے ہیں۔  
 جودن پھرتے ہیں تو سماں پیدا ہو ہی جاتا۔  
 شب غم لاکھ طوفانی ہو ترکا ہو ہی جاتا ہے  
 چمن میں پھولنے پھلنے کی نوبت آ ہی جاتی ہے  
 دکن میں بارور نخل تمسٹا ہو ہی جاتا ہے  
 رہا جو شہ کی نظروں میں ترقی اسکو لازم ملا دریا سے جو قطرہ وہ دریا ہو ہی جاتا ہے

یہ مدح شاہ وہ مضمون ہے جس کے نظم کرنے کا ارادہ میں نہیں کرتا، ارادہ ہو ہی جاتا ہے۔

## مصاحبت سے فسرازی

استادی کے اعزاز کے ساتھ غنایات شاہی کے دربار ہو گئے۔ بھٹوڑے ہی دیوں میں ایک علیحدہ فرمان کے ذریعہ مصاحبت کے اعزاز سے بھی نوازا گیا۔ اس تعلق سے جو فرمان ہوا اور مستندی صرفہ خاص سے جو احکام جاری ہوئے وہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ بعد میں یہ ماہوار بڑھا کر ایک ہزار کر دی گئی جو تا حیات جاری رہی۔

۲۔ کارنامہ جلیل۔ ص ۱۲۷

شوال المکرم ۱۳۲۷ھ

حویلی قدیم

افسر الملک بہادر

مرنخا میں داغ صاحب مرحوم کی جگہ جلیل حسن صاحب جلیل کو میں نے مقرر کیا ہے۔ یہ بھی مانند داغ صاحب کے میرے مصاحبین میں سمجھے جائیں گے۔ آئندہ اگر کسی امر میں میرے حکم کے لئے مصاحبین کی فہرست جو تم پیش کر دو گے اس میں جلیل صاحب کا نام رہے تاکہ ان کی نسبت بھی مانند دوسرے مصاحبین کے کسی تقریب میں شریک ہونے یا نہ ہونے کے واسطے حکم صادر ہو سکے۔

شرعہ دستخط حضرت علیہ السلام  
مراسلہ نشان ۱۶ محکمہ معتمدی مرنخا پیشی خداوندی واقع ۲۲ ذیقعدہ ۱۳۲۷ھ  
منجانب نواب بہور الملک بہادر معتمد  
بإطلاع جلیل حسن صاحب جلیل  
اجرا پانچو بہار بنام جلیل حسن صاحب

یہ سلسلہ اجرائی ثانی مراسلہ محکمہ ہذا نشان ۲۶ م ۱۶ شوال ۱۳۲۷ھ بمقدمہ صدر ترقیم ہے کہ پیشگاہ سے بذریعہ فرمان مبارک مترشادہ ۱۶ شوال المکرم ۱۳۲۷ھ آپ افتخار مصاحبت سے سرفراز فرمائے گئے۔

شرعہ دستخط معتمد علیہ السلام

مصاحب ہو جانے کے بعد دربار کی حاضری لازمی ہوگئی۔ مختلف امور پر گفتگو کے بعد جس دن کچھ اشعار موزوں کر لیتے سردار مصاحبین کی موجودگی میں شعر پڑھتے اور فی البدیہہ اصلاح لیتے۔ لیادہ تر فی البدیہہ مشورہ سخن ہی ہوتا۔ مثال کے طور پر کسی

۱۔ حیدر آباد کا مشہور قدیم محلہ جو آصفیہ ہی سلاطین کی قیام گاہ تھی جب انھوں نے اس حویلی کی سکونت ترک کردی تو اس کا نام قدیم حویلی پڑ گیا۔ اسکے اندر ایک عالیشان ٹاڈ بھی تھا جس پر آصفیہ پرچم لہراتا تھا۔ اب اس حویلی کو عوامی اغراض کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

۲۔ کارنامہ جلیل ص ۱۳۲

۳۔ کارنامہ جلیل ص ۱۳۲

شہزادے کی تقریب کے موقع پر ایک قطعہ شاہ آصف نے موزوں کیا تھا جس کا دوسرا شعر یہ تھا۔

خوش رہے اولاد میری اور میرے خیر خواہ جان و دل سے ہے دُعا آصف کی یہ لیلِ بہار  
اس شعر کے پہلے مصرع میں اولاد کے ساتھ خیر خواہ کی نسبت بعید تھی چنانچہ استاد شاہ  
نے دوسرا لفظ تجویز کیا اور شعری صورت یوں ہو گئی۔

خوش رہے اولاد میری اور میری ذریات

جان و دل سے ہے دُعا آصف کی یہ لیلِ بہار

خیر خواہ کی جگہ ذریات کا لفظ ہر لحاظ سے بر محل و موزوں ہے۔

## دیوان اول "تاج سخن" کی اشاعت

۱۳۲۸ھ میں استاد جلیل کا پہلا دیوان "تاج سخن" شائع ہوا۔ اس دیوان

میں وہ تمام غزلیں ہیں جو زمانہِ رامپور سے لیکر حیدرآباد میں اس دیوان کی اشاعت تک  
کہی گئی تھیں۔ بیشتر کلام امیر مینائی کے زمانہ حیات کا ہے۔ یہ دیوان میر محبوب علیخان  
آصف کے دور میں اس وقت شائع ہوا جب جلیل مرزا داغ کی جگہ استاد شاہ ہو چکے تھے

دوسرے ہی سال یعنی ۱۳۲۸ھ میں مدحیہ سوربا عیوں کا مجموعہ گلِ صد برگ

کے نام سے شائع ہوا۔ یہ جلیل کی ایک سوربا عیوں کا مجموعہ تھا جو تمام کی تمام شاہ آصف  
کی مدح میں تھیں۔

## شاہ آصف کی رحلت

میر محبوب علی خان آصفیہ سادس نے سہر رمضان ۱۳۲۹ھ میں ۱۹۱۱ء کو وفات پائی

اس طرح جلیل کا یہ دور جو ۱۳۲۸ھ میں استاد شاہ کی حیثیت سے شروع ہوا تھا ۱۳۲۹ھ

کو ختم ہوتا ہے۔ یہ دور جلیل کی حیات کا ایک اہم دور ہے جس میں کشمکش روزگار  
اور طویل امیدواری کے بعد استاد السلطان ہوئے اور جو عزت و فراغت نصیب ہوئی  
وہ بہت کم شاعروں کے حصہ میں آتی ہے۔

نے اس بزم شادی میں بطور گھماے عقیدت جو سپہا پڑھا اور پیش کیا وہ اس لحاظ سے قابل ذکر ہے کہ جس زمین کو ذوق و غالب نے اپنی طبع رسا سے روند ڈالا تھا اسی زمین کو جلیل نے بھی اپنی فیکر کی جولا نگاہ بنایا۔

## دربار تاجپوشی ملک معظم میں شرکت

سلاطین دکن کا یہ معمول تھا کہ حیدر آباد سے باہر سفر کرتے تو اسٹاف میں مصاحبین خاص کو ساتھ رکھتے۔ چنانچہ آصف سابع کی ہمراہی میں جلیل نے خواجہ بندہ نواز کے عرس میں شرکت کی اور اس موقع پر اس بارگاہ میں ایک سلام بھی گزارا جس کا مطلع یہ تھا۔

اسلام اے قطب قطاب دکن : السلام اے نضر اوتا در زمین  
اسی سال ۱۹۱۱ء میں ملک معظم جارج پنجم کے جشن تاجپوشی کا دربار دہلی میں منعقد ہوا۔ اس وقت شاہ عثمان کے اسٹاف کے ہمراہ جلیل بھی تھے۔ اس موقع پر انھوں نے ”دربار دربار“ کے نام سے جو قصیدہ کہا اس کی بڑی شہرت ہوئی۔  
قصیدہ کا مطلع یہ تھا:

غفلہ آج ہے دربار کا دنیا بھر میں یہی چہر چاہے زمین پر یہی سودا سرنی  
جشن تاجپوشی میں شرکت کے اعزاز میں نظام گورنمنٹ کی جانب سے استاد  
جلیل کو بھی ایک تمغہ عطا ہوا۔ اس کے ساتھ جو مراسلہ جاری ہوا اس کی عبارت یہ تھی:  
ایچ۔ ای۔ ایچ دی نظام اے۔ ڈی۔ سی آفس

۲۲ فروری ۱۹۱۲ء

مولوی جلیل حسن صاحب جلیل

ایچ۔ دی۔ ایچ دی نظام جی۔ سی۔ یس آئی کے حکم سے میں اس

---

لے یہ سپہا غالب اور ذوق کے سپروں کی طرح شائع ہو کر منظر عام پر نہیں آیا اور آج تک اہل ذوق کی نظروں سے پوشیدہ رہا۔ جو مقبولیت اسے ملنا چاہیے تھی نہ ملی۔

## شاہ عثمان کی تخت نشینی

شاہ آصف کی رحلت کے ساتھ ہی میر عثمان علی خاں عثمان نے آصف ساج کی حیثیت سے ان کی جگہ لی۔ تخت نشینی کی رسم چو محلہ میں پڑے اہتمام کے آذا ہوئی۔ بعد ازاں تخت نشینی کی تقریب ہی میں دربار عام منعقد ہوا جس میں اکابرین سلطنت کے ساتھ جلیل بھی شریک تھے۔ اگرچہ اب تک کوئی فرمان ان کے تعلق سے جاری نہیں ہوا تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جس وقت جلیل نے نذر پیش کی تو سامنا ہونے پر پوچھا۔ جلیل صاحب تمہیں ہو۔ عرض کیا گیا سرکار ندوی ہی جلیل ہے۔ جس قدر بازنحی سے متعلق جلیل نے قطعہ تاریخ اور مدحیہ قصیدہ تیار کر رکھا تھا بارگاہ خسروی میں گزارنا۔ اس قطعہ تاریخ کے ساتھ ایک مدحیہ قصیدہ بھی پیش کیا گیا جو اس تقریب کے لئے خاص طور پر سوزوں کیا گیا تھا۔ انھیں شرف قبولیت بخشے ہوئے حکم ہوا کل کنگ کو صلی پر حاضر ہو۔ دوسرے دن جلیل نے حاضر ہو کر تاج سخن اور تذکیر و تائیت کی کتاب ملاحظہ میں گزرائی۔ شاہ عثمان کچھ دیر تک ملاحظہ فرماتے رہے پھر ارشاد ہوا:

”میں نے عبدالرحیم معتد صر فخاص کو حکم دیا تھا کہ حکما کی نہرست پیش کی جائے۔ حکما کے ساتھ تم کو بھی شریک کر دیا گیا

مالانکہ شاعر اور حکیم میں بڑا فرق ہے۔ تم والد مرحوم کے وقت جس طرح حاضر دربار ہوتے تھے اور مصاحبین میں شامل تھے اسی طرح برقرار رکھے جاتے ہو۔“ لے

اس حکم کے بعد سے کنگ کو صلی پر دیگر مصاحبوں کے ساتھ حاضر ہونے لگی۔ اس درمیان انھیں اپنے شاعرانہ کمالات کے اظہار کے جو بھی مواقع ملے ان سے فائدہ اٹھا کر جلیل نے شاہ کے دل میں جگہ بنالی۔

کچھ عرصہ بعد جب شاہ دکن نو شاہ بنے اور کتھرائی کا دربار سمجایا گیا تو جلیل

مراسلہ کے ہمراہ ایک کارونیشن ٹرل اس امپیریل دربار کے  
 سلسلے میں سرل خدمت کر رہا ہوں جس میں بتاریخ ۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ء  
 آپ نے شرکت کا اعزاز حاصل کیا تھا۔

آپ کا  
 افسر الملک لفظت کرنل اے۔ ڈی سی

## دلی سے براہ مانیکپور واپسی

جشن تاجپوشی کے اختتام پر جلیل کو دلی میں وطن کی یاد آئی۔ مانیکپور چھوٹے  
 ہوتے ۲۴ سال ہو چکے تھے۔ چنانچہ آپ نے اعلیٰحضرت سے اجازت لی اور مانیکپور  
 چلے گئے۔ جلیل نے روزگار کی تلاش میں جب وطن چھوڑا تھا تب وہ ایک عام  
 آدمی تھے۔ اب جو استاد شاہ دکن ہو کر لوٹے تو اہل خاندان و احباب کیا، سارا مانیکپور  
 چشم براہ تھا۔ اہل مانیکپور نے بڑے شاندار طریقہ پر استقبال کیا۔ زمینداروں کے  
 معزز طبقہ نے ان سے ملنے میں بڑا اشتیاق دکھایا نشستوں، محفلوں اور مشاعروں کا سلسلہ  
 ابھی جاری تھا اور صحبتوں ملاقاتوں سے جی نہیں بھرا تھا کہ ایک ہفتہ کے اندر ہی ذریعہ  
 ٹیلیگرام آپ کی طلبی ہوئی۔

دلی سے واپسی پر حضور نظام اورنگ آباد میں مقیم تھے۔ تعمیل حکم میں جلیل مانیکپور  
 سے فوراً اورنگ آباد پہنچے۔ اورنگ آباد میں شاہ عثمان اور اسٹاف شاہی کا قیام شاہی  
 باغ ”حمایت باغ“ میں تھا۔ اس پر فضا ماحول سے متاثر ہو کر جلیل نے حمایت باغ کی  
 تعریف میں ایک نظم مسلسل غزل کی صورت میں سوزوں کی موقع، محل، اور خیالات کی  
 نزاکت و لطافت کے اعتبار سے یہ نظم بہت پسند کی گئی اور شاہی دربار میں صاحبین  
 کے درمیان اس کا بڑا چرچا رہا۔ چند شعر نمونہ درج ہیں۔

نادک ناز جو گزرا طرب دل ہو کر  
آرزو دل کی پھڑسنے لگی بسمل ہو کر

اس غزل نے پر پرواز کا کام کیا۔ مذاقِ سخن رنگ لایا۔ دوسرے ہی دن شاہ شمس  
نے ایک پسندیدہ مصرع کو پیش نظر رکھ کر طبع آزمائی کی۔ یہ آصف صاحب کی پہلی غزل تھی۔  
اس کی تصدیق مہاراجہ بہادر شاد کے اس بیان سے ہوتی ہے جو انھوں نے اسی زمانے  
میں تحریر کیا تھا۔

”حال کے سفرِ بھٹی میں جس کو تقریباً پانچ ماہ ہوتے ہیں اعظمیہ  
نے پہلے پہل ناسخ کی غزل سے ابتداء کی،“

[روزنامہ صبح دکن ۱۳۳۱ھ]

”سخن گوئی کا یہ سلسلہ جو چل نکلا تو پھر چلتا ہی رہا اور آخری دم تک زندگی کے سفر میں سایہ  
کی طرح ساتھ رہا۔

اسی سال درگاہِ خواجہ اجیری کی زیارت کی غرض سے اعظمیہ نے مگرگڑ  
کا سفر کیا تو اسٹان میں استاد کو بھی ساتھ رکھا۔ شاہ کی شاعری کا یہ ابتدائی دغدغہ  
تھا اس لئے بارہا ایسا ہوتا کہ دورانِ سفر میں جلیل کو اپنے خاص کیلون میں طلب کے  
مشورہ سخن فرماتے رہے۔ اجیر شریف میں جلیل نے منقبت کے جو اشعار خواجہ اجیریؒ  
کی نذر کئے اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ آج بھی اس دہر پر موقع بہ موقع دہرائی

لے اصلاح شدہ پہلی غزل کے چند اشعار :

یہ اگر آئینہ صورتِ حبا ناں ہوتا	لاکھ میں ایک ہمارا دلِ دیراں ہوتا
ہوتے دیتے نہ کبھی عشق کی ہم پہچہ ہدی	کاش قالو میں ہمارا دلِ ناداں ہوتا
خیر گزری کہ ہوئی صبح کی آمدِ درہ	فصلہ آج ہمارا شبِ ہجران ہوتا
آگ ہم بھی دلِ گردوں میں لگاتے عثمان	نالہ دل جو ہمارا شرِ افسان ہوتا

## دیوان دوم جان سخن کی اشاعت

استاد جلیل کا پہلا دیوان تاج سخن ۳۲۸ م ۹۱۰ء میں نواب میر محبوب علی خاں آصف سادس کے عہد میں اس وقت شائع ہوا تھا جب وہ استاد شاہ بن چکے تھے۔ اس کے چھ سال کے اندر ہی اتنا کلام جمع ہو گیا کہ دوسرے دیوان کی اشاعت ممکن ہو گئی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ شاہ عثمان کے معاصمین میں داخل ہو جانے کے بعد جب دربار میں حاضری لازمی ہو گئی تو اس دور میں بالالست تمام روزانہ ایک تازہ غزل گزرائی جاتی تھی۔ یہ غزلیں اکثر و بیشتر اعلیٰ حضرت کی مجوزہ طرح پر ہوتیں۔ بعض اوقات طرح کا تعین دربار میں ہی ہوتا اور کبھی فرمان کے ذریعہ تجویز فرمائی جاتی جیسا کہ ذیل کی تحریرات اور بالمشافہ ارشاد ہالونڈی سے ظاہر ہوتا ہے۔

مبارک منشن

حافظ جلیل حسن صاحب جلیل

۱۰ اس صبحے کو کاٹ کے جھج بنائیں گے<sup>۲</sup>

یہ ایک طرح کا مصرع ہے جو ایک زمانے سے گوش زد چلا آتا ہے

۱۔ مشہور منقبت کے چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔

یہ وہی در ہے جہاں لطفِ جبیں سائی ہے	آج قسمتِ درخواہ پہ مجھ لائی ہے
جاتے تھے کہ یہ مدت کا تمنائی ہے	تھا بہت دور مگر کھینچ بلایا محب کو
ہنیت کیلئے جنت سے ہوا آئی ہے	میں نے اجیر میں جس وقت قدم کھا ہے
خود تماشا ہے جو روضے کا تماشا ہے	محور کرتی ہے انسان کو تجلی اس کی
جن سے قدموں سے لگی خلق خدا آئی ہے	شاہ آصف کا بدولت ہوئی دولت یہ نصیب
میرے حضور محب کو سکندر بنائیں گے	۲۔ جو غزل گزرائی گئی اس کا مطلع یہ تھا
	آثار کہہ رہے ہیں یہ طالع کے اے جلیل

## حمایت باغ

باغ جنت کا سماں دیکھا حمایت باغ میں غنچہ دل کھیل گیا اپنا حمایت باغ میں  
 چھپے سُنکر غنادل کے ہوا ایسا سرور طائر غم ہو گیا غنقا حمایت باغ میں  
 پھل محبت کے خوشی کے پھول راحت کے شجر لے رہے قدرت کہ ہے کیا کیا حمایت باغ میں  
 شاہ آصفجاہ ساج جلوہ آرا ہیں جو آج ہر کلی ہے دیدہ موسیٰ حمایت باغ میں  
 ہو نہیں سکتا کہ آجائے غلش کی بو کہیں ہو گیا ہے پھول ہر کاٹا حمایت باغ میں  
 آہنیں سکتی خیزاں اکسین کہ ہے بیٹھا ہوا طالع بیدار کا پہرا حمایت باغ میں

## بمبئی کا سفر۔ شاہ عثمان کی پہلی غزل

۱۳۳۲ھ میں شاہ نے بمبئی کا سفر کیا۔ استاد جلیل ہمرکاب تھے شاہ عثمان  
 کو شاعری کا نظری ذوق تھا۔ اساتذہ سخن کا فارسی اور اردو کلام اکثر زیر مطالعہ رہتا  
 لیکن اس دلچسپی کے باوجود تخت نشینی سے پہلے آعلیٰ حضرت نے شعر موزوں کئے ہوں ایسے  
 شواہد نہیں ملتے۔ میں نے والد مرحوم سے سنا کہ کاروبار سلطنت سنبھالنے کے بعد ایک عرصہ  
 تک شاہ نے شعر کہنے کی طرف توجہ نہیں کی البتہ دربار میں شعر و شاعری کا تذکرہ ضرور  
 رہتا تھا۔ بمبئی کے قیام کے دوران غزلوں کا ایک گلدستہ ملاحظہ فرمایا اور گلدستہ  
 کی طرح میں استاد کو اسی وقت غزل کہنے کا حکم دیا۔ جلیل اپنے خیمہ میں آئے۔ وقت  
 کم تھا، خیمہ میں آتے ہی مسودہ لکھنے کے بجائے غزل صاف خط میں لکھنی شروع کی۔ دیر  
 برافات ہونے سے پہلے ہی غزل گزاران دی۔ اس غزل کا مطلع یہ تھا،

لے اتیر مینائی نے واجد علی شاہ کے تیسرے باغ پر بھی ایسی ہی سخن آرائی کی تھی جس کے چند شعر یہ تھے:

کسے چمکے چاند سے زُخار تیسرے باغ میں چاندنی ہے سایہ دیوار تیسرے باغ میں  
 فی الحقیقت یہ بھی کم گلزار جنت سے نہیں حوریں پھرتی ہیں سربازار تیسرے باغ میں  
 زیر شاخ گل اگر سبزہ کبھی سونے لگا شور بلبل نے کیا بیدار تیسرے باغ میں

مگر نہیں چاہتا ہوں تم اس پر طبع آزمائی کرو اور بروز جمعہ غزل  
کہہ کر اپنے ہمراہ لیتے آؤ۔ [مورخہ ۱۲ شعبان ۱۳۳۲ھ]

مبارک منٹن

جلیل حسن صاحب جلیل لکھنوی

چند طرح کے مصرع تجویز کئے گئے ہیں۔ ان پر یکے بعد دیگرے  
طبع آزمائی ہو تو مناسب ہے۔

ع۔ آج کس کا تہہ شمشیر گلو آتا ہے

ع۔ نقل اُمید میں ثمر آئے

ع۔ لرزاں ہے برق بھی دلِ مضطر کے سامنے

[مورخہ ۱۲ شوال المکرم ۱۳۳۲ھ]

ایک تقریب کے موقع پر اعلیٰ حضرت نے ایک مصرع ارشاد فرمایا

ع۔ بُل ہے ابرو پہ لب پہ گالی ہے

آپ کی طرف دیکھ کر مصرع لگانے کے لئے کہا۔ جلیل نے برجستہ  
گمرہ لگائی۔

بُل ہے ابرو پہ لب پہ گالی ہے

جو آدا ہے تری زبانی ہے

دوسرے ہی دن غزل کہنے گزرائی گئی۔

بعض اوقات ایک ہی طرح میں غزل کی مکرر فرمائشیں ہوتیں جو یکے بعد دیگرے

دو غزل سے غزل کی صورت میں پیش کی جاتیں۔ استاد جلیل کے کلام کا یہ اشتیاق اس حد تک

بڑھ گیا تھا کہ باوجود روزانہ عافری کے درمیان ہی میں غزل کی طلبی کا حکم آجاتا۔

۱۔ اس غزل کے مقطع میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

کیوں نہ اشعار ہوں بلند جلیس

شاہ نے یہ زمیں نکالی ہے

جلیل حسن صاحب جلیل لکھنوی

اگر وہ غزل جو کہ ہو رہی ہے تیار ہو چکی ہو تو میرے دیکھنے کے لئے بھجواؤ۔

مورخہ ۱۲ رجب المرجب ۱۳۳۳ھ

یہ تمام غزلیں جو بھجوائی جاتیں وہ حب الحکم ایک کتاب میں بصورت دیوان درج ہوتی تھیں۔ یہ بیاض مستقل طور پر اعلیٰ حضرت کے زیر مطالعہ رہتی وقتاً فوقتاً اس حکم کے ساتھ واپس ہوتی کہ تازہ غزلیں اس میں لکھ دی جائیں۔

جلیل صاحب

اپنی تازہ غزلیں کتاب میں لکھوا کر بروز پنجشنبہ بروز صبح ۱۰ بجے لیکر بذات خود حاضر رہنا۔ اسی روز میرے یہاں مفتی بریکفیٹ ہے۔

[ مورخہ ۲۵ رمضان ۱۳۳۳ھ ]

دیوان مکمل ہو جانے کے بعد جب اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی تو حسب ذیل استفسار ہوا۔

جلیل صاحب

جب تمہارا دیوان مکمل ہو چکا ہے تو پھر اس کے چھپوانے میں کیا دیر رہی ہے۔

[ مورخہ ۲۲ شعبان ۱۳۳۴ھ ]

بعد ازاں اس کے چھپوانے کے لئے مالی امداد بھی سرکار کی جانب سے منظور کی گئی۔ دیوان کا نام "جان سخن" خود شاہ نے تجویز فرمایا۔ اس طرح یہ دیوان پہلی مرتبہ ۱۹۳۴ء میں چھپا۔

لے اختر مینائی کے قطعہ تاریخ میں اس کا اشارہ یوں ملتا ہے۔

شاعر دل نے جو مزہ جان سخن سے پایا      بلبلوں نے وہ کہاں سیرِ حین سے پایا  
شانِ دیوان کی روشن ہے اسی سے اختر      نام یہ جان سخن شاہِ دکن سے پایا  
(۱۹۱۶ء)

جان سخن ۱۹۱۶ء ص ۲۲۲

## خطابِ فصاحتِ جنگِ بہادر

نواب میر محبوب علی خاں آصف سادس نے "جلیل القدر" کے لقب سے مفتخر فرمایا تھا۔ استاد السلطان کا لقب استاد شاہ ہونے کے بعد ہی سے وابستہ ہو چکا تھا۔ دو شاہانِ دکن کے استاد ہونے کے سبب ادب و صحافت میں اسی لقب کا استعمال عام تھا۔

میر ثمان علی خاں نے ۱۳۳۵ھ میں اپنی تقریب سالگرہ کے موقع پر نواب فصاحتِ جنگ بہادر کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔ ایک تحریر کے ذریعہ یوں اطلاع دی۔

فصاحتِ جنگ بہادر

میں نے اپنی سالگرہ کے موقع پر تم کو خطاب دیا ہے

(موجودہ ۲۷ جمادی الثانی ۱۳۳۵ھ)

اس سرفرازی پر نواب سرفزیدوں ملک بہادر صدر اعظم باب حکومت نے مبارکباد کا جو خط لکھا وہ حسبِ ذیل ہے:

شفیق محی نواب فصاحتِ جنگ بہادر دامِ مجد کم  
حضرت آقا دلی نعمت نے بہ و فور لوازشِ سلطانی بصلہ  
حسنِ خدمت آپ کو جنگی و بہادری کے خطابات سے  
جو سرفراز و متنازع فرمایا اس کے متعلق آپ کو دلی مبارکباد  
دینا ہوا۔ میری دعا ہے کہ آپ دیرگاہ رہیں۔ ملک کی  
خدمت میں مصروف اور مورد الطاف شاہی رہیں۔

آپ کا مخلص  
سرفزیدوں جنگ

## علالت اور مانیکور کا سفر

۱۳۳۸ھ میں جلیل حیدر آباد میں سخت علیل ہو گئے۔ حسب رائے معالجین آپ نے دو ماہ کی درخواست رخصت بارگاہ خسروی میں توسط منظم پیشی مبارک گزرائی۔ درخواست منظور ہوئی تو علاج و تبدیل آب و ہوا کی غرض سے مانیکور کا سفر اختیار کیا۔ ختم رخصت پر مکمل صحت نہ ہونے کے باعث معروضہ بھیج کر رخصت میں مزید توسیع کرائی۔ بعد ازاں کچھ عرصہ تک اعلمحضرت جلیل کی کوئی کیفیت نہیں ملی۔ تعلق خاطر پیدا ہوا اور ایک تحریر کے ذریعہ مزاج پر کئی فرمائی گئی۔

۱۹ رجب ۱۳۳۸ھ

کنگ کوٹھی لہ

استاد جلیل صاحب نصاحت جنگ

کئی روز سے معلوم نہیں ہوا کہ شکایت لاحقہ کا کیا حال ہے  
ایا اس میں آرام ہے یا قیسی ہی کیفیت ہے جیسی کہ یہاں  
روانگی سے قبل تھی۔ بہر حال جہاں تک ممکن ہو بلکہ آنا  
مناسب ہے کہ کئی غزلیں سلام اور قطعے وغیرہ اصلاح  
کے منتظر ہیں۔

مجھے اس کا بھی افسوس ہے کہ اس سال میری سالگرہ کے  
تقاریب میں سوء مزاجی سے شرکت نہیں ہو سکی اور اُمید

لہ۔ ”یہ دراصل میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کے ایک امیر کمال خاں کا بنگلہ تھا جو  
انگریزی کوٹھیل کے طرز پر شہر حیدر آباد کے باہر بجانب شمال تیار کیا گیا تھا۔ یہ بنگلہ بعد کو شاہی  
قبضہ میں آگیا اور آصفجاہ سادس نے اپنے بڑے صاحبزادے امیر عثمان علی خاں کے قیام کیلئے اس کو  
مخصص کیا تو انھیں اتنا پسند آیا کہ تخت نشین ہونے کے بعد بھی وہ اسی میں قیام پذیر رہے۔ اگرچہ یہ کوئی  
عایشان محل نہیں ہے تاہم بادشاہ وقت کے قیام گاہ کی بناء پر قصر کنگ کوٹھی مبارک کہلاتا ہے۔“  
(ڈاکٹر زور۔ فرخندہ بنیاد حیدر آباد، ۱۳۷۲ھ ۱۹۵۲ء)

ہے کہ اس وقت طبیعت کو سکون حاصل ہوگا اور  
مرض رو بہ ازالہ۔

شرعاً مستطابہ

اس مکتوب شاہی کے پہنچنے کے بعد ہی جلیل حیدر آباد واپس آ گئے لیکن علالت کا  
سلسلہ جاری رہا۔ چنانچہ اطباء نے شاہی کے ذریعہ علاج کے لئے حکم ہوا۔ اس خصوص  
میں طبیب شاہی نے حسب ہدایت حسب ذیل تحریر بھیجی۔

۲۸ ذی الحجہ ۱۳۳۹ھ

خدمت جناب نواب فصاحت جنگ بہادر  
حسب فرمان اقدس و اعلیٰ کل صبح ۹ بجے حاضر ہوں گا حکیم  
نواب حاذق جنگ بہادر اور حکیم امتیاز الدین صاحب  
بھی تشریف لائیں گے۔ ارشاد خداوندی شرف صدور  
لایا ہے کہ بعد سماعت کیفیت مزاج نسخہ تجویز کیا جائے  
خیر طلب حکمت جنگ

## دربار کی حاضری سے سبکدوشی

ملالت سے قبل تک استاد کے لئے روزانہ حاضری دربار کا لازم تھا۔ اب  
یہ ہوا کہ صحت یاب ہو جانے کے باوجود روزانہ حاضری کے بجائے حسب ضرورت  
طلب کیا جانے لگا۔ مثلاً اس خصوص میں حسب ذیل نوعیت کے فرامین جاری ہوا  
کرتے تھے۔

نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

ارشاد خداوندی شرف صدور لایا ہے کہ کل بروز پنجشنبہ  
آپ دلیٹھی پر حاضر نہ ہوں بلکہ جمعہ کے روز حاضری کا حکم  
حسب الحکم اظہر جنگ

۱۳۳۷ھ

پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ نشان (۱۲) مورخہ یکم اگست  
ہزار ایل ہائی س آف ویلز کے فائز حیدر آباد ہونے کے موقع  
پر حکم اقدس شرف صدور لایا ہے کہ آپ براہ مہربانی تاریخ  
۲۵ جنوری ۱۹۲۲ء روز چار شنبہ ۱۴ پر بجے ریلوے اسٹیشن  
تشریف لائیں۔

شرح دستخط نظامت جنگ صدر المہام سیاسی

[ڈرائی: سفید یونیفارم]

بعد ازالہ جب رخصت کی وجہ سے آپ کو چلنے پھرنے میں تکلف ہونے لگا اور  
معذوری بھی زیادہ بڑھ گئی تو مکمل طور پر حاضری سے سبکدوش کر دیا گیا۔ ہدایت دی گئی کہ  
صرف سالگرہ مبارک اور عیدیں کے درباروں میں شرکت ہو اور لطیف احمد اختر مینا  
کو محکمہ دیا گیا کہ وہ اپنے ہمراہ لائیں اور لے جائیں۔ چند سال تک تو یہی صورت حال رہی۔  
پھر بہ خیال معذوری شرکت تقاریب بھی غیر ضروری قرار دی گئی۔ فرمان ہوا  
اوستاد جلیل

معذوری کی وجہ سے تقاریب کی شرکت ضروری نہیں ہے۔  
اہم مواقع وہ اور ہیں۔ لہذا آرام لیا جائے۔

آنکھ کا آپریشن

پیرانہ سالی کے باعث جلیل کی داہنی آنکھ میں موتیا بند ہو گیا تھا۔ حیدر آباد میں  
اس وقت کوئی معقول انتظام نہ تھا اس لئے ایک معروضے کے ذریعہ باہر جانے کی اجازت  
طلب کی۔ ایک ماہ کی رخصت منظور ہوئی۔ پہلے بنگلور میں آپریشن کروانے کا ارادہ تھا مگر  
وہاں کے سرد موسم کے پیش نظر بعد میں رائے تبدیل ہو گئی اور بمبئی میں آپریشن کروانا طے پایا۔  
اختریار جنگ اور فرزند اکبر صدیقی احمد آپ کے ہمراہ تھے۔ ڈاکٹر باناجی کے ہسپتال میں آپریشن  
ہوا۔ بعد صحت حیدر آباد واپس آئے۔

چند سال بعد آپ کی دوسری آنکھ میں بھی پانی اتر آیا اور آپریشن کی ضرورت

لاحتی ہوئی۔ اسی زمانے میں سید عبدالعزیز صاحب وزیر عدالت و امور مذہبی نے ڈاکٹر متھراکس  
ماہر علاج چشم کو پنجاب سے حیدرآباد بلوایا تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے استاد  
جلیل نے سرکار سے اجازت طلب کی۔ جناب میں جو فرمان ہوا اس کی اطلاع یوں جناب  
جلیل کو دی گئی۔

جلیل صاحب

میں نے انتظام کر دیا ہے کہ چشم کا علاج استاد کے گھر ہی میں  
ہو گا تاکہ سہولت ہو بعرض کیمپ کے جس کے مصارف کا بار نہ  
پڑے گا۔ اطلاع لکھا

۱۳ ذیقعدہ ۱۳۶۰ھ

آنکھ کے آپریشن اور صحت یابی تک سرکاری نگرانی قائم رہی۔

دور و شاہانہ بخانہ جلیل

آصف سابع بجز امرائے سلطنت و اعیان شاہی بالعموم کسی کے یہاں نہیں جاتے  
تھے۔ یہ اعزاز بہت کم کسی کے حصے میں آتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ استاد جلیل سے شاہ کو  
جو عقیدت تھی وہ اس امر کی محرک ہوئی اور ایک دن اچانک یہ اطلاع ملی۔

استاد جلیل

آئندہ جمعہ کو شام کو ساڑھے پانچ بجے مکان (جلیل منزل)  
آ رہا ہوں دیکھا جی کو کہہ کر گئے چائے پانی کا دیا جائے۔

۱۹ ربیع الثانی ۱۳۶۱ھ

تاریخ مقررہ پر سردار شاہانہ بیہیت کو قوال بلدہ نواب رحمت یار جنگ اور  
چیف آرکیٹک نواب زین یار جنگ جلیل منزل پر رونق افروز ہوئی۔ تمام افراد خاندان نے  
استقبالی شاہانہ کی عزت حاصل کی تدریس پیش کی گئیں۔ بعد ازاں استاد نے خیر مقدم کا قطعہ

لے حیدرآباد کا ممتاز ہوٹل۔

بخانہ چوں شہ عثمان قمر رکاب رسید  
عروج ذرّہ احقر بہ آفتاب رسید  
فلک بکن در انجمن نثار بر قد مش  
زین بنیاز کہ شیدائے بو تراب رسید

اس موقع پر جلیل نے جو معروفہ ادب گزارا اس میں اس آرد کا اظہار کیا گیا تھا کہ —  
”سرکار کو سلطان الشعرا کے لقب سے مخاطب کرنے کی اجازت فدوی کو عطا فرمائی جائے۔“  
جائے نوشی کے بعد مراجعت فرمائی ہوئی۔ دوسرے ہی دن استاد کے مکان  
تشریف لے جانے اور لقب سلطان الشعرا کی پیشگی سے تعلق سے حسب ذیل فرمان رفتا  
صبح دکن میں شائع ہوا۔

جائے خوری در جلیل منزل

این امر برائے مانا ممکن بود کہ ہر مقامات دیگر رفتہ این جا  
مانہ آمدے۔ و اطراف دیگر حقوق استاد بر تلامذہ بسیار بود  
نظر بر آں این جا آمدہ ما خیلے مخطوط شدیم و این بار اول بود۔  
دیگر ہر چہ ارغواں استاد ما پیش ما آوردہ است چہ  
می گویم کہ ما چہ کنیم بجز انیکہ آں را قبول کنیم و بطرف دیگر  
عرصہ طویل گزشتہ است کہ ما استاد را ہر چہ لقب دادیم آں  
راز سر بستہ نیست بلکہ عالم آشکارا یعنی امام الفن این جا معنی  
امام ماہر یا عالم فن شاعری و عروض است ۳

۱۔ روزنامہ صبح دکن ۲۴ ربیع الثانی ۱۳۶۱ھ

۲۔ حضور نظام نے جلیل مرحوم کی شعری اصلاحوں کی بڑی قدر افزائی فرمائی اور انھیں فصاحت  
جلیل اور امام الفن کا لقب عطا کیا: (علی حیدر طایطیائی، اصلاحات غالب، ص ۲۲)

۳۔ روزنامہ صبح دکن۔ ۲۴ ربیع الثانی ۱۳۶۱ھ

## لقب سلطان الشعراء

لقب سلطان الشعراء کی پیشکش اگرچہ شخصی تھی لیکن اسے عوامی حیثیت حاصل ہو گئی گویا خاص وعام نے اس پر مہر تصدیق ثبت کی گویا یہ لقب استاد جلیل کی طرف سے ہیں اہل دکن کی طرف سے پیش کیا گیا نیم سرکاری سطح پر سربراہ آوردہ اشخاص پر مشتمل ایک انتظامی کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اس کمیٹی کے اراکین حیدر آباد کے معززین لواب ڈدرت نواز جنگ بہادر لواب تراب یار جنگ، لواب زین یار جنگ، لواب شہید یار جنگ، ڈاکٹر می الدین قادری زور اور علی الدین احمد ناظم امور مذہبی تھے۔ جلسہ کے داعی چونکہ خود جلیل تھے اس لئے انھیں کی جانب سے رقعے امراد اراکین باب حکومت جاگیردار، مشائخ اور نامور شعراء دکن کو جاری کئے گئے جن کی مجموعی تعداد پانچ سو تھی۔ رقعہ کا مضمون یہ تھا۔

جلسہ اعلان لقب سلطان الشعراء یہ عظیم الشان علم سلطان دکن رحمہ اللہ  
یہ پر شوکت جلسہ بتاریخ یکم امرداد ۱۳۵۱ھ یوم شنبہ ٹاؤن ہال  
باغ عامہ میں پانچ بجے شام کو ہوگا۔ اور اس کے ساتھ عھرا نہ  
بھی ترتیب دیا جائے گا۔ میں آپ سے بعد خلوص شرکت کا  
متمنی ہوں۔ الداعی

نوٹ: یاس درباری ریگا۔ فصاحت جنگ جلیل

اس جلسہ میں نہ صرف خود شاہ عثمان نے بہ نفس نفیس شرکت کی بلکہ شاہ کے ہمراہ ولیمہ دولت آصفیہ شہزادہ والا شان لواب اعظم جاہ بہادر و شہزادہ لواب معظم جاہ بہادر شیع اور دیگر صاحبزادگان بھی تھے۔

اس موقع پر لقب سلطان الشعراء کی پیشکش سرکاری سطح پر جلسہ عام کی صورت میں بڑے اہتمام کے ساتھ ٹاؤن ہال میں ہوئی۔ استاد جلیل نے ایڈریس پیش کیا جسے فرزند اکبر مدنی احمد اختر نے جلسہ میں پڑھ کر سنایا۔ سپاسنامہ میں اعلیٰ حضرت کا استقبال حسب ذیل قطع سے کیا گیا تھا۔

بارک اللہ جلوه فرما گشت سلطانِ دکن صد ہزاراں جاں ما قریاں ایں حیاں دکن  
نقش می بنیم سر پر لوح دل ایں مصرعے شاہِ عثمان آصف سابع سلیمانِ دکن  
ایڈریس کا جواب خود اعلیٰ حضرت نے ایک لکھی ہوئی تقریر کے ذریعہ دیا اور پیش کئے ہوئے  
لقب ”سلطان الشعراء“ کو شرف قبولیت بخشا۔

## مشاعرہ بصدارت شہزادہ شجاع

لقب سلطان الشعراء کے سلسلے میں ایک مشاعرہ ۱۲۸۵ھ بمطابق ۱۸۶۸ء کو منعقد  
کیا گیا۔ انتظامی کمیٹی کے اراکین نصاحت جنگ جلیلی۔ تراب یار جنگ بہادر سعید۔ نواب  
ہنیاء یار جنگ اور نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز تھے شعرا کی طبع آزمائی کے لئے استاد  
جلیلی نے دو مصرع طرح ایک اردو اور ایک فارسی تجویز کئے تھے۔

فارسی۔ سلطان دکن آمدہ سلطان شعرا

اردو۔ زمین شعر بھی زیرِ نگین شاہِ عثمان ہے

مشاعرہ باغ عامہ کے نمائش ہال میں بڑے پیمانے پر ہوا۔ حسب فرمانِ خسروی  
صدارت شہزادہ نواب معظم جاہ بہادر شجاع نے کی۔ اعلیٰ حضرت نے اپنی طرحی غزلیں مشاعرہ  
کے لئے بھجوا دی تھیں۔ اس مشاعرہ میں حیدر آباد کے ممتاز شعرا کے علاوہ عمائدین  
سلطنت اور ارباب شعر و ادب کی ایک بڑی تعداد شریک تھی۔ مشاعرہ کا آغاز شاہ عثمان  
کی طرح غزل سے ہوا جس کا مقطع یہ تھا۔

مشیتِ ظل نہیں سکتی جو ہوتا ہے وہی ہوگا

دکن کا میر ہے اے عثمان خدا خود ہی نگہبان

شعرائے شام مشاعرہ اور شہزادہ شجاع کی غزل کے بعد آخر میں استاد جلیلی کی غزل  
عابد علی سعید شہیدی خلف نواب شہید یار جنگ نے پڑھ کر سنائی۔ جلیلی کی طرح غزل کا  
مقطع مدحیہ تھا۔

جلیلی الطاف شاہانہ کی ہے تفسیر یہ مصرع

مقدر پر مجھے نازش، مقدر مجھ پہ نازاں ہے

لقب سلطان الشعراء کی قبولیت کے بعد ایک اجتماع عام جلسہ شکر کی صورت میں ہوا۔ اس جلسہ کے صدر اقبالیہ لواب حسن یار جنگ بہادر تھے۔ مدارت راجہ دھرم کرن بہادر آصفیہ نے فرمائی جس میں شاہ عثمان کو ان کی شعری و ادبی خدمات پر خراج تحسین پیش کیا گیا۔

اسی سلسلہ میں ایک اور جلسہ عام جلسہ تہنیت کے نام سے ۲۴ مئی ۱۹۳۲ء کو دہلی میں منعقد ہوا۔ مولانا حسن نظامی نے قرار داد پیش کی۔ لواب سائل دہلوی نے تائید کی۔ لالہ امیر چند کھنہ نے مزید تائید کی۔ قرار داد تبریک تہنیت یہ تھی:

”اُردو مجلس دہلی کا یہ جلسہ دہلی کے ہندو اور مسلمان ادیبوں اور شاعروں کی طرف سے اعلیٰ حضرت حضور نظام کی خدمت میں لقب سلطان الشعراء کی تہنیت پیش کرتا ہے جو ان کی خدمت میں ان کے استاد امام الفن حضرت جلیل نے پیش کیا۔“

## علامت اور وفات

جلیل کے آخری ایام علامت میں گزرے۔ ضعف دماغ اور رعشہ کی شکایت بہت پہلے شروع ہو چکی تھی۔ پھر اور کچھ شکایتیں بھی لاحق ہو گئیں۔ ڈاکڑی اور یونانی دونوں علاج چلتے رہے لیکن طبیعت گرتی ہی گئی۔ ۳۶ سالہ کے اوائل میں جب بیماری نے شدت اختیار کی تو اس علامت سے اعلیٰ حضرت کو مطلع کیا گیا۔ خسر و کن کے اطباء یوں تو ہمیشہ استاد جلیل کی یاد سے وابستہ رہے لیکن زمانہ علامت میں جو شاہانہ توجہ و تامل رہی اس کی مثال نہیں ملتی۔ ناظم صحت عامہ ڈاکٹر و اگرے اور ناظم طبابت یونانی لواب غوث یار جنگ کو معائنہ و علاج کے لیے متعین کیا گیا۔ حکیم خسر و نظامی نے بعد میں دوا دینا شروع کیں۔ علاج کی رپورٹ صبح و شام ملاحظہ عالی میں پیش کی جاتی۔ آخری ایام میں زیادہ ہونے سے آپ بستر سے لگ گئے۔

سرکاری موٹر جیلز منزل پر پہنچوائی جاتی۔ کوئٹا بلڈ کے ذریعہ بھی مزاج کی جاتی۔ دماغی حالت وقت آخر سے دو روز تک اچھی رہی پھر شش کے دورے شروع ہو گئے۔ وقت آچکا تھا۔ کچھ دن اسی اُمید و بیم کی حالت میں گزرے جب ہوش آتا تو آپ کے لب کچھ پڑھتے نظر آتے۔ غور سے سنا گیا تو اس آیت شریفہ کا ورد تھا۔

حسبنا اللہ، ونعم الوکیل، نعم المولیٰ ونعم النصیر

انتقال سے پہلے ہوش و حواس بالکل بچا ہو گئے تھے۔ یہ افادۂ موت تھا۔ بالآخر یکم صفر ۱۳۶۵ھ ۶ جنوری ۱۹۴۶ء رات کے ۹ بجے دفناً حالت متغیر ہو گئی۔ نبض ڈوبنے لگی۔ شبِ دو شنبہ رات کے دس بجے روح قفسِ عنقریب سے پرواز کر گئی۔

”مدفن کے لئے مقام کا انتخاب خود اعلیٰ حضرت کی جانب سے ہوا۔ خطہ صالحین واقع نام پٹی میں اعزازات شاہی کے شاہی کے ساتھ مدفون ہوئے۔ نماز جنازہ میں غوام، عقیدہ متمدنوں، متوسلین و شاگردانِ جلیل، ادباء، شعرا اور حیدرآباد کے سربراہان و رہبر اشخاص کے علاوہ خود ذاتِ شاہانہ نے شرکت فرمائی۔ اور وہیں حسبِ ذیل خیالات کا اظہار فرمایا:

”ایک باکمال شخص اُٹھ گیا۔ نہ صرف شعرو سخن کی دُنیا میں وہ فرد کامل تھے بلکہ زہد و تقویٰ میں بھی بے مثال تھے۔ میں نے جلیل صاحب سے ربع صدی سے زیادہ استفادہ کیا ہے۔ اعلیٰ حضرت مرحوم (شاہِ آصف) بھی ان سے داغِ صاحب کے بعد اصلاح لیا کرتے تھے۔ امامِ اہلِ دُنیا سے اُٹھ گیا۔“

میت کا چہرہ دیکھ کر ارشاد ہوا:

”زاہد و عابد کے چہرے ایسے ہوتے ہیں۔ منہ خود بخود قلبِ کبیرا کی طرح ہے۔“

لے خطہ صالحین حیدرآباد کے محلہ نام پٹی میں درگاہِ یوسفین کے عقب میں بزرگانِ دین اور اعلیٰ حضرت کا شاہی مقبرہ ہے۔

استاذ کے لوح مرزا پر شاہ عثمان کا یہ قطعہ تاریخ درج ہے۔

## قطعہ تاریخ وفات

نشاط آور چہ بام زنجیلے  
عجب مستی بہ بام سلیے  
بگفت عثمان کہ اوشد واصل شد  
دکن گفت آہ استاد جلیے

۱۳۶۵ ہجری

اولاد:

جلیل حسن جلیل نے اپنی زندگی میں دو شادیاں کیں۔ پہلی زوجہ کے بطن سے  
پانچ اولادیں ہوئیں۔  
صدیق احمد اثر:

سب سے بڑے فرزند تھے۔ لکھنؤ کے دارالعلوم ندوہ میں تحصیل علم کی۔ مولانا  
سلیمان ندوی کے ہم مکتب تھے۔ پھر حیدر آباد آ گئے۔ یہاں وکالت و جودیشل کا امتحان  
پاس کیا۔ کچھ عرصہ تک وقار الامرا کی پائیکہ میں بحیثیت عہدہ دار عدالت میں کام کیا پھر  
سرکاری ملازمت میں آ گئے اور ناظم عدالت ضلع کے عہدے تک پہنچے۔ وظیفہ حسن  
خدمت کے بعد اعلیٰ حضرت کے صرف فاضل، نظامس اردو ٹرسٹ کی جانب سے بحیثیت  
صدر کمیٹی انتخاب کلام آصف سابع کی ترتیب و تہذیب کا کام انجام دیا۔ استاد جلیل  
کے انتقال کے بعد آصف سابع نے ایک عرصہ تک ان سے اپنے کلام پر اصلاح لی۔

۲۔ والد مرحوم کی وفات پر راقم الحروف نے بھی قطعہ تاریخ موزوں کیا تھا،

والدہ جلیلہ رحمت یافت      ساز بشکت و اک مدائے برکت  
سال یک آہ بدست علی      حاشین امیر داتے برفت

۱۳۶۵ھ

شاعری کا بڑا اچھا مذاق تھا۔ غزلیات کا دلوان ترتیب دیا تھا لیکن شائع نہ ہو سکا  
۱۹۷۲ء میں انتقال ہوا۔

بہال احمد:

دوسرے فرزند تھے۔ انھوں نے بھی وکالت کے اعلیٰ امتحانات پاس کئے۔  
محکمہ عدالت میں بحیثیت منصف ملازم ہوئے اور سٹیج کے عہدے تک پہنچے۔ ناظم  
دارالقضا بھی رہے۔ ملازمت کے سلسلے میں زیادہ تر اضلاع پر رہے۔ شاعری کا بڑا  
اچھا مذاق رکھتے تھے لیکن شاعری نہیں کی۔ اب بقیہ حیات نہیں۔

سید احمد کلیم

حضرت جلیل کے تیسرے فرزند۔ ملازمت کا آغاز محکمہ مال سے ہوا۔ تعلیم دار  
کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ محکمہ امور مذہبی میں بحیثیت اسپیشل آفیسر تنظیم اوقات کام  
کیا۔ قانون اوقات کی تدوین انھیں کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ شاعری سے بہت لگاؤ  
تھا۔ اچھے شاعر تھے۔ غزل کے علاوہ دوسرے اصناف کو بھی موضوع سخن بنایا۔ کلام  
شائع نہیں ہوا۔ اب بقیہ حیات نہیں۔

سلیم احمد:

چوتھے فرزند سلیم احمد نے کہیں ملازمت نہیں کی۔ ساری عمر بیکار رہے۔  
ان کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔

مولنس احمد:

ب سے چھوٹے فرزند تھے۔ ان کا تعلق بھی محکمہ عدالت سے تھا۔ کچھ  
عرصہ تک پیشہ وکالت سے وابستہ رہے۔ پھر عدالت میں سررشتہ دار ہو گئے۔  
زیادہ تر اضلاع ہی پر رہے۔ شعر و سخن اور ادب سے بڑی دل چسپی تھی۔ غزل گو  
شاعر تھے۔ شاعروں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ کچھ عرصہ تک معظم جاہ بہادر شجاع کے دربار  
سے بھی وابستگی رہی۔ ذلیف کے بعد حیدر آباد آ گئے تو اپنی ادارت میں ایک ادبی ماہنامہ  
آئینہ ادب جاری کیا۔ یہ معیاری ماہنامہ برسوں جاری رہا اور حیدر آباد کے ادبی حلقوں  
میں کافی مقبول رہا۔ آخری عمر میں پاکستان چلے گئے اور وہیں کراچی میں انتقال کیا۔

جلیل انکپوری کی دوسری زوجہ سے پانچ اولادیں ہوئیں۔ چار لڑکے اور ایک لڑکی۔ چاروں لڑکے بقیہ حیات ہیں۔ عزیز احمد جلیلی۔

سب سے بڑے فرزند ہیں۔ جامعہ عثمانیہ سے گریجویشن کیا۔ محکمہ مال سے ملازمت شروع کی تقسیم حیدرآباد کے بعد ہمارا اسٹریٹ کوالاٹ کر دیئے گئے۔ اسٹیشن ریلوینو آفیسر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ وظیفہ کے بعد مستقل قیام حیدرآباد میں ہے۔ شاعری کا شوق کالج کے زمانے سے تھا۔ غزلیں بھی کہتے ہیں اور نظم بھی۔ انگریزی نظموں کے منظوم ترجموں سے خاص لگاؤ ہے۔ رابندر ناتھ ٹیگور اور سر دیپنی ٹائیڈو کے منظوم ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ عمر قیام کی رُبا میوں کو بھی اردو میں منظوم کیا ہے۔ نثری ترجموں میں ”ہندوستانی افسانے“ کی چار جلدیں ہیں۔ کئی اردو اکیڈمیوں سے ایوارڈ حاصل کیے۔ علی احمد جلیلی۔

عثمانیہ یونیورسٹی سے اردو ادب میں ڈاکٹریٹ کیا محکمہ تعلیمات سے وابستہ تھے۔ کالج میں اردو کے پچر بھی رہے۔ بچپن ہی سے شعر و ادب کا فطری ذوق تھا۔ اپنے والد کی صحبت میں زیادہ رہے۔ فیض پایا۔ استفادہ کیا۔ شاعر بھی ہیں اور نثر نگار بھی۔ ایک کثیر غزل نگار کے چار مجموعے اور ایک کتاب تنقید پر شائع ہو چکی ہے۔ تالیفات ان کے علاوہ ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ترقی اردو بیورو دہلی کی اردو سائیکلو پیڈیا کی ادارت میں بحیثیت اسسٹنٹ ایڈیٹر ۵ سال تک کام کیا۔ ۱۹۸۹ء میں ادوارہ نقوش لاہور کا ایوارڈ (شاعری) میں حاصل کیا۔ مختار احمد۔

پروفیسر اقبال جلیلی اوائلی عمر میں قرآن حفظ کیا۔ اور ملازمت کا آغاز کیا۔ پوسٹ میں سران کے محکمہ سے کیا۔ آفس سپرنٹنڈنٹ کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ مشتاق جلیلی۔

جلیل کے سب سے چھوٹے فرزند بچپن ہی سے ڈرامے اور افسانے لکھنے کا شوق تھا۔ ریڈیو اسٹیشن حیدرآباد کے ادبی پروگراموں سے اپنے کیریئر کا آغاز

کیا۔ بعد ازاں بمبئی جا کر قلمی دنیا سے وابستہ ہو گئے۔ کہانی کار اور مکالمہ نویس ہیں۔ اسٹوری رائٹر کی حیثیت سے بڑا نام پیدا کیا۔ ان کی کئی فلمیں سلیور سکرین پر مناجی ہیں۔ ان کا مستقل قیام بمبئی ہی میں ہے۔

ذیل میں ان کا نمونہ سلام درج کیا جاتا ہے۔

صلیٰق احمد اثر:

آج اے دیدہ تر مجھ پہ یہ احساں ہو جائے وہ بھی پیچیں ہو تر اُس کا بھی دامال ہو جائے  
پَر دہ داری کا جو ہے پاس تجھ دستِ جنوں قیس عُریاں ہو مگر راز نہ عُریاں ہو جائے  
انہیں احمد حکیم:

رنگِ جنا بے گاہِ خوئے حنا کے بعد ملتے رہیں گے ہاتھ وہ جو روجھا کے بعد  
آنکھیں بلا کے تیز لگا ہی یہ کس لئے بیمارِ غم کو زہر نہ دو تم دوا کے بعد  
مولنس احمد مولنس:

روشنائی ہے صبا ان کا اشارہ پا کر شمعِ تربت مری دامن سے بجھا کیلئے  
زلف کے واسطے لے لو دلِ صد چاکر! بکڑی بھیٹی ہے بہت دیر شلنے کیلئے  
عزیز احمد عزیز:

مُکراتے ہی دیکھ کر مجھ کو اپنی حالت چھپائی جاتی ہے  
کھیل سمجھا تھا میں محبت کو آگِ دل میں لگائی جاتی ہے

## جلیل کا سوگ

فصاحت جنگ جلیل کی موت نے اہل دکن ہی کو نہیں سارے ہند کو سوگوار بنادیا۔ جگہ جگہ تعزیتی جلسے ہوئے۔ اخبار و رسائل نے بڑے پیمانے پر اپنے صفحات پر روح جلیل کو خراج عقیدت پیش کیا۔ تدفین کے دن ۸ بجے شب آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے استاد جلیل پر ایک خصوصی ملیٹن نشر ہوا۔ مقامی طور پر جن اخباروں نے ادارے لکھے، مقامین چھاپے ان میں قابل ذکر رہبر دکن، صبح دکن، میزاں، پیام اور سلطنت قابل ذکر ہیں۔ شمالی ہند کے روزناموں اور رسائل جھنوں نے استاد جلیل کا ماتم کیا وہ رسالہ آجکل دہلی، ہماری زبان دہلی، روزنامہ ہند کلکتہ، کانفرنس گزٹ علی گڑھ، اخبار مذاق مرزا پور، رسالہ معارف اعظم گڑھ رسالہ عالمگیر لاہور، رسالہ الحافظ دھولپور اور ہندوستانی ادیب وغیرہ ہیں۔

مقامی اور بیرونی اخبارات و رسائل نے جو ادارے جلیل کی وفات پر قلمبند کئے ان کے اقتباسات درج ذیل ہیں:

”حضور نظام کی اسادی نے جلیل کی قیمت اور شہرت دونوں کو چمکایا۔ ذاتی طور پر مرحوم نہایت متین و سکین مزاج بزرگ تھے۔ دربار آصفی سے تعلق ہونے کے بعد مشاعروں میں شریک نہ ہو سکتے تھے مگر فرمائش پر غزل تحریر کرنے میں دریغ نہ کرتے تھے۔ عام اخلاق

اور مرخاں مرغ طریق زندگی سے ہر شخص کی نظر میں وہ عزت و احترام سے دیکھے جلتے تھے۔ عمر کے ۸۵ ویں سال میں بمقام حیدر آباد دکن انتقال کیا۔ ہماری زبان کی طرف سے ایک تاریخ وفات بطریق تعہید پیش کی جاتی ہے۔

چوں شاعرے جلیلہ تخلص جلیلہ از دہر دوں گزشت بہ اعلیٰ مقام شد  
در یافتیم سال دناش بہ پیغیب گفت از لب امیر فصاحت تمام شد

(ہمدی زبان دہلی یکم فروری ۱۹۲۶ء) ۵۱۳۶۵ جگ

”نہایت افسوس کے ساتھ لکھا جاتا ہے کہ امام الفن فصاحت جلیلہ یکشنبہ ۶ جنوری کو حیدر آباد میں انتقال فرما گئے آپ نے تین دلیوان یادگار چھوڑے ہیں آپ اُردو کے بڑے جلیل القدر اور استاد مسلم الثبوت شاعر تھے۔ رسالہ آجکل آپ کے فیضانِ خصوصی سے ہمیشہ بہرور ہوتا رہتا تھا۔ دُعا ہے کہ خداوند کریم مرحوم کو اپنے حوالہ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔“ (آجکل دہلی۔ فروری ۱۹۲۶ء)

”امام الفن فصاحت جگ جلیلہ مانکپوری استاد حضور نظام اور حضرت امیر مینائی کے ارشد تلامذہ میں تھے اور صحیح معنوں میں ان کے جانشین ثابت ہوئے۔ اُنھوں نے اپنے فالوس سخن میں اس شمع کو روشن رکھا جو حضرت داغ دہلوی اور حضرت امیر مینائی نے اپنے ہاتھ سے جلائی تھی۔۔۔۔۔ ان کے استادانہ طرزِ کلام نے گیسوئے اُردو کو سونوارنے میں جو گراں قدر حصہ لیا ہے اُسے تاریخ ادبیات فراموش نہیں کر سکتی۔ مرحوم نے ۸۲ سال کے انقلاباتِ زمانہ اور حوادثِ روزگار کا شاہدہ اپنی آنکھوں سے کیا لیکن کبرنی کے باوجود ان کے عزائم ہمیشہ جوال رہے اور ان

کو آخری سانس تک شعر و سخن کی شاطہگی میں دیکھا گیا۔

(عالمگیر لاہور، خاص نمبر ۱۹۴۶ء)

”حضرت جلیل کی وفات کا علمی اور ادبی حلقوں میں جتنا ماتم کیا جائے کم ہے۔ بلاشبہ وہ قدیم دور شاعری کے آخری استاد تھے اور فن میں ان کو حضرت اقدس واعلیٰ کے استاد ہونے کی عزت حاصل تھی اور اس حیثیت سے بھی کہ مرحوم و مغفور کے کردار کی ذاتی اور انسانی خوبیاں قدیم مشرقی تمدن کی وضعداریوں اور خوبیوں کی یاد تازہ کرتی تھیں۔ ان کی دائمی مفارقت ایک ایسا قومی نقصان ہے جس کی تلافی ممکن نہیں۔

حیدر آباد کے ماضی قریب میں ایک دور ایسا شاندار گزرا ہے جس میں علم و فضل کے اعتبار سے ہندوستان کی بہترین شخصیتیں فرخندہ بنیاد میں جمع رہیں اور یہ علم و فضل اور فنی کمالات کی ایسی محفل تھی جس کی وجہ سے حیدر آباد کے علمی و ادبی مذاق میں ممکنہ اضافہ ہوتا رہا۔ ان محفلوں کی آخری یادگار حضرت جلیل مرحوم تھے اور افسوس کہ دست اجل نے محفل ادب کی اس شمع کو بھی خاموش کر دیا۔“ (اخبار پیام، ۹ جنوری ۱۹۴۶ء)

”ہندوستان کے سارے علمی و ادبی حلقوں میں یہ خبر نہایت رنج اور افسوس سے سنی گئی کہ فصاحت و جگ حافظ جلیل حسن صاحب جلیل مانپوری نے گزشتہ ہفتہ میں رحلت فرمائی۔ حضرت جلیل ہمارے زمانے کے ایک جلیل القدر شاعر اور ہماری زبان کے ایک بڑے محسن تھے۔ حضرت جلیل اگرچہ شعر و سخن کا ذوق رکھتے تھے مگر

مذہب سے کچھ مناسبت نہیں لیکن آپ کی زندگی زندانہ نہیں بلکہ یکسر زاهدانہ تھی اور وہ اپنے شبانہ روز اعمال و کردار کے اعتبار سے ایک متقی و پرہیزگار مسلمان اور محاسن اخلاق کے لحاظ سے اسلاف کرام کا نمونہ تھے۔

(۱۹۴۶ء)  
(سما نفرس علیگر ۲۲ جنوری ۱۹۴۶ء)

اخبار و رسائل کے علاوہ ممتاز شخصیتوں نے شخصی طور پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ یہ تاثرات جو مختلف جہاں میں شائع ہوئے ان میں سے چند کے اقتباسات درج ذیل ہیں:

میر عثمان علی خاں آصف صالح

”ایک طویل عرصہ سے بوجہ پیرانہ سالی و خرابی صحت یہ (استاد جلیل) علیل تھے جن کا انتقال یکم صفر کی شب میں ہوا اور دوسرے دن جوار رفتا میں یعنی خطہ صالحین میں تجہیز و تکفین عمل میں آئی۔

بہر حال چونکہ ہر جاندار کو موت ہے لہذا اس کے مد نظر اس سانحہ پر تعجب نہیں مگر افسوس اس کا ہے کہ ایسے زاہد و عابد نفوس جو کہ اپنے فن میں فی زمانہ اپنا بدل نہیں رکھتے تھے وہ یکے بعد دیگرے دنیا سے رخصت ہو گئے۔

خدا مرحوم و را کہ استاد ما بود غزلی رحمت بیکند“

(اجلہ صحیح دکن ۵ صفر المظفر ۱۳۶۵ھ)

”ایک باکمال شخص اٹھ گیا۔ نہ صرف شعر و سخن کی دنیا میں فرد کامل تھے بلکہ زاہد و تقویٰ میں بھی بے مثال تھے۔ میں نے جلیل صاحب سے ربع صدی سے زیادہ استفادہ کیا ہے۔ اعلیٰ حضرت مرحوم (میر محبوب علی خاں آصف) بھی ان سے داغ صاحب کے بعد اصلاح لیا کرتے تھے۔

میرے دو تین دیوان جلیل صاحب ہی کی اصلاح کے ہیں۔  
میں نے ہتھیہ کر لیا ہے کہ کسی کو اپنا کلام نہ دکھاؤں گا۔  
امام الفن دنیا سے اُٹھ گیا۔“

(۱۹۳۶ء  
( اخبار میزان ۲۳ صفر ۱۳۶۵ھ ۲۸ جنوری )

قاضی عبدالغفار

”ادب اور شاعری کی قدیم محفلوں کا شاندار آخری  
چراغ تھا جو گل ہوا اور شاعری کے شجرے میں حضرت  
دآخ کے بعد یہ آخری نام تھا جس کے بعد اب اس دستانہ  
میں کسی نام کا اضافہ بہت مشکل ہے۔ یوں تو تغزل کے  
ایک بادشاہ حسرت ہو پائی ابھی تک ہماری محفلوں میں  
شمع سخی روشن کرتے ہیں لیکن حسرت اور جلیل کی شاعری  
کا مکتب خیال جدا تھا اور اپنے اسلوب میں حضرت جلیل  
قدیم سلسلہ تلمذ کے آخری استاد تھے جن کی خاک کو  
حیدر آباد کی سرزمین نے اپنی گود میں سمیٹ لیا۔ . . . .  
حیدر آباد کے علم و ادب کی ایک قدیم یادگار کی حیثیت سے  
آخر وقت تک علم و ادب کے استادوں میں ان کا نام  
سرفہرست آیا مگر افسوس کہ

صبح دم تو نے نہ چھوڑی وہ بھی اے باد صبا

یادگار رونق محفل تھی پروانے کی خاک“

(۱۹۳۶ء  
( اخبار میزان ۲۸ جنوری )

میرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی:

”خدا معلوم کیا بات ہے کہ میں پُرانی تہذیب کا دلدادہ ہوں۔ یہی  
وجہ ہے کہ میں حافظ جلیل حق صاحب جلیل مرحوم خلیفہ جنگ  
بہادر کا شاگرد تو نہیں مگر ایک عرصہ سے ان سے عقیدت رکھتا۔

میں چھوٹوں کی طرح ان سے ملتا اور وہ بزرگوں کی طرح مجھ سے پیش آتے..... شاعری کا جو قدیم رنگ تھا وہ اس کے استاد تھے اور ایسے استاد تھے کہ موجودہ زمانے میں کوئی ان کا مقابل نہ تھا۔ وہ کیا ختم ہوئے یہ کہوں کہ پُرانی شاعری مری نہیں تو لب گور ضرور ہو گئی ہے۔ اب اس کا خدا حافظ ہے۔ بظاہر تو آثار اچھے نظر نہیں آتے،

(۱۳۵۵ھ  
(اخبار ہیزال جلیل نمبر ۲۶، اسفند ۲۸، جنوری ۱۹۳۶ء)

مولانا سلیمان ندوی

”مشہور شاعر حضرت جلیل نے سچا سی برس کی عمر میں حیدرآباد دکن میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ اللہ تعالیٰ اس درویش شاعر کو اپنی داور رحمت سے شاد فرمائے خاکسار کو پہلی مرتبہ مارچ ۱۹۱۱ء میں نواب عماد الملک مرحوم کے کتب خانے کو بندہ لانے کے سلسلے میں حضرت استاد مرحوم کے حسب ایما حیدرآباد جانے کا اتفاق ہوا۔ وہ عقیدت جو حضرت جلیل سے مجھے تھی کشاں کشاں مجھے ان کے آستانے تک لے گئی۔ بڑی شفقت و محبت سے ایلے اس کے بعد جب بھی حیدرآباد جانا ہوا ان کے ہاں ضرور حاضری دی..... ابھی آخری زمانے کی حاضری کے موقع پر جو ۱۹۲۵ء میں ہوئی دیدار نہ ہو سکا۔ ایسے ہیاتھے کہ ذی فرائض تھے۔ نقل و حرکت کی ممانعت تھی۔ یہی حالت کم و بیش قائم رہی اور مرض الموت ثابت ہوئی۔

حضرت جلیل نے ۱۹۲۵ء سے یکم ۱۹۲۶ء تک ادھیڑ عمر سے زندگی کے آخری لمحہ تک حیدرآباد میں گزارا اور اس کو اپنا وطن بنایا جسکو مرنے کے بعد بھی نہ چھوڑا۔ وہیں آسودہ خاک ہوئے۔

(رسالہ معارف اعظم گڑھ۔ مارچ ۱۹۳۶ء)

## خواجہ حسن نظامی

”جناب جلیل کا ابھی حال میں انتقال ہوا ہے۔ انھوں نے بمقام حیدرآباد ۸۵ برس کی عمر میں وفات پائی وہ اعلیٰ حضرت آصفیاء ہفتم کے استاد تھے گزشتہ زمانے کے اکثر نامور شاعر ایسے گزرے ہیں جن کی شاگردی پر سلاطین زمانہ فخر کرتے تھے مگر جو ادب و احترام بحیثیت استاد شاہ جناب جلیل کے ساتھ اعلیٰ حضرت کے بڑاؤ سے ظاہر تھا اس کی شان گزشتہ تاریخوں میں نہیں ملتی۔ اے

حضرت جلیل مجھ پر بہت عنایت فرماتے تھے میں جب حیدرآباد جاتا ان سے ملتا تھا لیکن اس دفعہ جب آنا ہوا تو اپنی معذوریوں کی وجہ سے ان کے پاس نہ جاسکا۔ یکایک سنا کہ انہوں نے وفات پائی اور مجھے ان کے دفن میں شرکت کا ثواب حاصل ہوا۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی شاعری کا فیض شاعر دل کو پہنچا اور ان کی عبادت کا فیضان ہم کو نصیب ہو۔“

(اخبار میزان۔ ۱۷ جنوری ۱۹۳۷ء)

## ہوش بگرا می

”ان کی موت ان کی موت نہیں علم و فن کی موت ہے اُردو

اے ہوش بگرا می اس تعلق سے لکھتے ہیں :

”حضرت پیر و مرشد (شاہ عثمان) کا اب بھی یہ عالم ہے کہ دربار میں جب اپنے استاد حضرت جلیل کی نذر قبول فرماتے ہیں تو تعظیماً کھڑے ہو جاتے ہیں کیونکہ فنی شعرو سخن میں خالوادہ آصفی نے لڑا ب نصاحت جنگ جلیل سے صلاح لی ہے اور اس عمل سے دُنیا پر ظاہر فرماتے ہیں کہ مشرق میں استاد کا ادب منجملہ اوجہات دین سمجھا گیا ہے۔

(اخبار پیام۔ ۲۹ رمضان ۱۳۶۳ھ م ۸ اگست ۱۹۴۵ء)

شاعری کی موت ہے۔ اسیر کے جانشین نے خطہ صاحبین کو آباد  
کر دیا مگر شعر و شاعری کی قدیم محفل ہمیشہ کے لیے سنسنائی ہو گئی  
اور ایسوں کے اٹھ جانے کے بعد اس کی توقع نہیں کی جاسکتی  
کہ مشرقی سیرت و سعادت کے ایسے غیر فانی نقش آئندہ آپ  
گل کی اس سطح سے ابھر سکیں گے۔

(مجلہ عثمانیہ، جلیل نمبر ص ۴۵)

علی اختر

”لاب جلیل مرحوم اپنے زمانے کے یگانہ روزگار شاعر تھے  
اور فکر کی وہ کاوش، خیالات کی وہ ہمواری اور بیان کی وہ  
رعنائی جو عہد قدیم کا اتنا زحقی ان کے ساتھ ختم ہو گئی۔  
خدا ان کی روح پر ہزاروں رحمتیں نازل فرمائے۔ زمانہ کا  
کارِ بخ بدل چکا ہے۔ اب ایسے صاحبانِ اصول و عمل کو دیکھنے  
کے لیے آنکھیں ترستی رہیں گی۔“

(رہبرِ کن، ۲۶ جنوری ۱۹۴۶ء)

قطعات تاریخ و منظومات

جلیل کے انتقال پر دکن اور شمالی ہند کے ہمعصر بہترے شاعر و بانے منظوم خراج  
عقیدت پیش کیا۔ ان میں سے چند تاریخیں درج ذیل کی جاتی ہیں :-

قطعات تاریخ

شاعر بے نظیر و بے ہمتا      آنکہ عمرش گزشت در تھیل  
با ادب سالِ حش گفتم      پیش رب جلیل رفتہ جلیل

۱۳۵۵ ف

امجد حسین امجد حیدر آبادی

آہ حافظ جلیل حسن بھی ہو گئے عازم خلد و کوثر  
 شاعر نکتہ سخن معانی جانشین امیر مطہر  
 وہ سزاوار تالیق سخن کے لکھو کے دبستانِ انیسر  
 لے زمین دکن تجھ میں کتنے ہو گئے دفن نایاب گوہر  
 داغ فانی اتیر اور آزاد علم دفن و ادب کے پیمبر  
 اور جلیل اب ہوئے مائل خواب یہ ترا ظرف اللہ اکبر  
 سال تری جمل سیلاب لکھئے ماہر فن جلیق سخنور

۶۵ ۱۳۲

سیاہ اکبر آبادی

چھوڑ کر ب کو جب فصاحت جنگ ہوئے خلد بریں ہوئے مائل  
 پوچھا ہاتھ سے مرزا فرحت کس طرح انکی طے ہوئی نزل  
 کہا باتیں یہ راز کی ہیں مگر یہ نتیجہ ہے ان کا الحاصل  
 ہوئے حافظ جلیل یاد دل باد گاہ جلیل میں داخل

۱۰۶۳ + ۳۰۲ = ۱۳۶۵

مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی

کہاں ہیں وہ حافظ جلیل حسن کہ جو ملک معنی کے تھے پیشوا  
 امام فن اٹھے زمانے سے آہ ملی خلد میں انکو پہننے کی جا  
 ہر اک آنکھ گریاں ہے انکے لیے ہر اک دل ہے اندوہ غم سے بھرا  
 جگر شمعِ بزم سخن ہے خوش چراغ ادب حیف یہ کچھ گیا

۶۵ ۱۳۲

جگر لبوانی

وائے بر عالم جلیق استادِ سخن رفت سوئے خلد ایں دارِ سخن  
 در جوارِ حق بباد اور وادح او غنبریں یاد آتش زیر کفن  
 بر سخن راہم خداوند خدا گشت طوفانی کنوں بجز سخن

او شہسے بود در اوراقِ شغل !  
شد فصاحتِ جنگ در ہندوستان  
سال فوٹش صدق گفت و در بفت

ہزار حیف کہ رفت از جہاں فصاحتِ جنگ  
ہمیں بس است دلیلِ جلالِ شغل در شعر  
ز ذکر و فکر نمی بود پیچِ گہہ خالی  
جیش از اثرِ صدقِ مطلعِ الار  
شہ از کمالِ تملط کہ داشت در حقش  
زعرش مژدہٗ تغفر کہ رسید بفرش  
۱۳۶۵ھ

انکی غزلِ زباں زد ہر خالی و عام ہے  
رو اپنے بخت سوختہٗ پراور خوب رو  
کسریٰ خدا گواہ نظامِ دکن نے بھی  
نکلا ہے فرو رنگ میں اپنے یہ سال فوٹ

دیتے ہیں حیاں منزلِ عقیبی میں شوق سے  
کایاب ہے یہ سمرغِ سال و فسات بھی

از رحتِ آن کامل دلہا ہمہ شد بیدل  
آن بندہ خاص حق آن ذاکر دآن شاعری  
ہر روح شدہ مجروح ہر قلب شدہ سبیل  
آن شاعر بے پایاں آن مستحق سہا میل  
جوں فکر و فنا کردہ، تاریخ شدہ حامل  
شد روح الام الفن آذر باغِ جاناں داخل

۱۹۲۶ء

صدیق الزماں ونا (نمیو حضرت امیر)  
جو بھی دل ہے وہ سرت سے ہی آغوش ہے  
کہہ شمیم لونہہ گر اک خوشنوا آغوش ہے

جھانگی پڑ مردگی ہر سمت غم کا جوش ہے  
علیوی سن میں فصاحت جنگ کا سال ونا

۱۹۲۶ء

شمیم رائے بریلوی  
تڑپتی ہے نکل جانے کو جانِ مضل دیکھو  
جلیل القدر میں اب قلم میں آسودہ دل دیکھو

خبر آئی ہے مرگ حضرت استاد کی جس سے  
جو کی اسے رن فکر سال دی آواز ہاتھ نے

۱۳۶۵ھ

احمد حسین بمرق (مدراں)

زینت بزم شہ جلیل حسن  
جامع علم و فن امام الفن  
پیر میخانہ شہ اب سکھن  
شمع بزم سخن، جلیل حسن  
منبعِ جود و خیر ہر سخن

جانشین اسید مینائی  
تھے حقیقت میں وہ جلیل القدر  
کس کو اہل نظر کہیں گے اب  
پہنچتن پاک کی ہیں محفل میں  
فکر تاریخ کیا ہے کہد و شر

۱۹۲۶ء

عبد الغفور شرر لکھنوی

بنی ماتم کدہ بزم سخندان !  
ہوئی اف رحتِ آتشاں طاق

جلیل القدر شاعر اٹھ گیا آہ  
فضا کہد و اجل کاسر اڑا کر

۱۳۶۵ھ رضا جالندھری

۱۰ مجلہ عثمانیہ جلیل نمبر ۲۸۹ ۱۰ مجلہ عثمانیہ جلیل نمبر ۲۸۶ ۱۳۶۵ھ ۲۸۷

شہ کے استاد جانشین امیر کر کے رحلت گئے جو زیر زمین  
ملہم غیب نے کہا عارِج لکھ مزار جلیل خلد نشین

۵۱۳۶۵

عارِج مالیکا لوی

جلیل قدر جلیل حسن فصاحت جنگ تھے شاہ کشور معنی لقب امام الفن  
زمانہ خالی ہوا با کمال سے عادت ہے سال رحلت استاد امیر تاج سخن

۵۱۳۶۵

قاضی میر طیف علی عارف ابو اعلیٰ

الوداع والفرق

اے جلیل القدر یعنی اے جلیل خوش بیاں تو نہیں موجود تجھ کو ڈھونڈنے جائیں کہاں  
روشنی نہ سخن دنیا سے رخصت ہو گئی الوداع والفرق والحفیظ والامان

نیک فطرت نیک طینت نیک نیت نیکات باسروت با محبت با خصائل با صفات  
پاک مظہر پاک پیگر پاک باطن پاک دل قابل تقلید عالم عالمانہ بات بات

یاد ہیں اب تک ہمارے دل کو یا رانِ دکن تھے امیر و داغ زندہ باہر ان علم و فن  
رفتہ رفتہ دہر سے سب اٹھنے والے اٹھ گئے ہو گئی نظر دل سے غائب انجمن کی انجمن

دے جگہ باغِ خاں میں بخش کر جرم و خطا رات دن اللہ کی درگاہ میں ہے یہ دُعاء  
گر یہ و زاری نے برپا کر دئے طوفانِ حشر لوح کو بکلیف پہنچی لوح کا ہم عصر صحت  
لوح ناروی

## ساتی میخانہ امیر

آہ تو نے بھی پیا موت کا جام اے ساتی ہو گیا آج سے تو عرش مقام اے ساتی  
اب کہاں وہ تری محفل وہ ترا میخانہ ہو گیا درہم درہم وہ نظام اے ساتی  
بہنے بیٹھے ہیں چپ بنست غیب روتی ہے خم ہیں پھوٹے ہوئے، ٹوٹے ہو جام اے ساتی  
حسن اور عشق کی تفسیر ترا ہر لغت ہر غزل تیری جوانی کا پیام اے ساتی  
تیری گفتار کے چرچے ہیں تھک والوں میں قد سیوں کی ہے زباں پر ترا نام اے ساتی  
عارفوں میں ہے لقب مرشد کامل تیرا میکشوں میں ترا خیام ہے نام اے ساتی

حسرت دست اجل ایں چہ قیامت افتاد

کاروان سخن و شعر بغاوت افتاد

سُن ذرا غور تو کر دے تو جواب اے ساتی کیا کریں اب یہ ترے خانہ خراب آ ساتی  
نہ وہ محفل نہ وہ ہنگام نہ وہ جوش و خروش نہ وہ دستور نہ وہ بادۂ ناب اے ساتی  
آبدیدہ ہے عروسی حرم میخانہ ! سو گوارا آج ہے کس کس کا شباب آ ساتی  
داستانِ سخت آہ بہ پایاں برسید ختم شد سلسلہ شعر و شرب اے ساتی

مئے میاں امیر آہ بجام تو نہ ماند

نام تو ماند بہ دنیا و قیام تو نہ ماند (علی احمد جلیلی)

نوٹ: تمام قطعہ تاریخ اور منظومات کا ماخذ مجلہ عثمانیہ جلیل نمبر ۱ اور ہندوستانی ادب جلیل نمبر ۱۱۔

شاگردانِ حلیق

افس

اصلاحِ سخن

## شاگردانِ جلیل اور اصلاحِ سخن

اصلاحِ سخن کننا طریقہ شاعری میں اسلاف سے چلا آ رہا ہے۔ فنِ شعر میں استاد کی شاگردی لازم و ملزوم سمجھی جاتی تھی۔ صحتِ کلام کی ضمانت یہی تھی کہ شاگرد استاد کو اپنا کلام دکھالیتا تھا اور اس کے بغیر مشاعرہ میں پڑھنے یا کسی مجلسِ شاعرہ میں شائع کر دینے سے احتراز کرتا تھا۔ استاد کی شاگردی کی یہ روایت بہت مستحکم رہی ہے۔ استاد اور شاگرد کے تعلق سے محمد طفیل مدیرِ نقوش نے بڑی دلچسپ بات لکھی ہے:

”پہلے اساتذہ اپنے شاگردوں پر فخر کرتے تھے۔ بلحاظ

سعیاہ اور بلحاظ تعداد۔ ایک استاد کہتا تھا میرے اتنے

شاگرد ہیں دوسرا کہتا تھا میرے اتنے شاگرد ہیں۔ پھر

مشاعروں میں ٹولیوں کی ٹولیاں سمجھتی تھیں۔ اپنی اپنی صفت

کے شاعروں کو اُٹھارا جاتا تھا۔“ لے

سیما بکر آبادی اپنی کتاب دستورِ اصلاح میں اصلاح کی ضرورت پر لکھیں

رقمطراز ہیں۔

”اصلاح سے لسانی، فنی اور علمی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ کسی استاد کا شاگرد ہونے سے کسی خاص ادارہ خیال سے نسبت ہو جاتی ہے اور ایک ہموار راستہ چلنے کو مل جاتا ہے“ لے

امیر مینائی، مرزا داغ اور جلال کھنوی اپنے سلسلوں کے علمبردار اور استاد مانے جاتے تھے اور ان کے شاگردوں کی کثرت تھی۔ چونکہ جلیل فائدان مصحفی کے ایک نامور استاد تھے، اس لئے مصحفی نے اپنے تذکروں میں اسنادی اور شاگردی کے جو حدود قائم کئے تھے اور جس روایت کی بنیاد ڈالی تھی وہ بالواسطہ جلیل تک پہنچی اور ان کے یہاں بھی جاری رہی انھیں امیر اور اسیر کی اصلاحات کے نمونوں کا بھی علم تھا۔ حضرت امیر کے فیض صحبت سے ان کی حیات ہی میں جلیل نے شاعری میں اعتبار پیدا کر لیا تھا اور فارغ اصلاح ہو چکے تھے۔ خود امیر مینائی نے اپنے بعض جاہل شاگردوں کو آپ سے رجوع ہونے کی تلقین فرمادی تھی۔ اس تعلق سے خود جلیل کا بیان جو یادداشت کی صورت میں میرے یہاں محفوظ ہے، یہ ہے:

”جب حضرت [امیر مینائی] کی پیرانہ سالی بڑھی اور شاگردوں کا ہجوم بہت ہو گیا تو حضرت کہاں تک سنتے اور اصلاح دیتے بالاخر حضرت نے مجھ کو حکم دیا کہ تم دیکھ لیا کرو۔ صرف منتخب لوگوں کی غزلیں مجھے سنا کر دو“

اس سلسلے کی ایک کڑی ”سوانح امیر مینائی“ میں ملتی ہے جس میں جلیل رقمطراز ہیں:

”ایک دن باہر سے کچھ لوگ حضرت امیر مینائی سے ملنے آئے۔ مسائل شاعری کے متعلق استفسار کیا۔ بعد ازاں حضرت سے کہا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو دیرگاہ سلامت رکھے۔ آپ کے بعد ہم جاہل شاگردوں کو کس سے رجوع کرنا چاہیے۔“

راقم الحروف الگ بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ حضرت نے ان کے  
جواب میں میری طرف اشارہ کر کے کہا ان سے رجوع  
کرنا چاہیے۔ وہ لوگ اُٹھے اور مجھ سے مصافحہ کیا۔ میں  
اس واقعہ سے سخت حیرت زدہ اور شرم سے اب  
اب ہو گیا کیوں کہ حضرت کے بہت سے قابل و فاضل  
قدیم تلامذہ موجود تھے جن کے آگے میری کوئی ہستی  
نہ تھی۔“ ۱

ایتیمائی کے انتقال کے بعد جو شعرا جلیل سے مستفید ہوئے ان کو نین گروپ میں تقسیم  
کیا جاسکتا ہے۔

## ۱۔ شاہ و خالوادہ شاہی :

لؤاب میر محبوب علی خاں آصف والی دکن۔ لؤاب میر عثمان علی خاں عثمان  
والی دکن۔ لؤاب صلابت جاہ بہادر برادر والی دکن۔  
شہزادگان و صاحبزادگان میں : والا شان لؤاب اعظم جاہ بہادر۔ والا شان لؤاب  
اعظم جاہ بہادر شیخ۔ لؤاب کاظم جاہ بہادر کاظم۔ لؤاب ثقی جاہ بہادر ثقی۔ لؤاب  
ہاشم جاہ بہادر ہاشم۔ لؤاب بشارت جاہ بہادر بشارت۔ لؤاب سعادت جاہ  
بہادر سعادت۔ لؤاب حشمت جاہ بہادر حشمت۔

افراد خاندان شاہی کے کلام پر اصلاح کے سلسلے میں جو ارشادات و تحریرات  
وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ان کے کچھ اقتباسات درج کئے جاتے ہیں۔

اساد خاندان مافصاحت جنگ جلیل

”کم و بیش دو قرون سے ان (استاد جلیل) سے جو افراد اصلاح  
لیتے ہیں، وہ ہیں ریش وقت، جو نیر پرش اور شہزادگان....“

یہ فن کتنا نازک ہے اس کو سمجھنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں  
نہ کہ ماؤ شما۔ بشرطیکہ کلام استقام سے پاک و صاف ہو اور  
مہذب و ذی علم طبقہ کی محفلوں کے قابل ہو،

یہ بات یہاں قابل ذکر ہے کہ خاندان شاہی کا کوئی فرد اعلیٰ حضرت کی اجازت کے  
بغیر اپنی غزل اصلاح کے لئے راست روانہ نہیں کر سکتا تھا۔ شاہ کے توسط ہی سے جلیں  
تک پہنچتی تھیں۔

نواب صلابت جاہ بہادر (برادر شاہ) جن کا تخلص آصفی تھا آپ سے مشورہ  
سُخن فرماتے تھے جس کی اجازت اعلیٰ حضرت سے حاصل کر لی تھی۔ جیسا کہ ذیل کی تحریر سے  
ظاہر ہوتا ہے۔

### استاد فصاحت جنگ جلیں

غزلیات کی اصلاح کے لئے میں نے اعلیٰ حضرت سے اجازت  
حاصل کر لی ہے اور یہ بھی عرض کر دیا ہے کہ راست آپ کے نام  
حکم صادر فرمایا جائے کہ میری غزلیات کو صلاح دید یا کریں۔  
آپ کے نام شاید فرمان آجائے گا۔ موقوف غزل بعد اصلاح  
واپس کر دیجئے میرے آدمی سے کہدیا جائے وہ کب آئے۔

۵ ذیقعدہ ۱۳۲۹ھ صلابت جاہ

اس تعلق سے اعلیٰ حضرت نے جو تحریر استاد کو روانہ کی وہ حسب ذیل ہے۔

### جلیں صاحب

صلابت جاہ غے میرے یہاں درخواست کی ہے کہ وہ تم  
سے اپنی چند غزلوں پر اصلاح لینا چاہتے ہیں۔ اس پر  
میں نے انھیں آگاہ کیا ہے کہ وہ اصلاح لے سکتے ہیں اس  
شرط کے ساتھ کہ استاد جو کچھ بنائے اس کو شاگرد قبول  
کمرے نہ کہ چند روز قبل جیسا کہ ہوا تھا کہ انہوں نے استاد  
کی اصلاح پر بیجا نکتہ چینی کی تھی۔ لیکن انھوں نے مجھے

اطلاع دی ہے کہ وہ آئندہ ایسا نہ کریں گے۔

میں تمہیں لکھتا ہوں کہ اگر وہ آج کل میں تمہارے پاس  
اصلاح کے لئے غزل بھیجیں تو تم اصلاح دینا۔ اطلاع پیر چہ اپس

۵ ذیقعدہ ۱۳۴۹ھ

شہزادوں میں پرنس منظم جاہ بہادر شجاع کو شاعری سے خاص لگاؤ تھا۔ بڑا  
شہر اذاق سخن رکھتے تھے! علحضرت کو ان کی شاعری سے خصوصی لگاؤ تھا۔ ذیل کی  
تحریر اس کی گواہ ہے۔

جلیل صاحب

”چھوٹے صاحب (پرنس منظم جاہ) کی غزلیات کو بعد اصلاح  
ایک کتاب پر صاف کر لیا گیا ہے تاہم اس پر استاد کی ایک  
نظر پڑنا ضرور ہے۔ یعنی نظر ثانی قبل اسکے کہ طبع ہو اس لئے  
اس کو بھیجا ہے۔ نظر غور سے دیکھ لیا جائے اور اگر ضرورت  
ہو تو پھر اصلاح دی جائے۔“

فرمان مبارک ۲ ربیع الثانی ۱۳۵۳ھ

اسی طرح صاحبزادوں کی غزلیں بھی علحضرت کے توسط سے آتیں۔ بعض اوقات  
ایسا ہوتا کہ وہ خود بھی اصلاح دیتے لیکن ایسا کرنے کے بعد یعنی اصلاح دے کر استاد  
کے پاس اس تحریر کے ساتھ بھیج دیتے۔

”دوسری طرف استاد کی موجودگی میں اصلاح دینے کی ہمت نہیں  
پڑتی کہ جائے استاد خالیست“

اسی سلسلے میں حسب ذیل تحریر جمیدہ غیر معمولی میں شائع ہوئی :

”سچا دعویٰ کسی دلیل کا محتاج نہیں۔ دیگران (صاحبزادوں)  
کے کلام پر استاد جلیل اور میں بحیثیت پدر جو نظر ڈال رہے  
ہیں تو اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ان کی گویائی کو بدل دیا گیا  
ہے بلکہ ایسا نہیں ہے۔ یہ انہیں کا کلام ہے۔ اللہ اعلم“

ان کو بتا رہے ہیں کہ کلام کو کس طرح بلند کیا جاتا ہے کیونکہ  
اصلاح ہی سے آئندہ چل کر شاگرد استاد بنتے ہیں۔“

جریدہ غیر معمولی ۵ مہرہ ۱۳۴۳ھ

اصلاح کے بعد صاحبزادوں کا یہ کلام جب اخباروں میں شائع ہوتا تو اعلیٰ حضرت  
کے اس قسم کے لوٹ ان کی غزلوں کے ساتھ ہوتے :

”ساظم جاہ — اس لڑکے کی لیاقت دوڑوں زباؤں  
میں اچھی ہے۔ یعنی اُردو اور فارسی میں۔ استاد نے خفیف  
سی صلاح دی ہے اور ذہن کی تعریف کی ہے“

”ہاشم جاہ — یہ لڑکا ہمیشہ زبان اُردو ہی میں کہتا  
ہے کہ فارسی کی استعداد نہیں رکھنا جیسا کہ چاہیے تاہم  
اس کی قوت گویائی کی داد استاد نے دی ہے“

”سعادت جاہ — چہ خوب منقبت کو دک ماگفتہ استاد  
جلیل اصلاح دادہ تحسین کرد و گفت گویائی از عمرش خیلے  
فردل است۔“

## ۲۔ امرائے پائیکاہ و سلطنت

شاگردوں کے دوسرے زمرہ میں امرائے سلطنت ہیں۔ حیدر آباد میں اس  
وقت شاعری کا ایسا چرچا تھا کہ اکثر امرا کو شاعری سے لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔  
قابل ذکر نام حسب ذیل ہیں :

مہاراجہ سرشن پرشاد بہادر شاد ، نواب صادق جنگ حاتم ، نواب اسد یار الدولہ اسد  
نواب دستگیر نواز جنگ خاطر ، نواب حسن نواز جنگ بہادر خسرو ، نواب تریب یار جنگ سعید  
نواب قدرت نواز جنگ قدرت ، نواب لقمان الدولہ بہادر ، نواب معین الدولہ بہادر معین  
نواب لطف الدولہ بہادر لطف ، راجہ محبوب راج بائی ، نواب منظور جنگ بہادر منظور  
نواب نجیب الدین خاں بہادر نجیب ، نواب نصیر یار جنگ خلف شاد وغیرہ

ان میں صرف ہمارا جہ شاد ایسے تھے جنہیں استاد سے اصلاح کے لئے اعلیٰ حضرت سے اجازت حاصل تھی۔ باقی سب چوری چھپے اعلیٰ حضرت کے علم کے بغیر اپنا کلام دکھاتے تھے۔

ہمارا جہ شاد یمن السلطنت پیشکار سلطنت آصفیہ تھے۔ ان کا تعارف پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ مرزا داغ کے بعد استاد جلیل، ہی سے رجوع ہو گئے تھے۔ موصوف جلیل کے محن بھی تھے اور شاگرد بھی۔ ان کی تحریروں کے چند اقتباسات درج کئے جاتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے استاد سے وہ کتنی گہری عقیدت رکھتے تھے۔

حضرت جلیل

”نظم سچی۔ اصلاح کا شکر یہ۔ آپ کا وجود دنیا سے شاعری کے لئے مسعناں سے ہے۔ اس نظم کے آخر میں دو شعر جو تخلص سے متعلق ہیں اگرچہ شاعری کے لحاظ سے تعلیٰ درست ہے مگر میرے دل میں یہ بات پیدا ہوتی ہے کہ شاد تمام عمر کا کما پیرور ہونے کی کوشش کی۔ اب اس فی کے لئے اس عمر میں مناسب نہیں۔ اس لئے میں نے دونوں اشعار کو بدل دیا ہے یہ اصلاح شدہ اشعار ہیں۔“

فقیر شاد

حضرت جلیل۔ تسلیم

سرکار مدظلہ کی سالگرہ مبارک کی تقریب کے سلسلے میں جو مصرع فارسی مرحمت ہوا ہے اس میں قافیہ یادی، دلاوری، برتری، سکندری، دلبری، بھی کہہ سکتے ہیں یا نہیں۔ ہر بانی سے اس کی صراحت کیجئے بعض کہتے ہیں کہ میخواری اور عاشقی بھی آسکتے ہیں۔

جس رسالہ میں یہ درج ہو گا وہ چونکہ حضرت اقدس واعلیٰ کے ملاحظہ میں پیش ہو گا لہذا آپ کا مشورہ ضروری خیال

کر کے تکلیف دی جاتی ہے۔

نقیر شاد۔

دیگر امرائے سلطنت سے مشورہ سخن کے سلسلے میں جو خط و کتابت ہوتی تھی ان میں سے چند ایک کی تحریریں بطور نمونہ درج کی جاتی ہیں۔

مخدمت جناب فصاحت جنگ بہادر

”میرا دیوان ”معین سخن“ جو آپ کا دیکھا ہوا ہے چھپ رہا ہے کام ختم کے قریب ہے۔ اگر آپ کا قطعہ تاریخ بھی میرے دیوان میں شریک ہو جائے تو مجھے بید مسرت ہوگی۔

مخلص معین الدولہ لہ

مکرمی جناب مولانا مولوی حافظ جلیل حسن صاحب استاد جلیل دام لطف میرے ایک دوست نے ایک غزل لکھی ہے جس کا قافیہ اور ردیف ستمگر تھے ہم جانتے ہیں، دلبر تھے ہم جانتے ہیں ہے۔ اس غزل میں ایک شعر یہ ہے

تجگو پہچانتے ہیں، ابھی طرح ہیں واقف

پھر یہ حیرت ہے کہ کیونکر تھے ہم جانتے ہیں

بندہ کی سمجھ میں اس کا مصرع ثانی نہیں آیا۔ منادم ہوتا ہے کہ آپ کے شعر

ہم تھے جانتے ہیں روز ازل سے لیکن

یہ نہیں جانتے کیونکر تھے ہم جانتے ہیں

میں رد و بدل کر کے یہ شعر بنایا گیا ہے۔ اس بے فائدہ کوشش

میں مضمون ہی ضبط ہو گیا۔ محمد لطف الدین عفی عنہ لہ

لہ۔ نواب سرآسمان جاہ کے فرزند امیر پائیگاہ تھے اچھا ذوق تھا۔ صاحب دیوان شاعر ہیں۔ لہ محمد لطف الدین جو لطف الدولہ کے نام سے شہرت رکھتے ہیں نواب خورشید جاہ بہادر کے پوتے اور امیر پائیگاہ تھے۔ اچھا مذاق سخن رکھنے کے علاوہ فن سے بڑی دل چسپی رکھتے تھے۔

حوالی قدیم

عالمجناب مخدوم بندہ حضرت استاد جلیل  
جناب والا کی دلچسپی کے لحاظ سے چند مصرعے حب معمول زائد  
موزوں کئے ہیں۔ کوئی جلدی نہیں۔ بروقت فرصت ملاحظہ ہوا  
کرے اور اصلاح خاص سے وقتاً فوقتاً مزین ہوا کرے تو  
عین نوازش ہے۔ اپنی غیر حاضری کی معافی چاہتا ہوں۔  
کمترین شاگرد      لقمان الدولہ لہ

## ۳۔ عام شاگرد

جلیل کے عام شاگردوں کے تین حلقے تھے :

۱: حضرت امیر مینائی کے شاگرد ۲: جناب مرزا داغ کے بعض شاگرد

۳: خود جلیل کے شاگرد

امیر مینائی کا حلقہ تلامذہ کافی وسیع تھا۔ ان کے وصال کے بعد اکثر جلیل ہی سے رجوع ہے۔  
اس حلقہ نے خواجہ تاشی کی حیثیت سے انھیں سے استفادہ کیا۔ مثلاً حبیب الرحمن شروانی  
شاد احمد علی خاں۔ عادی رامپور۔ قاضی سید احمد شاہ احمد رامپور۔ بشیر خیر آبادی۔  
محمد علی خاں اثر رامپور۔ منشی صفدر علی صفدر مرزا پوری اور محمد عبدالحکیم مدیر رامپوری وغیرہ  
حبیب الرحمن شروانی [صدر یار جنگ] کا ایک مکتوب اس کی وضاحت کرتا ہے۔  
د ۱۳۳۷ھ

یادگار سلف اختیار حلف جناب نواب فصاحت جنگ بہادر  
السلام علیکم دیرکاش۔ عرصہ دراز ہوا میرا کلام منشی صاحب مرحوم و  
مغفور (امیر مینائی) کے ملاحظہ سے مشرف ہوا کرتا تھا۔ میری

لہ۔ نواب لقمان الدولہ بہادر شاہی اسٹاف سرجن تھے۔ شاعری سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔  
استاد جلیل سے بہت گہری عقیدت رکھتے تھے۔

ادبی ہمسائیگی کے لحاظ سے مشہور مقولہ بادل فی تیر حسب حال تھا

نعم الفقیر علی باب الامر

ان کے بعد بعض عینق اثرات فارسی کے میدان میں آگئے۔ کچھ فارسی غزلیں موزون ہو گئیں۔۔۔ خواجہ تاشی کے تعلق سے تازہ کلام جس کی بساط صرف تین غزلیں ہیں پیش ہیں۔ نقائص جو بیت میں ہوں بے تکلف اصلاح پذیر ہوں،

نیاز مند حبیب الرحمن شروانی

## جناب مرزا داغ کے شاگرد

جیل جب حیدر آباد آئے اسی وقت مرزا داغ دہلوی استاد شاہ تھے۔ اس وقت مشاعروں کا بڑا چرچا تھا۔ انھیں شاعروں نے جیل کو ایسی معنویت بخشی کہ آپ کے متقدمین اور شاگردوں کا ایک حلقہ یہاں پیدا ہو گیا۔ داغ دہلوی کے انتقال کے بعد ان کے کچھ شاگرد جیل سے رجوع ہو گئے۔ میرے اس بیان کی تائید قاضی عبدالغفار کی اس تحریر سے ہوتی ہے جو اس وقت اخبار ”پیام“ حیدر آباد سے نکالتے تھے اور حیدر آباد کی ادبی سرگرمیوں سے بخوبی واقف تھے۔

”وہ (جیل) امیر مینائی کے بھی جانشین تھے اور استاد داغ کے بھی۔ داغ کی زبان اور بے ساختگی اور امیر مینائی کے تفکر دونوں سے جیل کی شاعرانہ فطرت نے اپنا حق حاصل کیا تھا۔ چنانچہ امیر مینائی کی جانشینی کے علاوہ داغ کے نامور شاگردوں نے بھی اپنے استاد کی جانشینی کا سہرا جیل ہی کے سر باندھا۔“ لے

حیدرآباد کے نمایاں شاگردانِ آغ میں مظفر حسین بآرق، نواب عزیز جنگ بہادر دلا۔ بخشی وارث خاں صاحب بخشی۔ وزیر علی مظفر، نواب امیر علی خاں امیر، نواب عزیز یار جنگ اور اسماعیل علی خاں عالی خورجوی وغیرہ تھے۔ شاگردی و اصلاح کے تعلق سے بخشی وارث صاحب بخشی اور استاد جلیل کے درمیان جو مراسلت ہوئی اس سے بھی میرے اس بیان پر روشنی پڑتی ہے کہ مرزا آغ کے بعض شاگرد جلیل سے رجوع ہو گئے تھے۔

”مکرمی تسلیم

ایک غزل اور ”حیات سخن“ مرسل خدمت ہے۔ بعد ملاحظہ مرحمت فرمائیے کئی غزلیں جمع ہو گئی ہیں۔ مجھے اجازت دیجئے کہ ہفتہ میں دو غزلیں آپ کے ملاحظہ کے لئے بھیجا کر دوں۔ میں مجبور ہوں کہ بغیر آپ کے ملاحظہ کے اطمینان نہیں بخشی وارث

اس خط کے جواب میں جلیل نے جو لکھا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض اُن سے مستفید ہونے کے باوجود اس کے اعلان سے گریز کرتے تھے۔

”جناب مکرم۔ تسلیم

غزل دیکھ لی گئی۔ جمع شدہ غزلوں کا دیکھنا ابھی ممکن نہیں کیوں کہ میں بالکل عذیم الفرصت ہوں۔ آپ کا کلام دیکھنے میں نہ کبھی عذر ہوا ہے نہ ہوگا مگر آپ حضرات میرا نام ظاہر کرنے میں شرماتے ہیں۔

جناب نواب عزیز یار جنگ بہادر کا دوسرا دیوان تمام و کمال میں نے دیکھا ہے۔ انہوں نے چھپوایا بھی مگر ہمیں میرے دیکھنے کا ذکر نہیں کیا۔ یہ انصاف سے بعید ہے

۵ خرداد ۱۳۳۰ھ

نیازمند  
جلیل حسن جلیل

ہمارا جہ کشن پر شاد شاد بھی پہلے مرزا داغ ہی کو اپنا کلام دکھایا کرتے تھے  
لیکن جیسا کہ لکھا جا چکا ہے ان کے بعد آخروں تک جلیل ہی سے مشورہ سخن کرتے رہے  
جلیل کے شاگرد :

سلسلہ امیری کو قائم رکھنے والے جلیل کے اپنے شاگردوں کی تعداد  
بہت زیادہ تھی جو دکن سے شمالی ہند تک پھیلے ہوئے تھے جیسا کہ محمد طفیل کی حریفی  
تفسیر سے ظاہر ہوتا ہے :

”میر کے کئی شاگرد تھے جن میں کئی نامور ہوئے۔ غالب  
کے بہت سے شاگرد تھے۔ دُور کیوں جائیں ابھی ماضی قریب  
میں داغ کے بے شمار شاگرد تھے جلیل و امیر کے بھی  
بہت سارے شاگرد تھے“

شاگردوں کے مقامات کے نام سے اس پھیلاؤ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔  
حیدر آباد۔ رام پور۔ بنارس۔ لاہور۔ لاج پور۔ بنگلور۔ بمبئی۔ خورشید۔  
بڑہان پور۔ خاندیس۔ تاسک۔ لکھنؤ۔ کاکوری۔ بدایون۔ اجیر شریف۔ مدراس۔ بہار۔  
سہسرام۔ کراچی۔ میرٹھ۔ گوالیار۔ گورکھپور۔ جالپائی۔ علی گڑھ۔ جالندھر۔ شاہجہاں پور  
بنوں۔ پشاور۔ مانچور۔ فتح پور۔ پرتابگڑھ۔ ممبئی۔ مراد آباد۔ سندیلہ۔ کانپور۔  
دہلی۔ بھاگل پور۔ بریلی۔ اور پھلی شہر وغیرہ۔

شاگردوں کی تعداد اور ان کے پتوں کا باقاعدہ ریکارڈ تھا لیکن تلف  
ہو گیا۔ تاہم جو مواد میر سے پاس ہے اس کے لحاظ سے یہ تعداد تین سو سے کم  
نہیں۔ ذکی کاوردی نے اپنی کتاب میں (۲۵) شاگردوں کے نام کا فہرست دی  
ہے۔ غلام حسن کسری لاہور کے یہاں یہ فہرست (۲۲۲) تک جاتی ہے لیکن یہ  
دونوں فہرستیں بھی مکمل نہیں ہیں۔ تلاش و جستجو سے اور بہت ناموں کا افادہ ہو سکتا

یہاں میں صرف چند قابل ذکر ناموں کے اندراج پر اکتفا کرتا ہوں۔

آفاق بنارس۔ نفیس بنگوری۔ صدق جاسی۔ غلام حسن کسری لاہور۔ صفدر نذر الہ آبادی۔ کٹن پرشاد شاد۔ تسنیم مینائی۔ عبدالرزاق راشد۔ عزیز جنگ ڈلا۔ آغا زبیر ہانپوری ہادی پھل شہری۔ معظم جاہ شجیح۔ فضا جالندھری۔ شاد عارفی۔ رکن الدین احمد دقا۔ صدیق الزماں دقا۔ حبیب اللہ دقا۔ لطف علی عارف ابو العلاء۔ کاوش بدری۔ ہوش بکری۔ تراب یار جنگ سمنہ۔ شتر خیر آبادی۔ عبدالغفور شرر بہاری۔ محمد ابراہیم عارج مانیکٹو شوق سندیلوی۔ آخر اجسیری۔ احمد علی شات۔ حکیم امام مسحر امی بنگلور اور شری شری غریز

## اصلاح کا طریقہ :

استاد شاہ ہونے کی وجہ سے جلیل بہت زیادہ مصروف رہتے تھے۔ با انہیہ شاگردوں کے کلام پر اصلاح کا کام عمر بھر جاری رہا۔ اصلاحی کام کے لئے گھر پر ہی باقاعدہ طور پر دفتر قائم تھا۔ منشی نور الدین عقیق اس کام کے لئے مقرر تھے جو شاعر بھی تھے اور شاگرد جلیل بھی۔ منشی صاحب کا کام یہ تھا کہ مقامی طور پر یا ڈاک سے آنے والے تمام خطوط وصول کریں، اصلاح لیں اور اصلاح کے کام کا باقاعدہ ریکارڈ رکھیں اصلاح کے بعد کلام واپس کرنے، استفسارات کے جواب دینے اور خط و کتابت کی تمام کاری ان پر تھی۔

ابتداء میں یقیناً جلیل اپنے قلم سے اصلاح دیتے ہوں گے لیکن میں نے جب سے ہوش سمجھا لا، سمجھی ان کو اپنے قلم سے قلم کے کلام پر اصلاح لکھتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اس وقت تک ہاتھوں میں رشتہ کی شکایت شروع ہو چکی تھی۔ لکھنے پڑھنے

لہ "النور الدین عقیق حضرت جلیل کے شاگرد و حضرت مسکین شاہ صاحب قبلہ کے مرید اور تشریح عالم باعمل تھے۔ نہایت قناعت پسند اور جبر معاش تھے۔ زندگی بہت ہی سادہ و غریبانہ مگر خود دارانہ تھی۔ جلیل کے ادبی مددگار کی حیثیت ان کی حیات تک کام کیا تھا۔ زبان کی لطافت اور نکات پر اچھی نظر تھی۔

پروفیسر سید محمد۔ علم و دانش ص ۱۴۲

کا سارا اصلاحی کام دوسروں کے ذریعہ انجام پاتا تھا۔

اصلاح دینے کے مختلف طریقے تھے۔ مقامی شاگردوں میں کچھ ایسے تھے جو خصوصیت رکھتے تھے۔ یہ اصحاب آتے اور جلیل کو فرصت ہوتی تو اپنی غزلیں خود سناتے اور جو اصلاح تجویز ہوتی اپنے قلم سے لکھ لیتے لیکن ایسے اصحاب کی تعداد بہت کم تھی۔ مقامی طور پر زیادہ تر لوگ اپنا کلام منشی عتیق کو دے جاتے ڈاک سے جتنے خطوط شاگردوں کے آتے وہ بھی منشی صاحب کی تحویل میں ہوتے اور جلیل کی اصلاح کے انتظار میں رکھے رہتے اصلاح کے اوقات صبح ۱۰ بجے سے ایک بجے تک دو گھنٹے کا وقفہ اور پھر ۳ بجے سے شام کے پانچ بجے تک۔ ان اوقات میں سب سے پہلے کلام شاہ دیکھا جاتا پھر شاگردوں کے کلام کی نوبت آتی۔

عام شاگردوں کے کلام پر اصلاح کا طریقہ یہ ہوتا کہ غزل کا ایک ایک شعر پڑھ کر سنایا جاتا۔ درست ہوتا کہتے ٹھیک ہے۔ پھر دوسرا شعر پڑھا جاتا۔ کوئی لفظ بدلنا ہو یا کوئی غلطی درست کرنی ہو تو مصرع یا شعر سن کر کچھ دیر خاموش رہتے اور پھر اصلاح کے ساتھ مصرع دہراتے یا کہتے فلاں لفظ یوں بدل دو۔ سنانے والا اصلاح کے الفاظ سرخی سے غزل پر لکھ دیتا۔ پھر دوسرے شعر کی باری آتی۔ عموماً اصلاح کم سے کم لفظوں میں دی جاتی۔ حسب ضرورت مصرع بھی بدلا جاتا۔ بعض شعروں پر وجہ اصلاح بھی لکھی جاتی۔ ناقابل اصلاح شعر قلمزد کر دیئے جاتے۔ قافیہ غلط ہو تو لکھ دیا جاتا قافیہ درست نہیں۔ اچھے اشعار پر خوصلہ افزائی کے لئے ایک یا دو ماد کی علامت (P) بنادی جاتی۔ اصلاح کے وقت حسب ذیل معائب سخن پر نظر رکھی جاتی تھی:

ناموزونیت، حرف کا گرنا، تعقیب - تعقید - غیر مانوس الفاظ، محاورہ میں تصرف، متردکات مصرعوں کی بے ربطی۔ ذم کا پہلو۔ قافیہ کا غلط استعمال۔ سست بندش۔ ابہام۔ وغیرہ۔

اصلاح کے ساتھ جہاں کہیں ضرورت ہو تو حبیہ اصلاح بھی کی جاتی یہ تو حبیہ عموماً اس نوعیت کی ہوتیں۔

مصرع نامزد دل تھا۔ بحر سے ساقط ہے۔ ایک بحر میں دوسری بحر مل گئی ہے۔  
 زحاف کا غلط استعمال ہوا۔ درست زبان یہی ہے۔ حرف کا دینا مناسب نہ تھا۔ رد و رد  
 یہاں ہے۔ شعرد لختہ ہو گیا تھا۔ شترگر بہا نقص تھا۔ دم کا پہلو تھا۔ اخذات کا درست  
 استعمال نہ تھا۔ شعر بے معنی ہے۔ معنوی نقص تھا۔ مصرع عامیانہ تھا۔ خشو کو نکال دیا گیا۔  
 بندش مست تھی وغیرہ۔

جلیل نے اپنے شاگردوں کو جو خطوط لکھے ہیں ان میں بھی اس قسم کے اشارے  
 ملتے ہیں۔ مثلاً۔

عربی ترکیب میں الف وصل کا کرنا جائز ہے۔ پرظرت کی علامت ہے اس کی  
 جگہ پہ کا استعمال شعر میں بے تکلف کیا جاسکتا ہے۔ دکھانے کی جگہ بتانا صحیح نہیں۔ واد  
 عطف آنے سے اعلان لون ناجائز ہو جاتا ہے۔ حتی الامکان فارسی عربی الفاظ کی یا نہیں  
 گرائی جاتی۔ اسی طرح سئے میں سے زائد ہے ادنیٰ یہ ہے کہ بغیر سے کہہا جائے۔ لے  
 بعض اوقات ایسے لوگ بھی اپنا کلام بھیج دیتے جو مبتدیلوں کی تعریف میں آتے۔  
 شعر ناموزوں ہوتے۔ قافیہ اور ردیف کا استعمال غلط ہوتا۔ ان کو نکھو ا دیتے۔ ابھی  
 آپ کو مشق سخن کی ضرورت ہے۔ اساتذہ کے کلام کا مطالعہ کیجئے۔ اصلاح کے لئے زیادہ  
 غزل بھیجنے والوں کو اس قسم کی ہدایت تحریر کی جاتی۔

”مجھے فرصت بہت کم ہوتی ہے۔ آپ کا کلام دیکھنے میں مجھے عذ  
 نہیں۔ تھوڑا تھوڑا کلام آنا چاہیے۔ ایک غزل سے زیادہ  
 نہ بھیجئے۔“ ۲

کلام شاہانہ پر اصلاح

کلام شاہانہ پر اصلاح کا طریقہ بطور خاص یہاں قابل ذکر ہے۔ جلیل استاد شاہ  
 ہونے کے علاوہ مصاحب خاص بھی تھے۔ صبح کے اوقات میں دوبارہ حاضری لازمی تھی۔

جب تک یہ لزوم رہا اصلاحِ سخن کا کام سرِ درباری انجام پاتا۔ یہ کلام بڑا دقت طلب اور صبر آزماتھا۔ مزاج شاہی کی افتاد کا ہر لفظ خیال رکھنا پڑتا۔ لہذا بان راسپور کے کلام پر اصلاح دینے میں امیر مینائی کو کئی دشوار مرحلوں سے گزرنا پڑتا تھا اس کا ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا۔ ممتاز علی آہ اپنی کتاب ”امیر مینائی“ میں جناب ریاضی خیر آبادی کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

”حضرت ریاضی مجھ سے بیان کرتے تھے کہ بعض بعض مرتبہ حضرت (امیر) کو ایک ایک شعر پڑ پچھلین پچھلین اصلاحیں دینا پڑی ہیں۔ نواب صاحب اصلاح پسند کرنے کے باوجود فریادی کوئی نہ کوئی بات نکال دیتے اور اس پر اصرار کرتے کہ کچھ اور ترمیم کیجئے۔ یہ (جناب امیر) بھی اپنی جان لڑا دیتے۔ یہ انھیں کا کلام تھا کہ زمین اور مضمون کی پابندی کے ساتھ ساتھ اتنی اصلاحیں دیتے اور ترمیم کرتے تھے“

(ممتاز علی آہ۔ امیر مینائی ص ۹۲)

ہم دیکھتے ہیں کہ جلیل اس مرحلے سے کامیاب گزرے۔ سرِ دربار جب کبھی طبیعت شایانہ سوزوں ہوتی اعلیٰ حضرت خود شعر پڑھتے اور اصلاح فی البدیہہ ہوتی۔ ادھر شعر سنا اور ادھر اصلاح دی۔ استاد جو اصلاح تجویز کرتے، سرکارِ خود اپنے قلم سے نوٹ فرمالتے۔ وجہ اصلاح بھی دریافت ہوتی اور سائل شاعر بھی حل ہوتے۔ یہ کام اس کلام کے سوا ہوتا جو گھر پر فرصت سے اصلاح کے لئے دیا جاتا۔

ایک عرصہ تک یہی طریقہ اصلاح جاری رہا۔ پھر جب بوجہ پیرانہ سالی دربار کی حاضری سے معافی مل گئی تو کلام گھر پر ہی آنے لگا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ راقم الحروف میں بھی شعری ذوق پیدا ہو چلا تھا اور میری دلچسپی دیکھ کر اصلاح کے وقت مجھ کو بھی ساتھ

رکھا جاتا تھا۔ ہوتا یہ تھا کہ کلام مہربند لغاذ میں چو بدارشاهی کے ذریعہ ایک روز قبل آجاتا اور اس پر اس قسم کی ہدایت لکھی ہوتی۔

جلیل صاحب۔ کل صبح ۹ بجے کلام واپس ہوتا ہے  
جلیل صاحب۔ کل اختر صاحب کے ہاتھ روانہ کرو صبح ۹ بجے  
جلیل صاحب۔ اختر صاحب کے ہاتھ آج شام کے ۵ بجے بھجواؤ  
جلیل صاحب۔ دو قطعہ تو بھجوا چکا ہیں اصلاح کے لئے۔ یہ  
بہتر ہے کہ جلد بعد اصلاح کل صبح اختر صاحب کے ہاتھ روانہ  
کر دو ایک بڑے لغاذ میں بند کر کے ۹ بجے صبح۔  
جلیل صاحب۔ بعد اصلاح اسی آدمی کے ہاتھ روانہ کرو۔  
جلیل صاحب۔ جلد اصلاح دیکر واپس کرو۔

ان ہدایات سے اس تلون نراجی کا پتہ چلتا ہے جو اصلاح کلام کے لئے رفتہ  
رفتہ کم سے کم وقت کی متقاضی ہو گئی تھی۔ چنانچہ پھر یہ معمول ہو گیا کہ کلام لانے والا  
چو بدار انتظار میں بیٹھا رہتا اور کلام لیکر واپس جاتا۔ دیر ہو جاتی تو کبھی کبھی ٹیلیفون پر  
جلد بھیجنے کی ہدایت ہوتی۔ اس دور میں اصلاح کلام کے لئے کوئی وقت مقرر نہ تھا۔  
صبح آٹھ بجے سے رات کے آٹھ بجے تک کسی وقت بھی اصلاح کے لئے کلام آ سکتا  
تھا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ایک ہی دن میں تین چار مرتبہ کلام آتا اور ہر دفعہ فوری اصلاح  
کے ساتھ کلام واپس جاتا۔ بالعموم غزلوں کی تعداد ایک سے زیادہ ہوتی جو کبھی (۸)  
غزلوں تک بھی پہنچ جاتی۔

کلام بالعموم چھوٹے چھوٹے ساغذ کی پرچیوں پر پینل سے لکھا ہوا ہوتا۔ جلد  
مرحوم اشار پڑھنے کا ہوتا کیوں کہ تحریر بے حد شکستہ اور رداں خط میں ہوتی۔ اس  
صفا پڑھنا ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی۔ صرف وہی ٹپھہ سکتا تھا جس کو پڑھنے کی  
مشق ہو چکی ہو۔ یا تو خود والد مرحوم ٹپھہ سکتے یا میرے برادر سونش احمد یا  
راقم الحروف کیوں کہ اصلاح کا کام زیادہ تر ہم دونوں کے ہاتھ ہی انجام پاتا۔  
آخری زمانے میں جب برادر کلاں مدلی احمد اثر بھی حیدر آباد آگئے تو وہ بھی

مدد دینے لگے۔ اصلاح سے قبل سب سے پہلے یہ ہوتا کہ غزل یا غزلوں کو ایک رجسٹر میں نقل کر لیا جاتا۔ اس کی دو وجہیں تھیں۔ ایک یہ کہ اصلاح کار یکار پڑ رہے۔ دوسرے یہ کہ کبھی کبھی پچھلی غزل کے شعر کے متعلق کچھ استفسار ہو جاتا۔ ایسے وقت پچھلی اصلاح کو دیکھنے کی ضرورت لاحق ہوتی۔

اصلاح کے کام کی ابتدا یوں ہوتی کہ جب تک بنیادی کام دیتی رہی جلیل خود پرچہ غزل ہاتھ میں لے کر ایک بار پڑھ جاتے یا پھر کوئی پڑھ کر سنا تا۔ وہ مصرعوں کو اپنی زبان سے دہراتے۔ درست ہوتا تو دوسرا شعر پڑھنے کو کہتے۔ اصلاح طلب ہوتا تو تھوڑی دیر غور کر کے اصلاحی لفظ تجویز کرتے۔ یہاں اس بات کا ذکر بے عمل نہ ہو گا کہ ابتداء میں جب فرصت و اطمینان سے کلام دیکھا جاتا تو غلطیاں درست کرنے کے علاوہ اشعار کے نوک پلک بھی درست کئے جاتے۔ مضمون کو بلند اور بندش کو چست کیا جاتا لیکن بعد میں جب مزاج شاہانہ میں تلون پیدا ہو گیا اور یہ احساس شدت اختیار کر گیا کہ مستند ہے میرا فرمایا ہوا۔۔۔ تو ایسی صورت میں اصلاح افتاد طبع اور مزاج شاہانہ کی نزاکت کی تالیح ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ عثمان کے پہلے دور کے اور دوسرے دور کے کلام میں زمین و آسمان کا فرق محسوس ہوتا ہے۔

غرض اصلاح کلام کے وقت اس بات کا لحاظ رکھنا پڑتا تھا کہ شعر کا مفہوم خواہ کتنا ہی سطحی ہو اس میں تبدیلی واقع نہ ہو۔ صرف قواعد و زبان کی غلطیاں درست ہو جائیں۔ اسلوب بیان اور بندش کی چستی کو صرف نظر کر دینا مناسب خیال کیا گیا۔ آداب اصلاح یہ بھی تھے کہ کلام کی اصلاح ہو جانے کے بعد مطلع سے لیکر مقطع تک ہر شعر کی تعریف شعر کے محاذی درج کی جاتی۔ تعریف کے الفاظ عموماً ایسے ہوتے:

اے۔ فکری کا کردی اپنی کتاب جلیل مانچوری میں لکھتے ہیں:۔ بادشاہوں کے کلام پر اصلاح دینا آسان کام نہیں۔ اصلاح کے وقت اصلاح سے زیادہ بادشاہ کی خوشنودی کا پورا پورا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ بادشاہ یا حاکم وقت کے مصرع کو قلمزد کر دینا یا اس کی خامیوں کو اشارتاً بھی بتانا بے ادبی سمجھی جاتی ہے۔ ص ۱۱۶



اصلاح: دہان خم مراحمی ہے چشم گریاں سے رواں سر شک کے قطرے ہوئے سنا گیا  
نادر دے شل

اصل: ہمیشہ بچا رہوں گا عذاب عیش آن کہ خاک قبر کو نسبت ہے بو تراب کے ساتھ

اصلاح: بچا رہوں گا ہمیشہ " " " " " "

صفا شعر

وائے: اگر چہ زمین مہنون نکالنے کے لیے فکر چاہتی تھی مگر سرکار نے جو سلام فرمایا  
ہے اس کی تعریف کا حقہ نہیں ہو سکتی کہ جدت مضامین و حسن بندش و ثبوت ردیف  
سب کچھ یہاں موجود ہے۔ سبحان اللہ و یا رک اللہ۔

## سکرشن پر شاد شاد

اصل: کیا مضمحل طور پر دیدار خدا ہے مونی سے کہو ہر جگہ وہ جلوہ نمایا ہے

اصلاح: " " " " " " آنکھیں ہوں تو ہر ذرہ میں

اصل: سمجھ کوئی کیا اسمیں فنا ہے کہ بقا ہے وحدت میں یہ کثرت ہے عجب شانِ خدا ہے

اصلاح: ہر پردہ نانی سے عیاں رنگ " " " " " "

اصل: واعظ گنہر عشق سے اب کرتا ہے توبہ شاید نہیں دل دے گے گنہگار ہوا ہے

اصلاح: بے وجہ یہ توبہ نہیں زاہد کی زباں پر " " " " " "

اصل: مدد لے گری شوق شہادت روانی ترک گئی تیغ رواں کی

اصلاح: " " " " " " رکاوٹ ہے ستم " " " " " "

## صدق جاشی

اصل: پھولی پھولی شکایت درد جگر کہاں سیدھی ہوتی کسی کی وہ ترچی نظر کہاں

اصلاح: " " " " " " ابھی تری " " " " " "

اصل: دل وہ کہاں وہ لذت زخم جگر کہاں سری نہ دھگیا تو رہے دردِ سر کہاں

اصلاح: " " " " " " جب رہا " " " " " "

جواب دشمنوں ملنے سے پہلے ہی پشیاں تھا

11 12 13

وہ جس دن چل بسا اک معصا گھر میں بیاباں تھا

” میدان اک ہوتا ”

اصل : سوال مدعا کرنے سے پہلے وہ سچے برہم

ایضاح: " رحم " وہ پہلے ہو گئے برہمن

اصل: ترے مجنوں کے دم سے روتی صحرانگہ آئیں

[illegible]

قسنیم عینائی

کردیا اور مجھے حسرتِ مینائی نے

تقادہ منظر کے دیا کام نہ

دم اگر تو دیا تیرے تمنائی نے

● ● ●

جھاگ کر مٹا دے شمع شب تنہائی نے

4 11 11

خط تقدیر مٹا ڈالا جسے سائی نے

///        ///        ///

اصل: ہو گئیں حسن نظر سوز سے آنکھیں خیرہ

" " "

اصل: دیکھ کھل جائے گی دنیا یہ حقیقت تیری

اصلاح: فاش ہو جائے گا سب خشن نہاں کا سید

اصل: شاہ غم میرے سپہ خانے کی ظلمت است

اصطلاح: ذکر کیا ہے مری بیماریاں و بے خوابی کا

اصل: دل ہوا کشمکش سیدہ طرازی میں تمام

اصح: سجدہ سنگ دربار کا ہوں شکر گزار

صفدر مرزا پوری

کناٹا سا اک کھٹک کے مرے دل میں رہ گیا

///        ///        ///

کھل اُٹھے پھول سبزہ جنت ہر اہل

پھولوں میں جال پیرگنی سبزہ ہوا ہوا

ہر جام گل ہے خون سے میرے سحر امیر

خون جگر سے

تجھلا کیوں نہاؤں کہ شہر گاہاں جنگیر کے مار مڑھا

2000

۱۷: آنکھوں سے دیکھ کر کوئی محفل میں رہ گیا

اصلاح: وہ دیکھ کر کنکھوں سے

اصل: تمہیں یہ وہ جو کہے تو عالم نیا ہوا

100

اصل : رنگِ حین نہ پوچھتے ساقی کے بھرما

اصل: اداسد کی یہ بھی کوئی اوسٹاک بھی شاید

صالح ہے نہ کہ بھوکے پیٹ پر

## نفس ہنگوری

اصل : ہوا ہے دفن یہاں لعل شب چراغ ابھی کہ رنگ پر ہے چراغ سہ مزار ابھی  
 اصلاح : ہوا زمانہ مگر ہے یہ داغِ دل کا اثر کہ گفتاں ہے " " " "  
 اصل : مئے الست تھی کیا تیز دندلے ساتی وہی خسار ہے اُترا نہیں خسار ابھی  
 اصلاح : " " " " وہی سرور ہے باقی وہی " " " "  
 اصل : دل عاشق کو جب سے زیادہ ناتواں پایا چھری غمزے نے رکھ دی اور ابرو نے کھیاں رکھ دی  
 اصلاح : " " " " " " " " پھینکی " " " "

## غلام حسن کسری

اصل : مزہ بیٹھے بٹھا کیوں میں سیرِ گلستاں کا ہے رشکِ گل صد برگ چاک اپنے گریباں کا  
 اصلاح : مزہ لیں کیوں نہ گھر بیٹھے ہوئے " " " " " " " "  
 اصل : محرم ہے رحم ہے کسری عیشِ الفتہ ساماں کا شگاف دامن صد چاک ہے میر گریباں کا  
 اصلاح : " " " " " " " " لطف " " " "  
 اصل : گلے میں میر بھنڈا ہے تری زلف پریشاں کا ہے زنجیرِ قدمِ حشت میں چاک اپنے گریباں کا  
 اصلاح : " " " " " " " " " " " " " "  
 اصل : نہ بھرا اس کا سخن ہے نہ بھجیہ اس کا مسکن مرے زخمِ جگر کا حال ہے چاک گریباں کا  
 اصلاح : " " " " " " " " " " " " " " میں رنگ " " " "

## فضا جالت دھری

اصل : پھول کھل جاتیں گے بھر جا کا سودا میں جب ہمارا آئے گی ہم چاک گریباں ہوں گے  
 اصلاح : چارہ گر سے یہ کپڑا بخیہ گری سے حاصل " " " " " " " "  
 اصل : میں جو گزروں گا تو بڑھ جا کا اعزاز جنوں آبلے تاجِ سرِ خار مغیلاں ہوں گے  
 اصلاح : دشت گردی میں می ہوگی فرزندِ شاہِ جوں " " " " " " " "

اصلاح کے سلسلے میں غلام حسن کسریٰ منہاس نے ”اصلاحات جلیل مائیکپوری“ کے عنوان سے ایک سیر حاصل مضمون ”نقوش“ کے صفحات پر قلم بند کیا ہے۔ اس میں انہوں نے نہ صرف بہت سے شاگردان جلیل کے کلام پر جلیل کی اصلاحیں یکجا کی ہیں بلکہ وجہ اصلاح پر بھی بڑی معنی خیز روشنی ڈالی ہے ان میں سے چند نمونے درج ذیل ہیں۔

## کشن پر شاد شاد

اصل: حقیقت ہے یہ جور باغیاں کی کوٹری شاخ میرے آشیاں کی  
 اصلاح: جفا کیا دل شکن تھی ” ” ”  
 توجیہ: شعرا نے جگہ خوب ہے: زور بیان کی کمی تھی۔ استاد نے مصرع ادلیٰ میں دشکن کا لفظ تجویز کر کے شاخ کوٹرنے کی جو مناسبت قائم کی ہے اس کی داد کچھ اہل ذوق ہی دے سکتے ہیں۔ شعریں اب زور بیاں کا لطف بھی قائم ہو گیا۔

## قدرت نواز جنگ قدرت

اصل: سابقہ تجکو پڑا ہو گا نہ دیوانے سے کیا سمجھ جاؤں گا نا صحت سے سمجھا سے  
 اصلاح: تو ہے دیوانہ الجھتا ہے جو ” ” ”  
 توجیہ: دوسرا مصرع لا جواب ہے۔ مصرع ادلیٰ اس کے مقابلہ میں ہلکا ہے استاد جلیل نے ایک بے نظیر مصرع  
 ۵ تو ہے دیوانہ الجھتا ہے جو دیوانے سے تجویز فرمایا ہے۔ جو ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر سکتا ہے۔

## صدیق الزماں وفا مینائی

اصل: سک بہار حسن کا دل پر بھٹا گئی صورت تمھاری صورت یوسف دکھا گئی  
 اصلاح: آنکھوں میں رنگ خواب زلیخا جا گئی ” ” ”  
 توجیہ: خوب مطلع ہے لیکن استاد نے مصرع ادلیٰ بدل کر اسے خوشتر کر دیا۔ اب حسن یوسف

کی رعایت سے یہ شعر استادانہ ہو گیا۔ صورتِ لوصف کے ساتھ خوابِ زلیخا کی ترمیم کرتی بر محل اور مناسب ہے۔

## راجہ محبوبؔ راج

اصل: آنکھوں میں چُھپا رکھنا اُسے دل میں بٹھانا ملتا مجھے لے کاش جو بت مدِ نظر تھا  
 اصلاح: آنکھوں میں چُھپا کر اُسے رکھنا میں نظر سے  
 توجیہ: مدعا یہ ہے کہ وہ بُتِ بومارِ مقصود نظر ہے اگر لُ جلتے تو جی چاہتا ہے کہ  
 اُسے اپنے سے چُھپا رکھیں یعنی آنکھوں میں چُھپالیں اور نظر دل سے بھی مخفی رکھیں۔  
 اب یہ شعر خوبوں سے مالا مال ہے۔

## صفدر مرزا پوری

اصل: ادا سمجھ کے وہ دامن سے منہ چھپاتے ہیں حجاب ہے جو یہی تو حجاب کیا ہوگا  
 اصلاح: آنچل  
 توجیہ: آنچل دوپٹے کے پلو یا کنارہ کو کہتے ہیں۔ اور دامن آنچل یا انگر کھے کا وہ حصہ  
 ہے جو لٹکتا رہتا ہے اس لئے دونوں کا فرق ظاہر ہے۔ دامن کو آنچل سے بدل کر  
 جلیں نے جو حسن پیدا کیا ہے اسے وہی جانتے ہیں جن پر ایسا وقت گزر چکا ہے۔  
 ڈاکٹر ذکی کا کوردی نے بھی اصلاحاتِ جلیں کی توجیہ بہت خوب کی ہے۔ اس کے چند  
 نمونے بھی ملاحظہ ہوں۔

## فہرست تلامذہ

۱. آدم - سید آدم علی - مشرقی خاندین
۲. آرزو - شرف عالم - میرٹھ
۳. آصف - میر محبوب علی خان - سلطان دکن
۴. آزاد - آزاد افغانی - بمبئی
۵. آغاز - سید غایت علی - برہان پور
۶. آفاق - غلام حسین خاں - بنارس
۷. اثر - خواجہ حسن - حیدرآباد
۸. اثر - صدیق احمد خلف جلیل - حیدرآباد
۹. اثر - عبدالواحد - اجیر
۱۰. اثر - محمد علی خاں - رامپور
۱۱. احمد - احمد علی شاہ حافظ - حیدرآباد
۱۲. احمد - شاہ احمد اللہ - اورنگ آباد
۱۳. احمد - قاضی سید احمد شاہ - رامپور
۱۴. احمد - قاضی سید احمد - حیدرآباد
۱۵. اختر - بدر الدین - خاندین
۱۶. اختر - میر محبوب علی - آگرہ
۱۷. اختر - محمد ایوب - ناسک
۱۸. اختر - ذاب شیر جنگ - راج گڑھ
۱۹. اخلاق - ہاشم علی خاں - بنارس
۲۰. ارباب - محمد ارباب - بنارس
۲۱. اسد - ذاب اسد یار الدولہ - حیدرآباد
۲۲. اشرف - محمد حبیب اللہ - رنگون
۲۳. اصول - اصول صاحب - حیدرآباد
۲۴. اظہر - قاری محمد اظہر - امرتسر
۲۵. اعجاز - ملک دکن - حیدرآباد
۲۶. اقبال - حکیم سید سلیمان پیرزادہ - ناسک
۲۷. الفت - جماعت علی شاہ - حیدرآباد
۲۸. امامی - حکیم امام السحر - بنگلور
۲۹. امجد - محمد امجد علی - ہتم پورس حیدرآباد
۳۰. انصار - حکیم شاہ انصار حسین - الہ آباد
۳۱. انور - محمود احمد غنیان - حیدرآباد
۳۲. انوری - تقی حیدر - ساکڑہ
۳۳. اوسط - اشفاق حسین - انبار
۳۴. ایان - نذیر احمد - فتحپور
۳۵. باسط - محمد عبدالباسط - بھوپال
۳۶. باسط - باسط علی خاں - حیدرآباد
۳۷. باقی - بنی راجہ - حیدرآباد
۳۸. بدر - عبدالسلام وکیل - بیدر
۳۹. بدر - محمد ابراہیم خاں - رامپور
۴۰. بدر - بدر الحسن - بدایوں
۴۱. بترقی - احمد حسین - مدراس
۴۲. بترسم - عبداللہ خاں - بنارس

۲۳. بتمل. امین الحسن شش نج. حیدرآباد  
 ۲۴. بشارت. صاحبزادہ بشارت جاہ. حیدرآباد  
 ۲۵. بہار. منوہر لال. حیدرآباد  
 ۲۶. بنجود. محمد نصیر الدین. مدراس  
 ۲۷. تدبیر. محمد عبدالحکیم. رامپور  
 ۲۸. تدبیر. محمد عبدالحکیم. رامپور  
 ۲۹. تقی. صاحبزادہ تقی جاہ. حیدرآباد  
 ۵۰. تلذ. قاضی تلذ حسین. حیدرآباد  
 ۵۱. توقیر. صوفی عبدالحفیظ. حیدرآباد  
 ۵۲. جاوید. ناری یعقوب قاسم رنگون  
 ۵۳. جاوید. الیاس احمد مینائی (نبرہ شیرانی)  
 ۵۴. جعفر. محمد خاں کراچی  
 ۵۵. جمیل. سید تراب علی. حیدرآباد  
 ۵۶. جمیل. حافظ جمیل الدین. حیدرآباد  
 ۵۷. جنید احمد (نبرہ جلیلی). حیدرآباد  
 ۵۸. چشتی. شاہ ولی اللہ حسینی. حیدرآباد  
 ۵۹. حبیب. حبیب اللہ. مدراس  
 ۶۰. حزیں. حزیں صاحب. لاہور  
 ۶۱. حسرت. حبیب الرحمن شروانی. شروان  
 ۶۲. حسام. حسام الدین مینائی. جلیپور  
 ۶۳. حسن. سید شاہ حسن. حیدرآباد  
 ۶۴. حسن. ڈاکٹر حسن الدین احمد. حیدرآباد  
 ۶۵. حشر. سید وجیہ الدین. سہرام  
 ۶۶. حشمت. صاحبزادہ حشمت جاہ. حیدرآباد  
 ۶۷. حقیظ. خواجہ محمد حفیظ الدین. حیدرآباد  
 ۶۸. حکیم. شبہ الحکیم. گوالیار  
 ۶۹. حکیم. مرزا امیر بیگ. کولار (میو)  
 ۷۰. حکم. ذاب صادق جنگ. حیدرآباد  
 ۷۱. حمید. عبدالحکیم. میرٹھ  
 ۷۲. حیا. صفی ہمایوں مرزا. حیدرآباد  
 ۷۳. حناطر. دستگیر نواز جنگ. حیدرآباد  
 ۷۴. خالد. ادریس مینائی (نبرہ شیرانی)  
 ۷۵. خالق. محمد خالق خاں. گورکھپور  
 ۷۶. خاور. عبدالحکیم. فتح پور  
 ۷۷. خسرو. ذاب حسن نواز جنگ. کاکورہ  
 ۷۸. خلیل. خلیل الرحمن. حیدرآباد  
 ۷۹. خجتر. عبد الستار. حیدرآباد  
 ۸۰. فقیر. رضاء الدین. کاکورہ  
 ۸۱. دادود. داود احمد ایڈوکیٹ. پرتابگڑھ  
 ۸۲. ڈاکٹر. ڈاکٹر عبد الرحمن. اوزنگ آباد  
 ۸۳. ذوق. عبد العزیز. سہرام  
 ۸۴. راز. قدرت احمد. حیدرآباد  
 ۸۵. راشد. عبدالرزاق. حیدرآباد  
 ۸۶. راشد. مفتی راشد. بنوں  
 ۸۷. رحمت. رحمت علی. حیدرآباد  
 ۸۸. رحمت. رحمت اللہ. حیدرآباد  
 ۸۹. رحیم. عبد الرحیم. حیدرآباد  
 ۹۰. رستم. محمد رستم. سککٹ

۹۱. رضا. کریم اللہ خاں. حیدرآباد  
 ۹۲. رفوی. تقی حیدر. ساکوره  
 ۹۳. زعد. محمد صدیق خاں. جوپور  
 ۹۴. روشن. منوہر لال. شاہجہاں پور  
 ۹۵. رونق. علی حسن. حیدرآباد  
 ۹۶. زبیر. زبیر علی خاں جاگیردار. حیدرآباد  
 ۹۷. ریاض. ریاض علی دکیل. حیدرآباد  
 ۹۸. زبیر. زبیر خاں قادری. میسور  
 ۹۹. زخم. نسیاز اللہ شاہ. حیدرآباد  
 ۱۰۰. زخم. محمد ثناء اللہ خاں. الہ آباد  
 ۱۰۱. ساقی. زہر راج. حیدرآباد  
 ۱۰۲. ساقی. زاہد علی. بنارس  
 ۱۰۳. ساغر. ساغر سندیلوی. سندید  
 ۱۰۴. ستار. ستار حسین. بہار  
 ۱۰۵. ستار. حکیم ابو عبدالستار. بانس پٹی  
 ۱۰۶. سحر. ریاض الحسن. مانکپور  
 ۱۰۷. سراج. میر سراج الدین علی خاں. حیدرآباد  
 ۱۰۸. سزار. سید شاہ سحلی عالم. حیدرآباد  
 ۱۰۹. سیر. عباس کامیری. بہار  
 ۱۱۰. سعاد. صاحبزادہ سعادت جاہ. حیدرآباد  
 ۱۱۱. سلطانہ. نالبعہ سلطانہ. حیدرآباد  
 ۱۱۲. سعید. حکیم ابو سعید. مانکپور  
 ۱۱۳. شاد. احمد علی تحصیلدار. حیدرآباد  
 ۱۱۴. شاد. بہاراجہ شین پرشاد. حیدرآباد  
 ۱۱۵. شاد. احمد علی خاں عارفی. رامپور  
 ۱۱۶. شائق. اشتیاق احمد. بنارس  
 ۱۱۷. شاکر. محمد غضنفر علی آئند (اکاٹ)  
 ۱۱۸. شامی. اکبر حسین. مراد آباد  
 ۱۱۹. شایب. شباب برہانپوری. برہان پور  
 ۱۲۰. شیعہ. پرنس معظم جاہ بہادر. حیدرآباد  
 ۱۲۱. شرر. عبدالغفور شرر. نکھو  
 ۱۲۲. شرر. صاحبزادہ مصطفیٰ علی خاں. رامپور  
 ۱۲۳. شرق. ابوالشرف مجددی. مدینہ منورہ  
 ۱۲۴. شریف. شریف احمد. مانکپور  
 ۱۲۵. شوق. محمد عبدالعلی. سندید  
 ۱۲۶. شوق. عبدالحمید خاں. حیدرآباد  
 ۱۲۷. شیدا. عبدالشکور. فتح پور  
 ۱۲۸. شیدا. محمد امین. مانکپور  
 ۱۲۹. شیدا. عبدالحمید میونسپل کمشنر. سہرام  
 ۱۳۰. شایبہ. علی احمد. کانپور  
 ۱۳۱. شایبہ. پیرزادہ صابر علی. اجیر شریف  
 ۱۳۲. صا. غلام علی. مدراس  
 ۱۳۳. صبر. نظام الدین. حیدرآباد  
 ۱۳۴. صدق. تصدق حسین. جالندھ  
 ۱۳۵. صحیح. سید یعقوب. ارکاٹ  
 ۱۳۶. صفدر. منشی صفدر علی. مرزا پور  
 ۱۳۷. صفدر. صفدر حسین. بنارس  
 ۱۳۸. صغیر. محمد جاہ چھوٹائی. پنجاب

۱۳۹. صلابت. نواب صلابت جیاه جیاداب  
 ۱۴۰. صمیم. سید یعقوب. آسمور  
 ۱۴۱. ضیفم. عبداللہ خاں. حیدرآباد  
 ۱۴۲. طائب. محمد حنیف مؤتمہ. الہ آباد  
 ۱۴۳. طائب. جان محمد. لاہور  
 ۱۴۴. طائب. محمد حنیف مالیکادول  
 ۱۴۵. طاہر. ابو طاہر. رامپور  
 ۱۴۶. ظافر. عبدالرحیم. سکتہ  
 ۱۴۷. ظہیر. ظہیر الدین. حیدرآباد  
 ۱۴۸. عابد. زین العابدین قاضی. حیدرآباد  
 ۱۴۹. عادل. ریاست علی. ادرنگ آباد  
 ۱۵۰. عادل. مولوی محمد عادل. حیدرآباد  
 ۱۵۱. عاتج. محمد ابراہیم. مالیکادول  
 ۱۵۲. عاتر. میرطف علی ابو العالی جیاداب  
 ۱۵۳. عاصی. سید عبدالرزاق. حیدرآباد  
 ۱۵۴. عالم. شاہ سحیحی سردار ادرنگ آباد  
 ۱۵۵. عالم. محمد عالم. سکتہ  
 ۱۵۶. عالی. اسمعیل علی خاں. خورجہ  
 ۱۵۷. عالی. رشید الدین خاں. حیدرآباد  
 ۱۵۸. عالی. راجہ نرسنگ راج. حیدرآباد  
 ۱۵۹. عالی. ابوالنصر منہاج الدین بہلہ  
 ۱۶۰. عبد. عبداللہ حسین. مدراس  
 ۱۶۱. عتیق. سید انوار الدین. حیدرآباد  
 ۱۶۲. عثمان. بہر عثمان علیخان دلی کن جیاداب  
 ۱۶۳. عروج. ابوالحامد حفیظ الدین. بکترگر شریف  
 ۱۶۴. عزیز. عزیز احمد جلیلی (خلف جلیلی) حیدرآباد  
 ۱۶۵. عیش. مجتہد الدین. بدایوں  
 ۱۶۶. عظمت. سید عظمت اللہ تحصیلدار جیاداب  
 ۱۶۷. عظمت. سید عبدالرؤف. حیدرآباد  
 ۱۶۸. علی. علی احمد جلیلی (خلف جلیلی) حیدرآباد  
 ۱۶۹. عنصر. محمد حفیظ الدین. حیدرآباد  
 ۱۷۰. غازی. معین الدین. حیدرآباد  
 ۱۷۱. فائق. بشیر احمد. حیدرآباد  
 ۱۷۲. فرخ. صفدر علی. پشاور  
 ۱۷۳. فرخندہ. میر فرخندہ علی بہنوار  
 ۱۷۴. قضا. فضا جالندھری. جالندھر  
 ۱۷۵. فیاض. محمد فیاض الدین خاں. حیدرآباد  
 ۱۷۶. فہیم. محمد نصیر. مالیکادول  
 ۱۷۷. قادہ. محمد قطب الحسن. بانس برہلی  
 ۱۷۸. قاری. خواجہ قطب الدین. حیدرآباد  
 ۱۷۹. قائم. عبدالخالق. لونا  
 ۱۸۰. قدر. نواب قدرت نواز جنگ. حیدرآباد  
 ۱۸۱. قدر. سید نور الرسول. حیدرآباد  
 ۱۸۲. قمر. قمر النساء. حیدرآباد  
 ۱۸۳. قیصر. سید ابوالحسن. حیدرآباد  
 ۱۸۴. کاظم. نواب کاظم جیاه صاحبزادہ جیاداب  
 ۱۸۵. کریم. شیخ عبدالکریم. حیدرآباد  
 ۱۸۶. کسری. غلام حسین کسری منہاس بہلہ

۱۸۷. کلیم۔ امین احمد خلیف جلیل۔ حیدرآباد  
 ۱۸۸. کلیم۔ مرزا امیر بیگ۔ کوٹلار  
 ۱۸۹. گوثر۔ سید اشفاق حسین  
 ۱۹۰. گوثر۔ حکیم محمد سلطان۔ مانچور  
 ۱۹۱. لائی۔ سید شاہ علی محمد حسینی۔ حیدرآباد  
 ۱۹۲. لطف۔ نواب لطف الدولہ۔ حیدرآباد  
 ۱۹۳. لطف۔ عبداللطیف۔ پشاور  
 ۱۹۴. لقمان۔ نواب لقمان الدولہ۔ حیدرآباد  
 ۱۹۵. مائل۔ محمد حسین۔ حیدرآباد  
 ۱۹۶. مائل۔ محمد عادل۔ اورنگ آباد  
 ۱۹۷. محبوب۔ راجہ محبوب راج۔ حیدرآباد  
 ۱۹۸. محشر۔ خواجہ محشر۔ حیدرآباد  
 ۱۹۹. محمود۔ میر محمود علی۔ حیدرآباد  
 ۲۰۰. مستخر۔ شاہ کفایت حسین نانڈکائی  
 ۲۰۱. مستود۔ مسعود حسن۔ مانچور  
 ۲۰۲. مشاق۔ شاق احمد جلی (خلیف جلیل)۔ حیدرآباد  
 ۲۰۳. مظفر۔ میر وزیر علی۔ حیدرآباد  
 ۲۰۴. مظفر۔ محمد مظفر الدین۔ حیدرآباد  
 ۲۰۵. معین۔ نواب معین الدولہ۔ حیدرآباد  
 ۲۰۶. مقید۔ مرزا محمد نادر علی۔ حیدرآباد  
 ۲۰۷. منظور۔ نواب منظور جنگ۔ حیدرآباد  
 ۲۰۸. منور۔ حبیب اللہ۔ مدراس  
 ۲۰۹. منیر۔ ملیر احسن۔ مانچور  
 ۲۱۰. منیر۔ محمد منیر۔ پونا  
 ۲۱۱. مودود۔ مودود احمد۔ اتر دہلی  
 ۲۱۲. مولنس۔ مولنس احمد (خلیف جلیل)۔ حیدرآباد  
 ۲۱۳. مولنس۔ محمد عبد الحفیظ خاں۔ رامپور  
 ۲۱۴. مہر۔ مہر شان خاں۔ رامپور  
 ۲۱۵. ناصر۔ منشی ناصر علی۔ میرٹھ  
 ۲۱۶. ناصر۔ ناصر الدین۔ میرٹھ  
 ۲۱۷. ناصر۔ ناصر جنگ۔ حیدرآباد  
 ۲۱۸. ناظم۔ میر بشارت علی۔ حیدرآباد  
 ۲۱۹. نثار۔ نثار احمد (نیرہ جلیل)۔ حیدرآباد  
 ۲۲۰. نجم۔ عبد الحکیم گتہ دار۔ رامپور  
 ۲۲۱. نجیب۔ نواب نجیب الدین خاں۔ حیدرآباد  
 ۲۲۲. نجیب۔ رشید احمد۔ لاہور  
 ۲۲۳. نذیر۔ مرزا نذیر حسین۔ بنگلور  
 ۲۲۴. نشتر۔ حافظ غریب اللہ خاں  
 ۲۲۵. نصیر۔ نواب نصیر الدین خاں۔ حیدرآباد  
 ۲۲۶. نصیر۔ نواب نذیر الدین خاں۔ حیدرآباد  
 ۲۲۷. نفیس۔ محمد یوسف۔ بنگلور  
 ۲۲۸. نواز۔ نواز شمسین۔ حیدرآباد  
 ۲۲۹. نواز۔ مظفر علی۔ حیدرآباد  
 ۲۳۰. نور۔ نور الحسن سوداگر۔ ناگپور  
 ۲۳۱. نوری۔ نور اللہ محمد۔ حیدرآباد  
 ۲۳۲. نہال۔ نہال احمد (خلیف جلیل)۔ حیدرآباد  
 ۲۳۳. نیر۔ حکیم محمد یوسف۔ پیر (حیدرآباد)  
 ۲۳۴. نیر۔ ابوالفیض قاضی سراج الدین رامپور

۲۵۹. وللا. لواب عزیز جنگ بہادر حیدر آباد  
 ۲۶۰. ولب. لواب. لواب باب. حیدر آباد  
 ۲۶۱. بابی. سید محمد ہادی. مچھلی شہری  
 ۲۶۲. ہاشم. صاحبزادہ لواب ہاشم جاہ. حیدر آباد  
 ۲۶۳. ہمت. لواب ہمت علی خاں. حیدر آباد  
 ۲۶۴. ہنر. سعید احمد. بہار  
 ۲۶۵. ہوش. ہوشیار جنگ. حیدر آباد  
 ۲۶۶. ہوش. مناظر الحسن. حیدر آباد  
 ۲۶۷. ہاشم. مجید العالم. بھگلپور  
 ۲۶۸. یاد. شیخ یاد علی. حیدر آباد  
 ۲۶۹. لگانہ. لگانہ قریشی. لکھنؤ  
 ۲۷۰. یوسف. یوسف علی. حیدر آباد

۲۳۵. تیر. سید زاہد حسین. حیدر آباد  
 ۲۳۶. واصل. عبدالواحد خاں. رامپور  
 ۲۳۷. واصل. واحد علی. حیدر آباد  
 ۲۳۸. واصل. واحد علی سب رحیم دار. حیدر آباد  
 ۲۳۹. واصل. واصل دار. حیدر آباد  
 ۲۴۰. واقف. داؤد علی خاں. حیدر آباد  
 ۲۴۱. واقف. حکیم امتیاز حسین خاں. حیدر آباد  
 ۲۴۲. وقار. واقف علی شاہ. حیدر آباد  
 ۲۴۳. وقار. عبدالوحید. میرٹھ  
 ۲۴۴. وزیر. محمد وزیر. حیدر آباد  
 ۲۴۵. وحی. وحی احمد (بیرو جیل) حیدر آباد  
 ۲۴۶. وقار. محمد عمر خاں. جاگیر دار حیدر آباد  
 ۲۴۷. وقار. حبیب اللہ. حیدر آباد  
 ۲۴۸. وقار. رکن الدین احمد. حیدر آباد  
 ۲۴۹. وقار. صدیق الزماں نیرو امیر نیالی حیدر آباد  
 ۲۵۰. وقار. نور الحسن. رامپور  
 ۲۵۱. وقار. ماسٹر عبدالغفور. حیدر آباد  
 ۲۵۲. وقار. سید محمد سجاد علی. مروہی  
 ۱۵۳. وقار. نور الحسن یادگار خاں. رامپور  
 ۱۵۴. وطن. مولوی سید حسن. حیدر آباد  
 ۱۵۵. وقار. وزیر احمد حیدر آباد  
 ۱۵۶. وقار. محمد اسماعیل  
 ۱۵۷. وقار. وقار الدین. حیدر آباد  
 ۱۵۸. کوئل. سید عنایت حسین

### نوٹ :-

پچھلے صفحات میں جیسا کہ اظہار کیا  
 جا چکا ہے، یہ فہرست پوسٹل طور پر  
 مکمل نہیں کیوں کہ ایسے اصحاب کی  
 بھی کمی رہتی ہیں جن سے جناب جلیل سے  
 گہرے مراسم تھے اور وہ بالمشافہ اپنا  
 کلام مساجلتے تھے۔ ان کے علاوہ اسے  
 امرائے دولت بھی تھے جو مشورۂ سخن کرنے  
 کے باوجود اپنے نام کا اظہار نہیں چاہتے  
 تھے۔

تصنیفات و تالیفات

## دواوین

جلیل کی باتیات تین دیوان تاج سخن، جان سخن اور روح سخن ہیں۔ یہ تینوں دیوان اپنے رنگ و آہنگ میں قدرے مختلف ہیں کیوں کہ ان کا تعلق جلیل کے تین ادوار شاعری سے ہے۔ پہلا دور ان کی شاعری کا قیام رامپور کے زمانے کا ہے، جب ان پر امیر مسلط تھے۔ دوسرے دور پر درباری شاعری کے اثرات ہیں۔ آخری دوران کی وفات تک کی شاعری کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اردو شعور ارب، انقلابی رجحانات سے متصادم ہو رہا تھا۔

### تاج سخن

پہلا ڈیشن: ۱۹۱۰ء حیدرآباد دوسرا ڈیشن ۱۹۳۲ء لکھنؤ

غزلوں کی تعداد: ۳۲۷ تعداد اشعار: ۵۷۰۰

جلیل کی شاعری کا پہلا دور مانیکپور اور رامپور کی شاعری سے شروع ہو کر تاج سخن (دیوان اول) کی اشاعت (۱۹۱۰ء) پر ختم ہوتا ہے۔ تاج سخن حیدرآباد میں چھپ کر منظر عام پر آیا اس وقت لڑاکا میر محبوب علی خاں آصف دہلوی دکن کا دور حکومت تھا اور جلیل مانیکپوری، جلیل القدر کے لقب سے مفتخر ہو کر

مرزا داغ کی جگہ استاد شاہ ہو چکے تھے۔ چنانچہ اس دیوان اول کی غزلوں میں وہ مدحیہ قصیدہ بھی درج ہے جو اس سرفرازی کے موقع پر شاہ بارگاہ میں اگر رانا گیا تھا۔ غزلوں کے آخری صفحہ پر ایک حصہ سفر جس کے تحت منتخب اشعار کی ایک بڑی تعداد درج ہے۔ آخری پر ہندوستان کے مشاہیر اور ہمعصر شعراء کے تاریخی قطعات ہیں جو داغ اشاعت پر موزوں کئے گئے ہیں۔

## جان سُخن

پہلا ڈیشن ۱۹۱۶ء امیر مطابق حیدر آباد دوسرا ڈیشن ۱۹۳۲ء  
غزلوں کی تعداد ۲۲۳ جملہ تعداد اشعار :

جان سُخن جو جلیل کا دوسرا دیوان ہے تاج سُخن پہلے دیوان کی ازاد صرف [۶] سال بعد ہی دکن سے شائع ہوا۔ اس میں ۱۹۰۰ء سے لیکر کے عرصہ میں کہی ہوئی تمام غزلیں ہیں۔ یہ دیوان پہلے دیوان کے مقابلہ میں غزلوں اور اشعار کی تعداد بھی کم ہے۔ جان سُخن جلیل کے دوسرے کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس وقت تک جلیل استاد شاہ بن کر دکن میں مستحضر اختیار کر چکے تھے۔ میر عثمان علی خاں آصف سابع کا دور حکومت تھا کا آغاز شاہ عثمان کی مدح میں موزوں کئے ہوئے ایک قصیدہ سے ان کی تخت نشینی کے وقت بارگاہ سلطانی میں گزرا نا گیا تھا۔ غزلیات کے حصہ مدحیہ نظموں اور تہنیتی قطعات کے لیے مختص کیا گیا ہے۔ اختتام مشاہیر شعراء کے تاریخی قطعات ہیں جو دیوان کی اشاعت و طباعت سے پہلے اس دیوان کی غیر معمولی مقبولیت ہوئی چنانچہ دوسرا ڈیشن ۱۹۳۲ء سے شائع ہوا۔

## روح سُخن

غیر مطبوعہ قلمی دیوان • ضخامت ۳۰ صفحات • غزلوں کی تعداد

جان سخن دیوان دوم کی اشاعت کے بعد سے جلیں کی وفات یعنی (۳۱) سال تک کا سلاطین روح سخن کی ترتیب میں آتا ہے۔ اس میں غزلیات کا سرمایہ دوسرے دور سے زیادہ ہے۔ یہ دیوان اگرچہ جلیں کی زندگی میں ترتیب دیا گیا تھا لیکن شائع نہ ہو سکا۔ پچھلے دواویں کی طرح اس کی ترتیب بھی ردیف دار ہے یعنی حروف تہجی کے لزوم کی روایت و قدامت کو قائم رکھا ہے۔ یہ غیر مطبوعہ دیوان تمام و کمال علمی دیوان کی صورت میں راقم الحروف کے پاس محفوظ ہے۔

اس غیر مطبوعہ روح سخن کا ایک مختصر انتخاب ۱۹۵۵ء میں بمبئی کے مطبع اے۔ نوائی اینڈ سنسز نے شائع کیا۔ کراؤں سائز میں چھپی ہوئی یہ کتاب (۱۶۰) صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے مراتب برادر مشتاق جلیں اور راقم الحروف تھے۔ اس کا دیباچہ علی سردار جعفری نے لکھا ہے اور تعارف مشتاق جلیں کا ہے۔ بعد ازاں روح سخن کی کچھ اور غزلیں روح سخن کے ایک اور انتخاب کائنات جلیں میں شامل ہوئیں۔ اس میں ایک سو سے زیادہ غیر مطبوعہ غزلیں ہیں۔ باقی ہنوز غیر مطبوعہ ہیں۔ غیر مطبوعہ اس معنی میں کہ دیوان کی صورت میں شائع نہیں ہوئیں ورنہ مختلف ادبی رسائل میں چیدہ چیدہ طور پر بہت ساری غزلیں چھپ چکی ہیں۔

سطور بالا میں جلیں کے تین دواویں کا صوری جائزہ لیا گیا ہے۔ جہاں تک ان دواویں کے تنقیدی جائزہ کا سوال ہے اس کا تفصیلی تجزیہ جلیں کی غزلیہ شاعری کے تحت کیا گیا ہے۔ نعتیہ شاعری اور مدحیہ شاعری کے علاوہ ابواب ہیں۔

۱۔ کائنات جلیں کی طاعت ترقی اردو بیورو دہلی کی جانب سے ہوئی ہے۔ اس بیورو کے پبلیکیشنز ڈیویژن نے یہ کام اپنے ذمہ لیا اور اس طرح جلیں مانکپوری کے سلاطین منتخب شعری مجموعہ ۱۹۸۵ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ اس میں جلیں مانکپوری کی تین سو سے زائد منتخب غزلیں ہیں جو تاج سخن، جان سخن اور روح سخن کا مجموعہ ہیں۔ تینوں دواویں کا انتخاب علاوہ علاوہ دیا گیا ہے۔ (۳۵۰) صفحات پر مشتمل اس شعری مجموعہ کی ترتیب کا کام راقم الحروف سے لیا گیا ہے۔

## تذکیر و تانیث

جلیل کی پہلی نثری تالیف تذکیر و تانیث (۱۹۰۸ء) ہے۔ ترک وطن کر کے حیدر آباد آنے کے ۸ سال بعد یہ کتاب حیدر آباد کے مطبع اختر دکن سے شائع ہوئی۔ اس وقت تک استاد شاہ مرزا داغ کا انتقال ہو چکا تھا اور میر محبوب علی خاں آصف سادات نے ابھی تک کسی اور سے مشورہ سخن نہیں کیا تھا۔ البتہ شاہ آصف کے عنایت و الطاف کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ اس موقع کو غنیمت جان کر جلیل حسن جلیل نے نظام کی خدمت میں یہ تحفہ لغت پیش کیا اور جلیل القدر کا لقب پایا۔ جلیل نے زبان کے سلسلے میں زبان کی جو خدمت انجام دی ہے ان میں یہ تالیف سب سے اہم ہے۔  
 ڈیپائی سائز پر چھپی ہوئی یہ کتاب (۳۶۸) صفحات پر مشتمل ہے۔ اس تخلیق کی اہمیت اس آثر سے ظاہر ہوتی ہے کہ اس کا دیباچہ مولانا عبدالحلیم شدر کا تحریر کیا ہوا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں۔

”حافظ جلیل حسن جلیل نے اس قیمتی کتاب کے ذریعہ زبان اردو میں تذکیر و تانیث کا ایک فتاویٰ مدون کیا ہے۔ جو اردو کی عظیم الشان خدمت ہے۔ . . . اردو میں سب سے بڑا جھگڑا یہی تذکیر و تانیث کا ہے جس کے لیے باوجود کوششوں کے کسی قسم کے قواعد نہیں منضبط ہو سکے۔ اردو میں دشواری یہ ہے کہ ہر شہر اور قریہ تک میں تذکیر و تانیث کے اعتبار سے بڑا اختلاف ہے۔ بے شک دہلی اور لکھنؤ کی زبان معیار قرار پائی ہے مگر ایسی کوئی مفید مستند کتاب جس کے ورق اٹھا کر معلوم کر لیا جاسکے کہ اہل زبان کے نزدیک کون لفظ مذکر اور کون مؤنث ہے۔ اختلافات سے زیادہ باہمی غلط فہمیاں بھی ہیں۔ میرے خیال میں یہ کتاب ان تمام خرابیوں کو دور کرے گی۔“



کرتی ہے۔ دیگر لغات کی طرح یہاں معانی و مطالب لکھنا اس تالیف کے دائرہ کار میں تھا ہی نہیں۔ یہ ضرورت تو ضخیم لغات سے پوری ہو سکتی ہے اور ایسے لغات کی کمی نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ تذکر و تانیث کے مسائل کے لیے یہ کتاب کس قدر مفید و کارآمد ہے اور اس نقطہ نظر سے اس کی افادیت مسلم ہے۔ باوجود اس کے جہاں مولف نے ضرورت محسوس کی ہے وہاں معنی دینے سے گریز نہیں کیا ہے۔ ان میں ایسے الفاظ کی کثرت ہے جو عام فہم نہیں۔ مثلاً

عمود: ستون۔ مذکر: عاج: ہاتھی دانت۔ مذکر: دریا کا چڑھاؤ۔  
ہمد: گہوارہ۔ مذکر: کشنیز: دھنیا۔ مذکر: ووطہ: گرداب۔ مونث۔  
جلیل نے دیباچہ کے علاوہ ”ذو ایک ضروری باتیں“ کے تحت کتاب کے مطالعہ کے تعلق سے نہایت ہی کارآمد نوٹ دیا ہے۔ مثلاً

۱: حروفِ تنجی کی تذکر و تانیث میں حضرت امیر کے فیصلہ پر عمل کیا گیا ہے کہ جن حروف کا تلفظ اُردو کے بے، تے کے وزن پر ہے وہ مونث ہیں اور باقی مذکر۔ ط اور ظ اس سے مستثنیٰ ہیں۔

۲: عربی لفظ جو مونث مشتمل ہے اگر بقا علہ عربی جمع ہو تو اس کو جمع ذکر بلوتے ہیں جیسے (دلیل) دلائل قائم کئے گئے، منازل (منزل) طے کئے گئے وغیرہ۔

۳: اسم کے مطابق فعل کا مذکر یا مونث ہونا معمول ہے جیسے کتاب لکھی، خط لکھا لیکن حسب مفعول کے ساتھ علامت مفعول آجاتی ہے تو فعل مذکر ہی آتا ہے۔

ع: ایک ذرا شاخ نشین کو بھکارہنے دے

۴: محاورہ میں جہاں مصدر پورا نہیں آتا وہاں اسم کی مطابقت لازم ہوتی ہے جیسے بات کر نہیں آتی قتل کر نہیں آتا۔

وہ خصوصیات جھول نے اس کتاب کی افادیت بہت بڑھادی ہے مختصراً حسب ذیل ہیں۔

۱. لغت قائم کر کے ہر لفظ کے ساتھ شعر دیا گیا ہے اور ایسے شعر کا انتخاب کیا گیا ہے جس کی ردیف یا قافیہ مذکر یا تانیث کو ثابت کرتا ہے مثلاً۔

آسائش ہونٹ<sup>۱</sup> عدم کے جانے والو سنتے جاؤ یہ آسائش اس منزل میں ہوگی  
 کرامات ہونٹ<sup>۲</sup> فخر کرتا تھا عجب کوہکنی پر فریاد معجزہ عشق کا تھا اس کی کرامت بھی  
 ۲۔ جن لفظوں کے ساتھ شعر نہیں دیے جاسکے ان کا استعمال نثر یعنی فقر و  
 تبادیا ہے مثلاً

سباحۂ مذکر۔ فقرہ : آج دیر تک سباحۂ رہا۔

تصغیر ہونٹ۔ فقرہ : کنیز کی تصغیر کنیزک ہے۔

۳۔ ایک لفظ کے اگر کئی معنی ہیں اور تذکیر و تانیث میں فرق نہیں ہے تو ایک

ہی معنی کے ضمن میں لکھ دیا ہے کہ سب معنوں میں مذکر ہے یا مونث مثلاً

بحر ہر معنی میں ہونٹ ہے۔ (شعری بحر) ۷

امیر اب کہاں شعر گوئی میں کاہل

رہی ہے تو اک بحر کاہل رہی ہے

(سمندر) ۷ دیکھ کر عشاق کی چشم پر آب پانی پانی بحیرہ اعظم ہو گیا  
 داد۔ ہر معنی میں ہونٹ ہے۔

(علی)۔ سالک بس شکایت کیا مری فریاد کی داد دیجے اپنی ہی بیداد کی

(تعریف)۔ ہونٹ ہر صف میں ہر سہ میں مدافعی ڈائی ہوئے علی تو داد وہ دیتے لڑائی کی

۴۔ مختلف فیہ الفاظ کی صورت میں مراحت کر دی گئی ہے۔ دلی اور لکھنؤ کے

اختلاف کی وضاحت کے ساتھ اپنی رائے بھی شامل کی ہے مثلاً۔

طرز۔ مختلف فیہ۔ مذکر شل نے سینہ میں پڑ جائیں گے چھید آبلبل

نہ اڑا طرز مری زمرہ آرائی کا (تجر)

مونٹ زلف کی مانند کنگن نے ترے بیداد کی

طرز ہے شاگردیں بھی ٹھیک ٹھیک استاد کی (استیر)

نوٹ :- اب زیادہ تر تانیث مستعمل ہے۔ (جلیل)

لقاب۔ مختلف فیہ۔ مذکر منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں

زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے رخ رکھلا (غالب)

مونث۔ دیکھے غیر تمہیں اور ہم تمہیں دیکھیں ہماری آنکھ کا پردہ کرو نقاب اپنی  
لوٹ، اب زیادہ تر تائیت مستعمل ہے۔ (متحر)

۵۔ مالا۔ مختلف فیہ۔ دلی میں مونث بولتے ہیں اور اہل لکھنؤ کے کلام میں مذکر پایا جاتا ہے۔  
قلم تراش۔ مختلف فیہ۔ دلی میں مونث بولتے ہیں اور لکھنؤ میں دونوں طرح سنا ہے۔  
۵۔ دلی اور لکھنؤ سے قطع نظر جہاں عوام کے استعمال کا تعلق ہے اس کی دھا  
کر دی گئی ہے مثلاً

سطح، مونث۔ بعض لوگوں نے اس کو مذکر بھی لکھا ہے مگر زبانوں پر مونث ہی ہے۔  
۶۔ تحقیق و تلاش کا یہ عالم ہے کہ اگر کسی استاد سخن نے مسلمہ تذکیر و تائیت  
سے اختلاف کیا ہے تو اس کو سند کے طور پر نہیں لیا ہے بلکہ اس اجتہاد کا الزام  
انہیں کے سر رکھا ہے مثلاً  
تمکین، مونث۔ مصحفی

آتا ہے یہ جی میں کہ کروں عرض تمنا لیکن تری تمکین اجازت نہیں دیتی  
خواجہ آتش نے خلاف جمہور مذکر بھی کہا ہے۔

جلیل کی استنادی خصوصیت کے پیش نظر ان کی رائے معلوم کرنے اور سند  
حاصل کرنے کے لیے ہندوستان کے مختلف مقامات سے استفسارات انہیں وصول  
ہوتے تھے۔ اس کا اندازہ ان خطوط سے ہوتا ہے جو جلیل نے وقتاً فوقتاً اپنے  
شاگردوں احباب اور معاصرین کو ان کے استفسارات کے جواب میں لکھے مثال کے  
طور پر چند خطوط کے اقتباسات یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

ایک شاگرد محمد یوسف نفیس کو ان کے ایک استفسار کے جواب میں لکھتے ہیں:  
”قامت اور بہشت تذکیر و تائیت میں مختلف فیہ ہیں۔

دونوں صورتیں درست ہیں ترجیح مذکر کو ہے“ اے

ریاض خیر آبادی کو ایک مکتوب میں موٹر کی تذکیر و تائیت پر یوں توجہ دلاتے ہیں،

معلوم ہوا ہے کہ موٹر کو آپ نے مذکر باندھا ہے اور یہ مصرع کہا ہے  
 ”موٹر اتنے فنن اتنے کہ نہ ہو چکا شمار“

”دکن میں علی العموم مونٹ بولتے ہیں اور ہماری زبان پر بھی مونٹ ہے۔  
 شمالی ہند میں مذکر قرار پا گیا ہے تو براہ کرم اس سے مطلع کیجئے۔ قرینہ  
 تو مونٹ ہی کا ہے۔ کیوں کہ تمام سواریاں مونٹ ہی بولی جاتی ہیں  
 فنن کو مذکر کہنا ہماری زبان کے خلاف ہے۔ بہر حال جہور کا جو  
 استعمال ہوا اس سے آگاہ فرمائیے۔“

حفیظ الدین عفر نے غالب کے ایک شعر کے حوالے سے دریافت کیا تھا کہ  
 نذر کرنا کے ساتھ نذر کا استعمال تذکیر کے ساتھ ہے یا تانیث کے ساتھ۔ جواب  
 میں لکھا گیا:

”نذر فی نفسہ مونٹ ہے جیسے نذر گزرائی گئی۔ نذر قبول ہوئی  
 اور نیاز کے معنی میں بھی نذر مونٹ ہے جیسے نذر مانی گئی آج  
 پیران پیر کی نذر ہے لیکن پیش کرنے اور دینے کے معنی میں  
 اس کا استعمال تذکیر کے ساتھ ہوتا ہے۔“

غالب کے اس شعر میں۔

غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں  
 حج کا ثواب نذر کر دل کا حضور کی

”نذر پیش کرنے کے معنی میں جو مونٹ کہا ہے زبان کے خلاف ہے۔“

ایک اور استفسار کے جواب میں تذکیر و تانیث کا مسئلہ یوں حل کیا ہے:

”آپ کا استفسار ہے کہ میں نے عرض کیا ہے صحیح ہے یا

میں نے عرض کی۔ عرض فی نفسہ مونٹ ہے جیسے میری عرض ہے۔“

ایک عرض بھی قبول نہ ہوئی۔ جیسے مستور کے اس شعر سے ظاہر ہوتا

ٹھک گئے آپ سے کہتے کہتے ایک بھی عرض پذیرانہ ہوئی  
لیکن عرض کرنا کہنا کے معنی میں مذکر ہے۔ جیسے  
آپ کی بات تو ہے نقش نگینِ دل پر میں نے کیا عرض کیا تھا مجھے کچھ یاد نہیں  
لہذا میں نے عرض کیا صحیح ہے البتہ

محمد اعظم استادِ اردو جامعہ عثمانیہ تذکیر و تانیث کی ایک بحث کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

”ایک دفعہ [حضرت جلیل سے] اثنائے گفتگو میں الفاظ

کی تذکیر و تانیث کی بحث چھڑ گئی۔ میں نے پوچھا کہ حضرت

عربی و فارسی کے وہ الفاظ جو بصیغہ واحد مونث ہوں بصیغہ

جمع میں کس طرح استعمال ہوں گے۔ فرمانے لگے اس

بارے میں مجھ سے اور مولانا حالی مرحوم سے بہت عرصہ قبل

بڑی بحث رہی۔ مولانا کا خیال تھا کہ اس کا کوئی قاعدہ کلیہ

مقرر نہیں ہے مگر میں نے شعرائے سلف کے کلام سے ثابت

کیا تھا کہ جب کبھی عربی و فارسی کے الفاظ بصیغہ جمع استعمال

کئے جاتے تو خود واحد کی صورت میں وہ مذکر ہوں یا مونث

بصیغہ جمع وہ ہمیشہ مذکر بولے جاتے گے بشرطیکہ یہ جمع عربی

یا فارسی ترکیب پر بنائی ہوئی ہو مثلاً خصوصیت بصیغہ واحد

مونث ہے لیکن یہ صیغہ جمع مذکر استعمال ہوگی مثلاً انیس

کی خصوصیات۔ پھر اپنے اس دعویٰ کی تائید میں متعدد اشعار

دلی و کھنؤ کے سنائے۔“ ۱

ان مثالوں سے ڈاکٹر ڈنگی کا کوروی نے یہ نتیجہ نکالا ہے:

”جلیل زبان اور لغت پر گہری نظر رکھنے کے باوجود ہمیشہ

مزید تحقیق و تلاش میں سرگرداں رہتے تھے اور اپنی رائے

کو بغیر تحقیق حرف آخر نہیں سمجھتے تھے۔ یہی نہیں وہ جمہور کی رائے نئی تحقیق و فیصلہ کی اہمیت سے بھی بخوبی واقف تھے۔

”تذکرہ تانیث“ جیسی بلند پایہ تالیف کا صرف ایک ہی ایڈیشن نکل سکا جس کو (۸۰) سال ہو چکے ہیں۔ حیات کے دوران جلیلی کو یہ خیال ہوا تھا کہ اسے دوبارہ شائع کیا جائے چنانچہ انھوں نے نظر ثانی کر کے ترمیم و اضافہ کا کام بھی شروع کیا تھا لیکن یہ کام ادھورا ہی رہا۔ دوسرا ایڈیشن شائع نہیں ہوا۔

## معیار اُردو

”معیار اُردو“ تذکرہ تانیث کے سلسلے کی ہی ایک کڑی ہے جو ۱۹۲۲ء میں حیدر آباد دکن میں شائع ہوئی۔ [۱۷۲] صفحات پستہ شمل ڈیجی سائز کی یہ مختصر اور اہم کتاب زبان اُردو کے محاورات کا لغت ہے اس اختصار کے متعلق خود مولف نے ابتدائی صفحات میں یوں لکھا ہے۔

اردو زبان بہت وسیع ہے۔ سب محاورات کا احصا اس

کتاب میں کہاں ممکن تھا۔ جو روزمرہ میری زبان پر تھا اور

جو خیال کرنے سے ذہن میں آیا اس کو قلم بند کر دیا۔

یہ مختصر تالیف ”ہرچہ بقامت کثر بقیمت بہتر“ کی مصداق ہے۔

دیباچہ اس کتاب کا قاضی تلذ حسین رکن شعبہ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ

حیدر آباد دکن نے لکھا ہے اور بڑی علمیت و قابلیت کے ساتھ لکھا ہے۔ پیرائے بیان

سلیس اور نفیس ہے۔ یہ دیباچہ پڑھنے کی چیز ہے۔ اتنا تفصیل اور مکمل ہے کہ اس

کو پڑھ کر کتاب کی افادیت، اپنی پوری جامعیت و خصوصیات کے ساتھ آنکھوں کے

سامنے آجاتی ہے۔ قاضی صاحب نے معیار اُردو کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے اور جو نکات



بدماغ ہیں۔ بد مزاج ہیں = مغرور ہیں

بات پہلے باندھنا۔ بات گرہ میں باندھنا : یاد رکھنا

خدا سے مل گئے۔ خدا کے پاس گئے۔ خدا کے گھر گئے = مر گئے

باتیں بکھارتے ہیں۔ باتیں باتے ہیں۔ باتیں چھانٹتے ہیں : چرب زبانی کرتے ہیں

۲۔ ایک نازک مرحلہ محاورہ اور مثل میں امتیاز کرنا ہوتا ہے۔ اس تفریق کیلئے

بہت بڑی اجتہاد کی ضرورت ہے اور یہ ایسے شخص سے ممکن ہے جس کا اجتہاد ہمہ درجہ مسلم و مستند سمجھا جائے۔

۳۔ محاورات نصریف کے متحمل نہیں ہوتے۔ اگر تعریف ہوتی بھی ہے تو بہت شاذ۔ لیکن اس ذرا سی تعریف میں معنی بدل جاتے ہیں مثلاً۔

بیل منڈھے چڑھنا : کام لپڑا ہونا بیل منڈھے چڑھے : اولاد بڑھے۔

کروٹ لینا : سپلو بدلنا کروٹ بھی نہ لی : توصیہ نہ کی پر دانہ کی

فاسخ پڑھنا : ایصال ثواب کرنا فاسخ پڑھو : چھوڑو۔ ہاتھ اٹھاؤ

قدم لقمہ چلتے ہیں : پیروی کرتے ہیں قدم بہ قدم گیا : مساوی ہیں۔

۳۔ جہاں کوئی محاورہ تھوڑی تبدیلی کے ساتھ دو طرح استعمال ہوتا ہے وہاں نیا

مستعملہ رائج محاورے کو اصل قرار دے کر دوسرے کا ذکر تشریح میں کر دیا ہے مثلاً،

اٹنی چھری سے حلال کرتے ہیں : سخت بے رندی کرتے ہیں۔ کند چھری بھی کہتے ہیں۔

پانی پی پی کے کو سنا : ہر وقت کو سنا۔ پانی پی پی کے دُعا دینا بھی کہتے ہیں۔

ڈھول کے اندر پول = ظاہر بہت کچھ باطن چھپ۔ پول کی جگہ خول بھی بولتے ہیں۔

ایک بات ہزار منہ = ہر شخص چیرا کرتا ہے۔ ایک منہ ہزار باتیں بھی کہتے ہیں۔

۴۔ بسا اوقات ایک لفظ کے تغیر سے جو بظاہر قریب المعنی ہوتا ہے محاورہ کا

مفہوم کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ بظاہر سیدھے سادے الفاظ ہوتے ہیں مگر محاورہ

کا صحت کے ساتھ سمجھنا اور سمجھانا بجائے خود ایک دشوار کام ہے مگر دیکھتے

جلیل کس سلاست روی کے ساتھ ان مرحلوں سے گزر جاتے ہیں ان کا ذہن کس

طرح مفہوم تک پہنچتا ہے۔ مثلاً

باگ اٹھادی = گھوڑے کو تیز کر دیا۔ باگ چھوڑی = آزادی دیدی  
 باگ سوڑی = بیان کا رخ بدل دیا

۵۔ محاورات اگرچہ الفاظ منفردہ ہیں مگر مفہوم کے اعتبار سے ان کا حال بھی تقریباً الفاظ منفردہ ہی جیسا ہے۔ محاورات کے مفہوم کی تہہ تک پہنچنے اور اس کی تشریح کے لیے بالعموم بہت زیادہ الفاظ درکار ہوتے ہیں لیکن جلیل کا کمال ہے کہ تشریح میں ایسے مختصر اور جامع الفاظ استعمال کئے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ تشریحی الفاظ میں ہدایت یہ رکھی ہے کہ وہ خود محاورے کے اجزا معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً

آنکھیں سینکتے ہیں = نظارہ کرتے ہیں۔ گنبد کی آواز = جو کہو گے وہی سونگے  
 خشک کھاؤ = چل دو۔ دال نہیں گلتی = بس نہیں چلتا۔

زمین پر پاؤں نہیں رکھتے = بہت مغرور ہیں۔ کس کھیت کی ہولی ہو = کیا حقیقت  
 ۶۔ جہاں جن محاورات کی مزید تشریح کی ضرورت تھی وہاں محل استعمال ایسا بتایا ہے کہ مفہوم خود بخود واضح ہو گیا ہے۔ مثلاً

قارورہ ملا ہوا ہے = بد لوگوں کی نسبت کہتے ہیں۔ حلق میں کانٹے لٹکے = سخت تنگی کی جگہ کہتے ہیں  
 بھر مار کر دی = کثرت کی جگہ کہتے ہیں۔ چڑی چاؤڈھڑی نہ جاکے = بخیل کی نسبت جاتے ہیں  
 ۷۔ اس کتاب ”معیار اردو“ میں وہ محاورے بھی شامل ہیں جن میں عورتوں اور

مردوں کے درمیان امتیاز ہے یعنی ایسے محاورے جو عورتوں کی زبان پر نہیں اور انھیں کے لیے مخصوص ہیں، یا ایسے عورتوں کے محاورے جنہیں مرد بھی استعمال کر سکتے ہیں یا ایسے محاورے جن میں مردوں اور عورتوں کے استعمال میں قدرے فرق ہے۔ ایسے تمام محاورات کے ساتھ جلیل کی نئی تلی وضاحت بڑا لطف پیدا کرتی ہے۔ مثلاً

جلایا ہے = رشک ہے۔ بیشتر عورتیں بولتی ہیں۔  
 آنکھیں پھٹیں = ایک طرح کی قسم ہے۔ زیادہ عورتیں بولتی ہیں۔  
 ارواح نہیں بھرتی = نیت نہیں بھرتی۔ عورتوں کی زباں۔  
 کانا پھوسی = کان میں باتیں۔ عورتیں کانا باتی بھی کہتی ہیں۔

۸۔ ایسے محاورات جن کے معنی و مفہوم اور استعمال میں دہلی و کھنؤ کا اختلاف ہے ان کا وضاحت بھی اس لغت کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ مثلاً  
 بکھرنا : منتشر ہونا۔ دہلی میں پھیلنے کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔  
 بوڑھی عید : چیس گئے چاند کی عید۔ دہلی میں کہتے ہیں۔

مختصر یہ کہ اردو کے کئی لغت یوں تو شائع ہو چکے ہیں ان میں بھی محاورات کا احاطہ کیا گیا ہے لیکن تحقیق کے سلسلے میں محاورات کی تلاش میں بڑی دقت ہوتی ہے اس لئے ضرورت ایسی کتاب کی تھی کہ محاوروں تک آسانی سے رسائی ممکن ہو۔ یہ کتاب اسی ضرورت کے تحت لکھی گئی ہے۔ اردو میں کوئی دوسری کتاب شاید ہی ایسی ہو جس سے اس سہولت اس صحت اور اس قدر کم دقت میں غرض پوری ہو سکے۔

## اردو کا عروض

جلیل کی نثری تعنیفات میں ”اردو کا عروض“ بطور خاص قابل ذکر ہے۔  
 [۵۶] صفحات پر مشتمل یہ ایک رسالہ ہے جو سنہ ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا۔ اس تالیف کی غرض و غایت کے بارے میں ابتداء میں لکھتے ہیں۔

اور ضرورت بھی پوری ہو جائے۔ چنانچہ یہ رسالہ میں نے انھیں کے لیے اور انھیں کی خواہش کے مطابق لکھا ہے۔

اس سلسلے میں جیل نے علم عروض سے عدم دلچسپی کی ایک وجہ یہ بتلائی ہے کہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ شاعر کے لئے محض سوز و دل طبع ہونا کافی ہے۔ عروضیات سے واقفیت ضروری نہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب شاعر مختلف اوزان میں طبع آزمائی کرتا ہے تو کبھی اس کو ایسی بحر سے بھی سابقہ پڑتا ہے جو اس پریشان گردیتی ہے۔ اس موقع پر بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ عروض سے مدد لی جائے۔ علاوہ ازیں شاعری کے تسلسل و ترنم کو برقرار رکھنے میں عروض جو کام کرتا ہے اس کو نظر نہیں کیا جاسکتا۔

دوسرا سبب جو اس سے بھی زیادہ اہم ہے وہ ہمارے اہل علم عروضی ہیں جنہوں نے بہت ساری اصطلاحیں بلا ضرورت بنائی ہیں اور عربی دقاری کی تقلید میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا ہے مگر اس انداز سے کہ اس پر خاص دھیان دینے کے باوجود پڑھنے والے کو بجز دردِ سر اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

مانا کہ اردو بحر عربی دقاری سے ماخوذ ہیں لیکن کیا ضرورت کہ اردو زبان کے لسانی پہلو اور اس کے مزاج کو نظر انداز کر کے تقلیدی رویہ کو ترجیح دی جائے عروض کی بیشتر کتابیں جو لکھی گئی ہیں اسی رُحان کا آئینہ ہیں۔ اس سلسلے کی ایک اہم کوشش سید حیدر علی طباطبائی کی بھی ہے۔ ان کا عروضی رسالہ تلخیص عروض و قافیہ کے نام سے ۱۹۲۴ء میں چھپا تھا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہ رسالہ جگہ جگہ غیر ضروری مباحث اور عربی عروض کے حوالوں سے بھرا پڑا ہے۔ اکثر مقامات پر عربی کے مقابلہ میں اردو دقاری والوں کے طریقہ استعمال کو ناجائز قرار دیا ہے۔ چنانچہ مولوی عبدالحق نے اس رسالہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

” مولانا طباطبائی کا یہ فرمانا بجا ہے کہ شعر اردو میں عربی اور ذیل  
کا متبع ہوتا ہے لیکن یہی چیز ہے جس نے اردو شعر کی شیرینی  
کو ختم کر دیا ہے۔۔۔۔۔ اردو سے زیادہ یہ رسالہ عربی  
عروض کا رسالہ کہا جاسکتا ہے؟

اس اعتبار سے جلیل کا اردو کا عروض، مولوی عبدالحق کے نظریے کے  
عین مطابق ہے۔ اپنی میں مولف نے جس سہل انگاری کے ساتھ اردو کے لیے شہیر  
فردی ثکات عروض سے صرف نظر کرتے ہوئے جس قابل فہم انداز میں مستعمل بحر و  
سے متعارف کرانے کی کوشش کی ہے اس کا اندازہ اس رسالہ کا مطالعہ کرنے والا  
ہی کر سکتا ہے۔

اردو کا عروض کی قابل ذکر خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ وہی بحر کی گئی ہیں جو اردو زبان کے مذاق اور اردو شاعری کی سر زمین پر جاری  
ہیں۔ اسی وجہ سے اس کا نام اردو کا عروض رکھا گیا۔

اردو کی کل اصلی بحر (۱۹) ہیں اور چونکہ اکثر بحروں کے تحت کئی بحر یا کئی  
ہیں اس اعتبار سے جملہ بحر مستعملہ اردو کی تعداد (۳۷) ہے۔ ان میں سے جلیل  
نے اپنے اس رسالہ میں صرف (۱۲) بحر دی کا ذکر کیا ہے جو اردو میں مستعمل ہیں۔

۲۔ ہر بحر کے ارکان کے ساتھ ساتھ اشعار بھی دے دیئے ہیں جن سے بحر کے وزن  
کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے مثلاً۔

بحر مستقارب

فعلون	فعلون	فعلون	فعلون
فعلون	فعلون	فعلون	فعلون
فعلون	فعلون	فعلون	فعلون
فعلون	فعلون	فعلون	فعلون

بحر متدارک

فعلن	فعلن	فعلن	فعلن
فعلن	فعلن	فعلن	فعلن
فعلن	فعلن	فعلن	فعلن
فعلن	فعلن	فعلن	فعلن

## بحر ہزج

مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن  
جل اٹھتا ہے جو یہ پلو تو وہ پلو لگے

مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن  
کیا بے سبب ہیں ہم کو شہ پر سو بولے تھے

## بحر مضارع

مفعول فاعل لاتن مفعول فاعل لاتن ؟  
چلے چین میں نرگس بیار ہو گئی ہے

مفعول فاعل لاتن مفعول فاعل لاتن  
آنکھ اس کو کھولنی بھی دشوار ہو گئی ہے

۳. ایک ہی وزن میں جہاں کئی صورتیں پیدا ہوتی ہیں تو ان کو مثالوں کے ساتھ  
درج کر کے بتا دیا ہے کہ یہ بحر کی ایک ہی شکل کو غلط ملط کرنا جائز و درست ہے  
مثلاً۔ بحر مل شش رکعی

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن

چاند کو داغ لگا جاتا ہے

چاندنی میں جو وہ آ جاتا ہے

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن

نرم فصل سے زیادہ وہ ہاتھ

صاف فصل سے زیادہ وہ ہاتھ

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن

بھر کے اشک آنکھ میں پی جا گئے

جام ساقی سے جو مانگا تو کہا

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن

ساقیا منہ سے لگا جام شرب

تا کجالب پہ رے نام شرب

۴. کم اور زیادہ استعمال ہونے کے لحاظ سے بحروں کے مدارج قائم کر دیئے  
گئے ہیں کیوں کہ لطف سخن میں بحر کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ مثلاً درجہ اول میں یہ چار بحر  
ہیں جو بہت مستعمل ہیں۔

بحر نمبر ۱۔ ادا سے دیکھ لو جاتا رہے گلہ دل کا

بحر مل نمبر ۲۔ منزل آخر ہوئی فریاد جس باقی ہے

بحر مضارع نمبر ۳۔ یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں

بحر ہزج نمبر ۴۔ ان شوخ خیالوں پہ جو مال نہیں ہوتا

۵۔ ہر بحر کے تحت مزاحف بحروں سے بھی متعارف کروایا ہے۔ نیز اشعار کی قطع کر کے اصول متعین کئے گئے ہیں۔

۶۔ رباعی، شتوی اور مستزاد کے لئے علیحدہ باب قائم کر کے ان کے اوزان اور ارکان مثالوں کے ساتھ بتائے گئے ہیں۔ مثلاً

رباعی کی (۲۴)، بحروں میں صون (۱۲) بحر میں تحریر میں لائی گئی ہیں اس لوٹ کے ساتھ کہ اردو میں صون (۱۳) اوزان مستعمل ہیں۔

شتوی کی خصوصیات بحروں کی تعداد (۷) بتائی ہے ان میں تین کو ادبیت دی ہے۔

نمونہ فعلوں فعل فعل فعل فعل فعل فعل فعل فعل فعل فعل

مفعول مفعول مفعول مفعول مفعول مفعول مفعول مفعول مفعول مفعول

مفاعیلین مفاعیلین مفعولن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن

اس طرح یہ رسالہ جلیل کی عروض، فتوحات کا آئینہ دار ہے جسے مولف

نے بڑے قابل فہم انداز میں لکھا ہے اور عربی و فارسی کے غیر ضروری نکات عربی

سے گریز کرتے ہوئے صرف رائج و مستعمل بحروں کا احاطہ کیا گیا ہے یہ تالیف

ایک طرف جلیل کے عروض پر کامل دستگاہ اور پوری جہارت کا ثبوت فراہم کرتی

ہے تو دوسری طرف جلیل کے نظریئے شاعری کا اعلان کرتی ہے کہ شاعری کا احاطہ

عروض کے مطالعہ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔

ڈاکٹر ذکی کا کہی کے الفاظ میں،

”جلیل نے عروضی شکلات کے پیش نظر اوزاد والوں کے لیے

بہت آسان اور عام فہم انداز میں عروض اور اردو میں مستعمل

بحروں کو اس کتاب میں بیان کیا ہے اور مثالیں دے کر سمجھایا

ہے۔ فن عروض سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب

مفید ہے۔

(جلیل مایکوری۔ ص ۲۲۸)

## سوانح امیر مینائی

جلیل کی نثری تصانیف میں ”سوانح امیر مینائی“ بہت وقیع و معتبر ہے۔ یوں تو حضرت امیر کی ادب بھی کئی سوانح عمریاں لکھی جا چکی ہیں لیکن جلیل کی اس تالیف کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے راسخ و آئے کے بعد سے جناب امیر کی وفات تک وہ اپنے استاد کے ساتھ رہے اور بہت قریب رہے۔ اس یکجائی میں ان کو دیکھنے سُننے ان کے ساتھ کام کرنے اور لطف صحبت اٹھانے کا بھرپور موقع ملا۔ بنا کر سوا بھوپال اور حیدرآباد کے سفر میں ہمراہ رہے۔ اس طرح امیر مینائی کے عادات و اطوار مشاغل اور سیرت و کردار کے پہلو جس کا اُصول نے پچشم خورد مطالعہ و مشاہدہ کیا من و عن لکھ دیا اور اپنی طرف سے کوئی حاشیہ آرائی نہیں کی اپنی مصلحت کی نمائش میں زور تسلیم صرف نہیں کیا جیسا کہ اختراہ جنگ اختر مینائی کے دیا چہ کی اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے۔

”اس سوانح عمری میں جلیل القند ثواب فصاحت جنگ بہادر جلیل نے نہایت سادہ طور پر اپنے استاد حضرت والدی ماحدی امیر مینائی کے فضل و کمال کو اور ان کے کلام کی نثر کو ظاہر کیا ہے۔ کہیں کہیں شاعری کی موٹا گائیوں اور اپنی واقفیت کے اظہار کی کوشش نہیں کی۔ نہ کسی شاعر پر رائے زنی کی نہ کسی کے کلام سے موازنہ کیا۔“ لے

۱۔ اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے آگے یوں رقمطراز ہیں:

”جناب جلیل کا ملک پر بڑا احسان ہے کہ انھوں نے یہ کتاب لکھ کر حجابات اٹھا دیئے ہیں جس سے فطرت امیر کی ملائک

فریب تصویر اور ان کے فضائل و کمالات کا مریخ آنکھوں  
کے سامنے پھر گیا۔

اختر مینائی نے اپنے (۲۰) صفحہ کے طویل دیباچہ میں امیر مینائی کے فضل و کمال  
ہی کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اس طرح یہ دیباچہ روایتی دیباچہ سے انحراف کرتا ہے  
کیوں کہ حیات کے مختلف پہلوؤں سے قطع نظر زیادہ حصہ امیر کے کلام کے طویل طویل  
اور انتخاب کلام سے بھرپڑا ہے جس کی ضرورت نہ تھی۔

دیباچہ کے بعد کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ حالات زندگی پر  
مشتمل ہے جس کے لیے صرف (۸۰) صفحات مختص کئے گئے ہیں۔ حیات کے ساتھ کلام  
امیر کا بھی جائزہ لیا ہے اور قدیم لکڑی قائم رکھی ہے۔ دوسرے حصہ کا عنوان کارناما  
امیر مینائی ہے۔ سب ٹائٹل پر یہ عبارت درج ہے۔

حضرت امیر مینائی کے تصانیف کا انتخاب اور اس پر لکھو

انتخاب کافی طویل ہے۔ اس میں تینوں دواوین ”مرآۃ الغیب“، ”ضمائم عشق“ اور ”محمد  
خاتم النبیین“ کا علمدہ علامہ احاطہ کیا ہے۔ درمیان میں کہیں کہیں کسی شعری تشریح و  
تعریف بھی ہے۔ آخری صفحات نعتیہ و مدحیہ قصائد اور داسوخت کے لیے مختص ہیں۔  
سوانح کا سنہ اشاعت ۱۹۲۸ء ہے۔ مطبع سیدی دارالشفاحیدر آباد میں چھپی ہے۔  
صفحات (۲۳۶) صفحات۔

اختر مینائی کے دیباچہ کا سب سے قابل ذکر حصہ وہ ہے جہاں انھوں نے  
داغ و امیر کے ایک دوسرے سے اثر قبول کرنے کے بارے میں بحث پھیر دی  
ہے۔ بظاہر انہوں نے امیر کی شاعری پر کئے جانے والے اس اعتراض کا جواب دیا  
ہے کہ امیر نے اپنی بعد کی شاعری میں داغ کا رنگ اختیار کیا۔ اس مسئلہ کو چھیڑتے  
ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

”بعض لوگ کہتے ہیں کہ امیر کے دیوان دم کا جو رنگ ہے

وہ پہلے دیوان کا نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ قرار دیتے ہیں

کہ دربار اسپور میں اجتماع شعرا ہونے سے پہلی دہائی

سافر نکھو والوں پر پڑا اور حضرت امیر نے داغ کارنگ  
 اختیار کیا۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہے بلکہ واقعہ اس کے برعکس  
 ہے اور وہ یہ ہے کہ دربار رامپور میں بعد از اب غلام  
 آسٹیاں نکھو کے شعرا بکثرت تھے۔ امیر، امیر، جلال  
 بحر، نق، مزیر، ذکی، وردج، تسلیم، شرت، جان ماب  
 وغیرہ اور دہلی کے مرث فصیح الملک داغ تھے خصوصاً  
 حضرت امیر کی صحبت سے جناب داغ نے منفذہ فائدہ  
 اٹھایا۔ زبان کی صفائی، کلام کی چستی اسی کا نتیجہ ہے جس پر  
 امیر کی شہرت و مقبولیت ان کے دیوان اول ہی سے ہو چکی  
 تھی۔ اس کے بعد کوئی ضرورت مجبور کر سکتی تھی کہ امیر اپنا  
 لہر سخن چھوڑ کر داغ کارنگ اختیار کرتے؟ لے

امیر کے حالات زندگی کے تعلق سے اگرچہ جلیق نے تفصیل سے کام نہیں لیا  
 ہے تاہم مختصر حالات زندگی میں بھی امیر کے فائدان، تعلیم و تربیت، سلوک و  
 درویشی، میرت و کردار، امیر سے تلمذ، واد علی شاہ کے یہاں باریابی، انزعاع  
 سلطنت اودھ، رامپور کی ادبی فضا، مقامی اور بیرونی شاعرین کا اجتماع اور سفر  
 حیدرآباد کی تفصیلات پڑھنے کو مل جاتی ہیں۔ جہاں کہیں عام رجحانات شاعری  
 کا ذکر ہے وہاں نکھو کی شاعری کی برتری کو نمایاں کیا ہے کا نام امیری میں  
 جلیق لکھتے ہیں،

”اس وقت جبکہ امیر نے میدان سخن میں قدم رکھا شاعری  
 کا آفتاب اوج کمال پر تھا، مثنوی آفرینی، بلند خیالی، شوکت  
 الفاظ لازماً شاعری ہو گئی تھی۔ معانی و بیان فصاحت و  
 بلاغت، استعارات و تشبیہات ضائع بدائع کے دریا

یہ رہے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ کاتب نے جس طرح زبان کی صلاح کی تھی۔ اسی طرح شاعری کی بھی جدید بنیاد ڈالی تھی انہوں نے اور ان کے ہم عصروں سلیم و سلیم کی گویائی اختیار کی تخیل کو بڑی بلندی پر پہنچایا جس سے شعریں زور اور سنگریلا ہو گئیں۔ ۱۷

اس کتاب کی ایک اہم کمی جس کے تعلق سے آج کا کوئی نقاد بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ اس کی جامعیت اور احتیاط نے کتاب کی افادیت و مقصدیت کپس پٹ ڈال دیا۔ امیر کی شخصیت، فن، شاعری اور زندگی کے دیگر پہلوؤں پر سیر حاصل بحث نہیں کی ہے مثلاً میں سمجھتا ہوں کہ امیر اللغات کی تالیف (حصہ اول و دوم) جناب امیر کا بڑا کارنامہ ہے۔ یہ جلیل کے مانچور چھوڑ کر رامپور آنے کا سبب بھی رہا ہے لیکن دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ساری کتاب میں امیر مینائی کی امیر اللغات کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ اسی طرح رامپور کے عروج کے دور میں جب وہاں ادب، شعر اور اہل کمال کی بھیر لگی رہتی تھی۔ یقیناً بہت سے مشاعرے، ادبی معرکے اور شاعرانہ چشمیں بھی رہی ہوں گی ان سے جیلن نے شاید امدادی طور پر گریز کیا ہے۔ متذکرہ امور کے تعلق سے وہ بہت کارآمد معلومات فراہم کر سکتے تھے لیکن نہ جانے انہوں نے کیوں انہیں اپنی تالیف کا مطلع نظر نہیں بنایا۔

ڈاکٹر ذکی کاکوری نے ”سوانح امیر مینائی“ کے دونوں پہلوؤں کا جائزہ آج کے تنقیدی انداز میں لیا ہے اس کے چند اقتباسات اس تالیف کے اندر جھانکنے میں بڑی مدد دیتے ہیں۔

(۱)۔ جیلن کی تمام نثر نگاری میں ان کی امیر کے ساتھ غیر معمولی عقیدت اور نیاز مندی کا پہلو نمایاں ہے اور تنقید کا عنصر برائے نام نظر آتا ہے۔

(۲)۔ آج کل سوانح نگاری میں اور کسی کے کلام پر ریلوے کا یہ انداز نہایت معقول نہیں کہا جاسکتا۔

(۳)۔ ان (جلیل) کی مریدانہ عقیدت ایک اک حرف سے ٹپکتی ہے۔

(۴)۔ یہاں یہ بات بھی عرض کر دینا ضروری ہے کہ اتیر مینائی کے بارے میں جلیل کی تالیف مجموعی حیثیت سے اتیر مینائی پر لکھے گئے مختلف کتب و رسائل سے زیادہ معتبر ہے۔

(۵)۔ سوانح امیر مینائی اور کارنامہ اتیر مینائی میں جلیل کی نثر نگاری میں بڑی ادبیت ہے۔ جلیل نے بڑے عام فہم، سلیس، اور سادہ زبان سے کام لیا ہے۔ انداز بیان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ جس چیز کا بیان کرتے ہیں اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے بھر جاتی ہے۔

(۶)۔ انتہائی قدامت پسندی کے باوجود اس کتاب میں جہاں کہیں کوئی واقعہ جلیل کے قلم سے نکل جاتا ہے پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

(۷)۔ بحیثیت مجموعی جلیل کی یہ تالیف اردو نثر نگاری کا اچھا نمونہ ہے جس میں اتیر مینائی کے بارے میں کافی کام کی باتیں مل جاتی ہیں جس کی دریافت دوسرے ذرائع سے مشکل تھی۔

اے جلیل کا تلم لڑا بطلب علی خاں کے دربار کی لفظی تصویریں کھینچتا ہے:

”مُصاحب منزل آراستہ ہے۔ فرش مسکف بچھا ہے۔ اس پر وہ لوگ رونق افروز ہیں جو انتخاب و زنگار سمجھے جاتے ہیں۔ ایک جانب فضلاء اور علماء عصر کی نشست ہے۔ ایک طرف شعراء و نامدار کی جماعت بیٹھی ہے۔ آپس میں مزے مزے کی مسکلت ہو رہی ہے۔“ (سوانح امیر مینائی ص ۸۸)

یہ۔ مثلاً مرزا غالب کا یہ لطیف اتیر مینائی کے حوالے سے جلیل نے بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ ”مخدولی خاں رامپوری کو شعر سناتے کا بہت شوق تھا۔ غالب اس سے واقف ہو چکے تھے۔ ایک دن رامپور میں (جب غالب وہاں قیام فرما تھے) خاں صاحب موصوف غالب سے ملنے آئے اور حسبِ عادت شعر پڑھنا شروع کیا۔ ایک مطلع سنستے ہی غالب نے کہا ”جگو اٹھاؤ (ضعف کی وجہ سے اٹھنے میں سہلا درکار ہوتا تھا) لوگوں نے اٹھایا۔ مرزا صاحب دلی محمد کے گرد بچہ سر پر لوبہ دیا اور کہا اس سے زیادہ سننے کی مجھ میں تاب نہیں۔“ (سوانح امیر مینائی ص ۲۶۱)

علامہ ادیں بہت سے واقعات جلیل کے ذاتی تجربات، مشاہدات اور محسوسات کے حامل ہیں۔ چند خامیوں سے قطع نظر امیر پر لکھی ہوئی تحریروں سے بڑی حد تک مختلف ہے۔ یہ تحریر دو مواد جناب امیر پر کی جانے والی مزید تحقیقات کے لیے ماخذ کا کام دے سکتے ہیں۔

ایک بات اور یہ کہ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد امیر کے غزلیہ اور نعتیہ دوادین کے مطالعہ اور اچھے اشعار کی چھان بین کی ضرورت باقی نہیں رہتی کیونکہ جو انتخاب کلام دیا گیا ہے استاد افر اور تفصیلی ہے کہ امیر کے مقام کے تعین کے لیے بہت کافی ہے۔

## مکاتیب جلیل

خط نگاری تہذیب انسانی کی علامتوں میں سے ایک ہے۔ یہ زندگی کے ہم گیر تقاضوں سے پیدا ہوئی۔ پہلے عام ضرورتوں کو پورا کر کے تک محدود رہی پھر رفتہ رفتہ دیگر فنون عالیہ کی طرح ایک فن لطیف بن گئی۔ یوں تو ہر خط بنیادی طور پر ایک شخصی اور نجی چیز ہے اور اس کا افادہ بہت محدود ہوتا ہے لیکن علماً جب خط منظر عام پر آ کر مطالعہ کی چیز بن جاتے ہیں تو علم و ادب کا قیمتی ورثہ ہو جاتے ہیں یہ واحد صنف ادب ہے جس میں تصنع و تکلف کی گنجائش نہیں ہوتی۔ ایک نقاد کے الفاظ میں

”تحریری نقش و نگارش کے ذخیروں میں صرف یہی ایک صنف ایسی ہے جس میں احتیاط و تکلف کی کم سے کم کمائزش ہوتی ہے۔“

چنانچہ کسی شخصیت کے مزاج و ذوق اور سیرت و کردار کی جیسی صحیح تر جہانی اور آئینہ داری اس کے لیے تکلف خطوط کے ذریعہ ہوتی ہے وہ کسی دوسرے ذریعہ سے ممکن

نہیں۔ نان لاک کہتا ہے۔ خطوط نگاری کا انسانی زندگی کے واقعات کا ارتقا  
گہرا تعلق ہے کہ کوئی شخص اپنی شخصیت کو اس صنف ادب میں تمام تر پوشیدہ  
نہیں رکھ سکتا۔ کیوں کہ بہت کم اہل قلم ایسے ہوتے ہیں جو خط کہتے وقت ان  
خطوط کی اشاعت کا خیال بھی دل میں نہیں لاتے۔ یہی سبب ہے کہ ارباب علم و ادب  
اس سرمایہ کو ادبیات کا انمول اندوختہ قرار دیتے ہیں۔

جلیل نے جو خطوط نصف صدی کی مدت میں لکھے اور لکھوائے وہ ان کی زندگی  
میں طبع نہیں ہوئے۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ انھوں نے اپنی نثر نگاری یا خط نگاری  
کو کوئی اہمیت نہیں دی اور نہ کبھی ان کے چھپوانے کا خیال آیا۔ خطوط کے مسودات  
میرے پاس محفوظ تھے لیکن ان کی حفاظت مشکل ہو رہی تھی۔ وہ تو کہتے کہ مدیر نقوش  
لاہور نے جب شاہیر کے خطوط کی چھان بین کی اور ان کی اشاعت کا سلسلہ شروع  
کیا تو لاہور سے میرے کرم فرما غلام حسن کسری منہاس نے جو ادارہ نقوش سے وابستہ  
ہیں راقم الحروف کو والد مرحوم کے خطوط کے بارے میں لکھا اور امر کیا کہ ان کے خطوط  
نقوش کے خطوط نمبر کے لیے بھیج دوں۔ میں نے منشر مسودات سے جتنے بھی خطوط فراہم  
ہو سکے مدیر نقوش کو بھیج دیے اس طرح یہ خطوط نقوش کے خطوط نمبر جلد درم میں چھپ  
گئے۔ بعد ازاں میں نے جلد خطوط میں سے کا رآمد خطوط انتخاب کر کے انھیں ۱۹۸۲ء  
میں مکتوبات جلیل مانکپوری کے نام سے شائع کر دیا۔

یہ خطوط صرف ادب و انشا کے ہی آئینہ دار نہیں بلکہ ان میں سے زیادہ تر  
علمی، ادبی، شعری و فنی پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ علمی مسائل اور نکات فن کی  
وضاحت سے تعلق رکھتے ہیں۔ زبان محاورہ اور روزمرہ کے بارے میں قیمتی معلومات  
سے آراستہ ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ خطوط ایسے بھی ہیں جن کا تعلق فرمائشوں کی  
تکمیل، تحائف کے شکریے، سفارشیں، تعزیت اور صحت و سمر و نیت سے  
ہے۔ یہ قطعی طور پر شخصی ہونے کے باوجود آفاقی بھی ہیں۔ چند خطوط ایسے بھی ہیں جو  
خط کا جواب ہیں۔ ضرورتاً اور مقصد برآری کے لیے لکھے گئے ہیں۔ یہ تنہائی یا فوجت  
کے لمحات کی پیداوار نہیں۔ اس سلسلے میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ زیادہ تر

خطوط اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جب جیل میں استاد شاہ تھے۔ اصلاح کلام شاہانہ اور دربار داری نے انہیں بے حد مصروف بنارکھا تھا۔ خط لکھنے کے لیے مناسب فرصت کی بہر حال ضرورت ہے۔ غالب کی سی خط نگاری کم فرصت آدمی کے لیے ممکن نہیں۔ اسی سبب سے جلیں نے خط نگاری کو غزل کی طرح مشغلہ فن یا ادبی مشغلہ نہیں بنایا۔ شاگردوں کی کثرت مزید برآں تھی۔ چنانچہ عظیم الفرستی کا ذکر جلیں کے اکثر خطوط میں ملتا ہے مثلاً ایک مکتوب میں وہ پنجاب کے ایک شاگرد کو یوں لکھتے ہیں:

”آپ کی غزلیں آئی ہوئی ہیں۔ ایک غزل بھیجنا چاہیے۔ یہاں دیکھنے کی فرصت کہاں۔“

بنوں کے ایک شاگرد (عبدالرشید راشد) کو لکھتے ہیں:

”دلوازا۔ سلام سنوں۔ آپ کا خط پہنچا۔ اگرچہ مجھے فرصت بالکل نہیں ہے اور ضعف دماغ کا شکوہ بھی ہے۔ کسی کامام مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ تاہم آپ حقوڑا تھوڑا کلام بھی بھیجیں گے تو میں انشاء اللہ دیکھنے کی کوشش کروں گا۔“ اے

ان حالات میں بعض شاگرد اپنی طویل غزلیں بھیج دیتے۔ ایسے ہی ایک شاگرد حافظ غریب اللہ خاں فشر باد صولور کو ان کے خط کے جواب میں لکھتے ہیں:

”چوالیس شعر کی غزل پہنچی۔ دیکھنے کی فرصت نہیں۔ اگر غزل مختصر ہوتی تو دیکھ لی جاتی۔ اِطْلَاعاً آپ کو لکھتا ہوں۔“

فرمائشیں اس پرستزاد۔ ایک فرمائش کے جواب میں یوں معذرت خواہ ہیں:

”قلعہ تہنیت کی آپ نے فرمائش کی ہے اس کی تعمیل میرے لیے سعادت ہے۔ لیکن کئی روز سے درد سر میں مبتلا ہوں۔

شعر کہنے کی طاقت نہیں ہے۔ لہذا معذرت خواہ ہوں۔“ اے

در حقیقت خطوط نویسی کی ابتداء رامپوری سے ہو چکی تھی جیسا کہ ذیل کی تحریر سے بھی معلوم ہوتا ہے:

”جلیل کی خطوط نویسی کی مشق امیر مینائی کے زیر نگرانی کی۔ امیر مینائی اس ابتدائی زمانے میں بھی اپنے بعض غیر اہم خطوط جلیلیں سے لکھواتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ امیر مینائی کے سب سے خطوط میں مکتوب الہیہ کے نام جلیلیں کی جانب سے پیام سلام ملتا ہے“ لے

چنانچہ بزادہ قیام رامپور جلیلیں نے امیر کی جانب سے جو خطوط لکھے ان کا ذکر مکاتیب جلیلیں میں ملتا ہے۔ دل شاہجہاں پوری کے نام کا ایک خط یہاں درج کیا جاتا ہے۔

رامپور  
محبت و شفقت۔ تسلیم

نامہ ہائے عنایت صادر ہو کر باعث منت پذیر ہوئے  
آج خدا خدا کر کے آپ کی غزل ملاحظہ سے گزری جسے  
ہمراہ رفیقہ نیاز بھیجا ہوں۔ آپ شاگرد ایسے شخص کے  
ہیں جو تمام عالم کا استاد ہے پھر کیوں کراصلاح میں تاخیر  
نہ ہو۔

اصلاح طلب کام کے لئے کے بستے بھرے پڑے ہیں  
میری جانب سے آپ کے تعلیم ارشاد میں مطلق تساہل نہیں  
ہوتا اور دیکھی ہوگا۔ دوسری غزل بعد کو روانہ کی جائے گی  
حضرت قبلہ و کعبہ (امیر مینائی) آپ کو بہت بہت دُعا میں  
کہتے ہیں۔

جلیل حسن جلیلیں

۳ مارچ ۱۸۹۶ء

ادبی و علمی خطوط کے علاوہ ایسے خطوط بھی لکھنے پڑے جو مکتوب الیہم کے مطالبوں کا جواب ہیں۔ بات یہ ہے کہ عہدہ جلیلہ پر فائز ہونے کی وجہ سے قنور اور قریب کے شناسا حضرات ملازمت در دیگر امور میں کامیابی کے لیے سفارشی خطوط طلب کرتے یا عہدہ آباد آکر امداد حاصل کرنے کی خواہش کرتے۔ انھیں اس قسم کے خطوط تحریر کئے گئے۔

”عہدہ آباد آنے کا ہرگز خیال نہ کیا جائے۔ مجھ سے کسی عہدہ دار سے سروکار نہیں، خاندان نشین ہوں۔ نہ کسی سے مل سکتا ہوں اور نہ کوئی مجھ سے ملتا ہے۔ میری ذات سے کوئی کام نہیں نکل سکتا۔“

ایسا ہی ایک مکتوب جو منپور کے قیام الدین کو ان کے خط کے جواب میں لکھتے ہیں:

”آپ جو عہدہ آباد کا قصد رکھتے ہیں اس بارے میں تار مکی لے دیہ یا ہے کہ یہاں آنے کا بحر زیر باری کوئی نتیجہ نہیں اور جن سالگرہ دو سال سے موقوف ہے۔ آپ جو چاہتے ہیں کہ یہاں ٹھہر کر اپنے مقصود میں کوشش کریں اس کوشش کے لیے مدت دواڑ چاہیے۔“

حضرت امیر کے ماجیزادے جناب افضل مال میں لائے تھے اور سفارشی بھی لائے تھے مگر زیر بار ہو کر واپس ہو گئے اور قبل الذیل میر نصاحت خلف امانت لکھنؤ بھی آئے تھے وہ بھی بے نیل مراد واپس ہوئے، اے

ان تحریروں سے صاف ظاہر ہے کہ جلیں نے بیشتر خطوط صرف مقصد بر آری کے لیے لکھے اس سے زیادہ کچھ اور نہیں۔ وہ صرف کام کی باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ جہاں مدعا ختم ہو وہاں ان کا قلم رک گیا۔ عبارت آرائی، تکلف اور بے مقصد طوالت

نام کو نہیں یا انیہہ زبان کی سادگی، مخاطب کا خلوص، تازگی، شگفتگی، فر  
ایجاد اور اختصار ایسی خصوصیات ہیں جن کے باعث یہ مکاتیب سب سے قابل قدر و  
ڈاکٹر ذکی کا کوروی بھی مکتوبات جلیل کے بارے میں ایسی ہی رائے رکھتے ہ  
”جلیل کے خطوط میں غیر متعلق باتیں، ذاتی موضوعات، مقامی  
یا ملکی حالات، سیاسی یا سماجی مسائل یا صرف عبارت آرائی کی  
گنجائش نہیں۔ جلیل کا زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں غالباً  
سب سے زیادہ غیر آشوب اور انقلاب آفریں دور تھا مگر جلیل  
کے کلام کی طرح ان کے خطوط میں بھی اس سے متعلق کہیں کوئی  
ذکر شکل سے ملے گا۔“

جہاں تک مکتوب الیہہ کا تعلق ہے ان خطوط کے مخاطب مشاہیر  
عام آدمی تک ہیں۔ جن میں عزیز، احباب، عقیدت مند، ضرورت مند، اور شا  
ایک بڑی تعداد شامل ہے۔ مشاہیر مکتوب الیہہ میں قابل ذکر نام ریاض خیر  
مولائی، دل شاہ جہاں پوری، حکیم برہم (اڈیشا مشرق) قاجور نجیب آبادی (د  
حبیب الرحمن شروانی، احسن ماہرودی، لڑا الحسن میر، نیشنل حلف مظفر خیر آبادی  
حاجی ابوالشرف مجددی اور صفدر مرزا پوری وغیر۔

ان اصحاب میں سے بعض کے خطوط میں جلیل نے عبارت آرائی بھی ک  
الفاظ کے دہرے پر بھی نظر رکھی ہے۔ آپ بھی اس سے لطف اندوز ہوں  
حکیم برہم اڈیشا مشرق (گورکھپور) کو خط کے جواب میں رقمطراز ہیں :  
”جناب محکم و محترم دام محمدکم۔ سلام مسنون انعامی شوق۔  
مدت کے بعد آپ کا فواز شام آیا۔ آنکھوں سے لکھایا غزل  
بھیجا ہوں مگر ڈرتا ہوں کہیں وقت نہ نکل گیا ہو اور پھر آپ  
اور بھی برہم ہو جائیں۔ خدا خدا کر کے سلسلہ مراسلت کا آغاز

ہوا ہے کہیں اس میں کھنڈت نہ پڑ جائے۔ آپ کی تحریر دیکھ کر  
تمام انگلی باتیں یاد آگئیں اور کیا کیا نقشے آنکھوں میں پھر گئے۔  
ایسے عالم میں ہوں دُنیا دنیا فیہا کی خبر نہیں۔ ضعیف ہوں اُٹھ  
ہوں، ضعف دماغ نے کسی کام کا نہیں رکھا۔ پھر کھی کاہ سے  
فارغ نہیں ہوں؟“ لے

پنڈت رادھے بہاری لعل مصر اُڑپ تا بگڑہ (یو۔ پی) کے ایک معزز عقیدت مند  
کے نامہ میں یوں خامہ فرسائی فرمائی ہے۔ القاب کی طوالت ملاحظہ ہو۔  
”مگر گستاخاں پرور، فوت کے ہر رخشاں اخلاص کے  
روح رواں خوشخصال و خوش مقال رادھے بہاری لعل صاحب  
کی خدمت میں نیاز کیش جلیل تسلیم گزار ہے۔  
نامہ فلت طراز عرصہ ہوا دماغ کو تازہ اور دل کو شگفتہ  
کر چکا ہے جس کی نسبت یہ کہنا بے جا نہیں۔  
بحر احساں کی ہے موج آب کا خامہ کیا ہے  
نسخہ درد محبت ہے یہ نامہ کیا ہے  
آپ کی فرمائش میں آنکھوں سے بجا لاتا اگر مجبور نہ ہوتا۔ مجبور  
کی داستان طوالتی اور بے مزہ ہے۔ لہذا اس جملہ پر اکتفا  
کرتا ہوں کہ میں کمال افعال کے ساتھ آپ سے معذرت  
خواہ ہوں؟“ لے

فرمائشیں اس نوعیت کی بھی ہوتیں کہ لوگ اپنی تصنیفات بھیج دیتے اور ان پر لکھنے  
طلب کرتے۔ ایسی فرمائشوں کو ٹالنا بہت مشکل ہوتا لیکن سوائے اس کے اور کوئی چارہ  
نہ تھا۔ کتنی چڑیا کوئی نے اپنی ایک کتاب اس غرض سے بھیجی تو جواب میں لکھا۔  
لوازشناے کا شکریہ۔ آپ نے بڑا کام کیا کہ اتنی فحیم کتاب

تیار ہو گئی۔ بارک اللہ۔ آپ نے اپنی کتاب پر میری رائے  
طلب کی ہے۔ رائے ذنی کی مجھے عادت نہیں اور نہ اس  
کی صلاحیت۔ پھر بھی آپ کی کتاب اگر کبھی نظر سے گزری تو  
ممکن ہے کچھ اظہار خیال کر سکوں؟ لے

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ خطوط جلیل کی زندگی کو سمجھنے میں بڑی حد تک معاون  
ہوتے ہیں۔ یہ ان کی حیات کا بہترین مافذ بھی ہیں۔ ان خطوط کے ذریعہ کچھ ایسے گوشے  
بھی ہمارے سامنے آتے ہیں جو ان خطوط کی عدم موجودگی میں یقیناً ہماری نظر دل سے  
اوجھل رہتے۔

جلیل کے مکاتیب کا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ ان میں زبان، بیان، لغت، فن  
اور نکات شاعری کے بارے میں بہت مفید اور کامد باتیں ملتی ہیں۔ شعردار اب کے  
پرستاروں نے علمی و ادبی استفسارات کا سلسلہ قائم رکھا تھا۔ یہ استفساری خطوط  
استناد حاصل کرنے کے لیے ملک کے ہر خط سے آتے۔ جلیل نے بڑی چابکدستی سے  
ساتھ ان مسائل کو اپنے خطوط کے جوابات میں حل کیا ہے۔ ان خطوط سے افذ کردہ  
اقتباسات درج کئے جاتے ہیں:

### زبان۔ فن۔ نکات شاعری (مکاتیب کی روشنی میں)

۱۔ عرض فی نفسہ ہونٹا ہے جیسے میری عرض ہے۔ ایک عرض بھی قبول نہ ہوئی  
وغیرہ۔  
تھک گئے آپ سے کہتے کہتے  
ایک بھی عرض پذیرانہ ہوئی (مسرور)  
لیکن عرض کرنا کہنا کے معنی میں مذکور ہے۔

آپ کی یاد تپے نقش نگین دل پر  
میں نے کیا عرض کیا تھا مجھے کچھ یاد نہیں (تسلیم)

لہذا میں نے عرض کیا صحیح ہے اور میں نے عرض کیا غلط۔

(۲) لیا کا فعل ہر فعل کے ساتھ بل کر آتا ہے لیکن "لانا" فعل کے ساتھ لیا کی شرکت خلاف زبان ہے۔ یعنی اگر کوئی لایا کہے تو یہ درست نہ ہوگا۔

(۳) ہوش کا استعمال علی العموم جمع کے ساتھ ہوتا ہے مثلاً  
آمد ہوئی جو ان کی جزا کے غش نے دی  
قربان تجھ سے پہلے مرے ہوش ہو گئے (درد)  
لیکن آتا کے ساتھ جب ہوش کا استعمال ہوتا تو واحد ہے مثلاً

تو جو لینے خبر نہیں آتا ہوش درد پہر نہیں آتا  
(۴) ہمارے ہاں کہنا درست نہیں۔ ہمارے یہاں کہنا چاہیے۔

(۵) جملہ شرطیہ میں "ہیں" کہنا درست نہیں۔ "نہ" کہنا چاہیے جیسے  
آنکھ اس نے جو کبھی ہم سے لڑائی ہوتی  
کوئی صاحب گرا کبھی ہوتا نہ لڑائی ہوتی (شفقت)

(۶) اول تو لفظ مت متروک ہے اس کا بولنا جائز ہی نہیں۔ دوسرے اس کا جب استعمال ہوتا تھا تو صرف اسر حاضر پر مت لگا کر ہی بنایا جاتا تھا۔  
میرے تئیں حال پر مت جا انقانات ہیں لالے کے  
امریغاب کے لیے مت کا استعمال کبھی نہیں ہوا۔ جن سولہوں نے قواعد اردو میں ایسا لکھا ہے وہ درست نہیں۔ نہ استعمال ہونا چاہیے۔

(۷) واضح ہو کہ اصل لفظ مصالحہ ہے اردو والے اس کو مسالا کہتے ہیں۔ نظر برآں مسالا لکھنا جائز ہے۔ اور اگر کوئی اعلیت کے خیال سے مصالحہ لکھے تب بھی درست ہوگا۔

خطیب

## شخصیت

”نفسیاتی علوم میں انسانی شخصیت سے متعلق اس سیکور تصور کو شخصیت کا نام دیا جا رہا ہے جو تصور مغربی نفسیاتی کتابوں میں داخل پایا جاتا ہے۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں شخصیت سے متعلق کتابیں اور رسالے مغربی ممالک میں چھپے اور پڑھے جاتے ہیں۔ ان تمام کتابوں میں شخصیت کا تصور تقریباً ایک ہی سا ہے استعاراً ڈبلی روڈی سمجھئے یہ ایک خاص مشین میں ایک مخصوص فارمولے کے تحت بنایا خوبصورت سے کاٹا اور پھر دلفریب کافد میں لپیٹ کر بازار میں بیچ دیا جاتا ہے۔ کہ ڈبلی روڈی اسی طرح قدر و قیمت پاتی ہے۔“

اس طرح مختلف تنقید نگاروں نے مختلف طریقوں سے شخصیت کا جائزہ لیا ہے شخصیت کی کوئی معین تعریف نہیں کی جاسکتی کیوں کہ مختلف تنقید نگاروں کا اپنا نقطہ نظر بھی اس میں شامل ہوتا ہے۔ ایک سروے کے مطابق آج کی تحریروں کے

خالقوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک کلاسیکی ادب کا احترام کرنے والے پختہ عمر کے شاعر و ادیب دوسرے ماضی کے ادب سے یکسر روگرداں اور جوان شاعر اور نقادوں کا گروہ۔ یہ دو گروہ دو مختلف نظریات کے حامل ہیں۔ پختہ عمر کے دانشور کے نزدیک آج کے انسان کی ذات میں انفرادیت کا اصل سبب ہماری ماضی سے بے تعلقی ہے جو ہماری ذات کے معاملے میں ”سپلائی لائن“ کی حیثیت رکھتا ہے لہذا ہم روز بروز کھوکھلے ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کے برخلاف نئے نقادوں کا خیال ہے کہ خود شکستگی ماضی سے مکمل طور پر بچھاؤ چھڑانے کی وجہ سے ممکن ہوتی ہے۔ لہذا ماضی سے مکمل طور پر بے تعلقی اختیار کر لینا چاہیے اس بحث سے قطع نظریہ حقیقت مسلم ہے کہ جب ہم کسی فرد کی شخصیت کی بات کرتے ہیں تو اس مفہوم میں کردار مکمل انفرادیت سمجھی کچھ آجاتے ہیں اور اس کی تربیت میں گھریلو ماحول تعلیم و تربیت سماجی ادارے اور تہذیب و تمدن کی تدریس مجموعی طور پر حصہ لیتی ہیں۔

شاعر کی حیثیت ایک عام انسان کی شخصیت سے مختلف ہوتی ہے کیوں کہ یہاں شخصیت کے دہرے اظہار سے واسطہ پڑتا ہے۔ ایک اظہار تو سماجی رویہ ہے اور دوسرا اظہار فن کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ شخصیت کے جو پہلو سماجی رویہ میں ظاہر ہوتے ہیں وہ فن میں بھی اُجاگر ہوں۔ کبھی اس کے برخلاف بھی ہوتا ہے۔ فن شخصیت پر نقاب ڈالنے کا کام بھی کرتا ہے۔ خود جلیں ہی کی مثال لیجئے۔ جلیں کا شمار خصوصیت سے اردو کے ان مشہور شاعروں میں ہوتا ہے جن کی خمریات کو بہت اُدنی مقام ملا لیکن ان کی زندگی اس سے قطعی عاری تھی۔

جلیں کی شخصیت کی تشکیل میں ان کے فن اور ان کی سیرت دونوں نے برابر کا حصہ لیا ہے۔ انسانی سیرت و اخلاق پر توارث اور ماحول دونوں کم و بیش اثر انداز ہوتے ہیں۔ خوش قسمتی سے آپ کو بہتر توارث اور اچھا علمی ماحول اعلیٰ درجہ کی تربیت کا ہیں اور شائستہ قسم کی صحبتیں میسر آئیں۔ آنکھیں کھولیں تو گھر کا علمی ماحول

اور دینداری دیکھی بشور آیا تو لکھنؤ کے علمائے فرنگی محل حبیبی اعلیٰ قسم کی صحبتیں میسر آئیں۔ ساتھ ہی لکھنؤ میں لکھنؤ کی مٹی ہوئی تہذیب اور اس کے نشانات و آثار بھی دیکھے۔ اس سے پذیرائی بھی لازمی بات تھی۔ چنانچہ جلیل نے اپنی طرز معاشرت، نشست و برخاست، گفتگو، برتاؤ، چال چلن اور تمیز و تہذیب کے ذریعہ جو کچھ دیا اس سے ان کی شخصیت اور ابھر کر سامنے آئی۔ اس میں شک نہیں کہ جلیل پر اگر چہ شاعری کا بڑا احسان ہے کہ جو کچھ شہرت ہے وہ اسی کی بدولت ہے لیکن درحقیقت وہ شاعر سے زیادہ انسان کامل تھے۔ اپنی درویشانہ شان اور عمل کی بدولت وہ شاعر نہ بھی ہوتے تو یقیناً ایک بڑے عالم اور مُرشدِ کامل مانے جاتے قلمی عبدالغفار ان کی اس شخصی حیثیت کو شاعری سے زیادہ بلند قرار دیتے ہیں۔

”وہ (حضرت جلیل) ایک درویش صفت انسان تھے

اور ان کی درویشانہ شان جن لوگوں نے دیکھی ہے وہ

کہہ سکتے ہیں کہ شخصی حیثیت سے ان کا مقام بلند و برتر

تھا اور شاعری سے بھی بلند و بالا تھا“ اے

## عبادت و ریاضت

جلیل کی شخصیت کا یہ پہلو ان کی ساری زندگی پر محیط ہے۔ ان کے والد حافظ عبدالکریم ایک باخدا درویش مزاج عالم تھے جنہوں نے بچپن ہی سے جلیل کو روزے نماز اور زہد و تقویٰ کی ترغیب دی تھی۔ بارہ سال کی عمر میں حافظ قرآن ہوئے پھر لکھنؤ میں علمائے فرنگی محل کے آگے زانو سے ادب تہہ کیا۔ پھر رامپور چلے گئے۔ وہاں روحانی دولت بھی ان کی منتظر تھی۔ یہ کیونکر ممکن نہ تھا کہ جس کی تعلیم حفظ قرآن سے شروع ہوئی ہو اور جس کا مشام تجلیوں سے معمور ہو وہ سیرانی کے فیضان سے مکمل استفادہ نہ کرے چنانچہ جو ہر شاعری سے قطع نظر جس نے جلیل کو

اتیر سے قریب ترکر دیا وہ ان کی عبادت گنہاری اور پاکیزہ زندگی تھی۔ اس طرح انھوں نے اپنے استاد اتیر مینائی کے فیض صحبت سے شاعری کے علاوہ تقویٰ و تقدس حاصل کیا۔ صدیق الزماں نیزہ حضرت اتیر جنھوں نے رام پور میں جلیل کا شباب دیکھا تھا لکھتے ہیں ”جلیل حضرت اتیر مینائی کے ارشد تلامذہ میں تھے جنھوں نے اتیر کے یہاں بود و باش تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک برآمدے کے محراب میں چوبی تخت تھا اس پر ہرن کی کھال بطور جاناں لٹکی رہتی تھی اور وضو کا لوٹار کھارہتا تھا۔ دفتری کاروبار کے علاوہ جلیل ہمیشہ اسی تخت پر بیٹھے ہوئے نماز میں مصروف تسبیح و تہلیل میں مشغول رہا کرتے“ لے

رامپور میں استاد اتیر مینائی کے توسط سے اور بھی بزرگان دین کی صحبتیں جلیل کو حاصل ہو گئیں جو اس وقت رامپور میں اپنا فیضان پھیلا رہی تھیں۔ انھیں صحیح قول میں ایک دن سید محمد شاہ صاحب محدث نے حالت اعتکاف میں جلیل کو حزب البحر پڑھنے کی اجازت عطا فرمائی۔ کچھ دنوں بعد آپ نے بیعت کا ارادہ کیا اور استاد سے مشورہ کے طالب ہوئے۔ جناب اتیر نے رائے دی:

”بیعت کے لئے تمی ہوں میاں محمد شاہ صاحب محدث، میاں شاہ محمد معصوم صاحب مجددی و نقشبندی اور مولانا فضل الرحمن گنج مراد آبادی ہیں۔ ان چاروں میں سے کسی ایک سے بیعت کرنی چاہیے۔ میری رائے یہ ہے کہ حدیث شریف کے مطابق تین روز عمل استخارہ کرو۔ اس درمیان اس بات کا انکشاف ہو جائے گا کہ کس کے ہاتھ پر بیعت کرنا چاہیے۔“ لے

چنانچہ حسب ہدایت جلیل نے استخارہ کا عمل فرمایا۔ دوسرے یا تیسرے دن عالم خواب میں انکشاف ہوا کہ میاں محمد شاہ صاحب محدث کے دست مبارک پر بیعت کرنی چاہیے۔ صبح ہونے پر انھوں نے حضرت امیر سے ذکر کیا اور اسی روز شام میں سید محمد شاہ محدث کے ہاتھ پر بیعت کی۔ بیعت کے بعد شاہ صاحب نے سلوک کی تعلیم اور ذکر و اذکار کے طریقے سکھائے اور پھر ان کی اجازت ہی سے حضرت شاہ معصوم صاحب کے حلقہ سلوک میں شریک ہو گئے۔<sup>۱</sup>

اس طرح جلیل نے امیر مینائی پر اپنی عبادت و ریاضت کے جو اثرات مرتب کئے اس کا اندازہ خود امیر مینائی کے ایک خط سے ہوتا ہے جو انھوں نے اپنے شاگرد عابد علی کو ثریخ آبادی کو جلیل کی ملازمت کے بارے میں لکھا تھا۔ یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ جلیل کا تعارف کرواتے ہوئے استاد نے اپنے شاگرد کی شاعری کے تعلق سے کچھ نہیں لکھا بلکہ ان کی زندگی کے اس پہلو کے بارے میں لکھا جو ان کی نظر میں زیادہ پسندیدہ اور قابل اظہار تھا:

”مجھے محی جلیل سے سخت انفعال ہے اور ان کی کامیابی کا نہایت ہی خیال ہے جلیل دُور جانا نہیں چاہتے ورنہ دکن میں ان کا نوکر رکھوانا ممکن تھا۔ آدمی ایسے اچھے ہیں کہ جہاں ہوں وہاں اسلامی برکات پھیلیں۔ میں ان کی علمدگی کو اپنی بدقسمتی سمجھتا ہوں مگر بحجورنی گوارا کرتا ہوں بشرطیکہ اسی جواری یعنی قرب وطن میں ان کے بسر اوقات کی صورت نیکے“<sup>۲</sup>

۱۔ ۱۳۳۸ھ میں ان کے انتقال کی تاریخ جلیل نے یوں رقم کی تھی وارث دین رسول دوسرا۔  
۲۔ حضرت معصوم شاہ صاحب کی کتاب حصن حصین کی لطاعت کا یہ قطعہ تاریخ جلیل کی ان بے ابلیغی کی دلیل ہے۔  
اللہ اللہ شان ہے کیا حضرت معصوم کی عرش سے ادنیٰ ہے پایا نسبت وارث شاہ کا  
پاکے خوشبو میں نے حضرت سے گزارش کی تھی خوب ہی کھینچا ہے یہ عطر آپ نے اور ادا کا  
۳۔ احسن اللہ خان ثاقب۔ کتاب امیر مینائی ص ۱۲۵ ۱۹۲۵ء  
۱۱۳۴ھ

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جب عالم شباب میں عبادت ریاضت کا یہ عالم تھا تو یہ پودا پڑھ کر جب تناور درخت ہوا ہوگا تو اس کا پتہ پتہ کتنے مقدس ہوگا اور ان مقدس پتوں سے بکھرے والے سایوں نے کتنا تقدس پھیلایا ہوگا۔ امیر مینائی کے وصال کے بعد جلیل اپنے استاد کے جانشین قرار دیئے گئے۔ اس جانشینی کی جو توضیح سلیمان ندوی نے کی ہے لائق غور ہے :

”حضرت جلیل کو دنیا نے جانشین امیر کہہ کر پکارا۔ جانشینی حقیقت میں پوری پوری تھی۔ ظاہری و باطنی۔ دلوں اور اوصاف کے لحاظ سے وہ جانشین تھے۔ جو زہد و تقویٰ، پابندی دینی اور ذکر و فکر و مراقبہ اور خدا ترسی استاد میں تھی وہی شاگرد کو ملی تھی“ لے

خواجہ حسن نظامی کی نظر میں بھی جلیل کی سیرت کا یہ پہلو بہت نمایاں ہے لکھتے ہیں :

”مسلمان شعرا میں بعض بڑے بڑے درویش گزرے ہیں۔ چشتیہ خاندان میں حضرت سلطان المشائخ یعنی خواجہ نظام الدین اولیاءؒ، محبوب الہی کے دو شاعر مرید حضرت سنغری و حضرت امیر خسرو شاعری میں بھی لیگانہ روزگار تھے اور درویشی میں بڑا درجہ رکھتے تھے۔ حضرت مرزا جانجاناں اور حضرت خواجہ میر درد کا بھی درویشوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

غنی امیر احمد امیر اودان کے شاگرد حافظ جلیل حسن جلیل بھی درویشانہ شان اور عمل کے شاعر تھے .... وہ ہمیشہ پابندی کے ساتھ ہتھ پڑھتے تھے اور آخر وقت تک ان کی عبادت کا سلسلہ جاری رہا“ لے

سیلمان ندوی نے بھی جلیل کو درویش شاعر کے نام سے یاد کیا ہے ان کی دفنا

پر لکھتے ہیں

”مشہور شاعر حضرت جلیل نے پیاس برہہ فرمیں جیڑا  
دکن میں داعی اجل کو لبیک کہا، اللہ تعالیٰ اس درویش شاعر  
کو اپنی دادِ رحمت میں جگہ دے.....

مرحوم نہایت دیدار ہتجد گزار تسبیح خواں ذکر الہی  
میں تر زبان، متواضع خاکسار اور بڑے پابندِ وضع تھے  
پنج وقتہ نماز باجماعت کا اہتمام تھا۔ عشقِ رسول میں سر  
تھے۔“ لے

راقم الحروف نے والد مرحوم کی روزمرہ زندگی کا معمول ہوش سنبھالنے کے  
بعد سے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور ایسا محسوس کیا ہے کہ شاعری ان کے لیے  
ثانوی حیثیت رکھتی تھی۔ شب بیداری، ہتجد و نوافل کی ادائی کے علاوہ ان کا دیاؤ  
وقتِ فرائض نماز کی ادائیگی اور اوراد و وظائف میں مرن ہوتا تھا، یہاں تک کہ  
خالی اوقات میں بھی ہاتھ میں تسبیح ہوتی اور کبوں میں حرکت۔ جلیل منزل جہاں ان کی  
سکونت تھی اس کے بیرونی حصہ میں ایک بڑا ہال ہے یہاں باقاعدہ پنج وقتہ اذان  
اور نماز کا اہتمام تھا اور افرادِ خاندان کے ساتھ باجماعت نماز ادا ہوتی۔ آخری  
عمر تک یہی عمل جاری رہا۔ جب تک وہ صحت مند رہے۔ میں نے کبھی ان کی کوئی نماز  
قضا ہوتے نہیں دیکھی۔

حیرت بدایونی، جنھوں نے جلیل کو بہت قریب سے دیکھا ہے لکھتے ہیں  
کہ اکثر لوگ جن کی جلیل سے ملاقات نہیں ہوتی تھی ان کا خیال تھا کہ  
”جلیل“ شاہانِ دکن کی استاد کی نشہ میں محو، شعروغیر  
عیش و عشرت کی بزمِ آرائیوں میں ہمہ تن مصروف، کلام کی

رنگینی کی طرح ان کی زندگی اور ان کی محفلیں بھی ہوں گی۔ لیکن کسی کو کیا خبر کہ یہاں صورت حال اس کے برعکس تھی۔ شاعر کے رُوپ میں ایک عارف کامل ادیب کے بھیس میں ایک صاحبِ رشد و ہدایت، مصنف کے لباس میں ایک ذاکر و شافل زاہد بلکہ لوں کہتے کہ انسان کی صورت میں ایک پاک فرشتہ ہے۔“

خدا ترسی، خدا رسی اور خدا پر جلیل کا جو ایقان تھا اسی نے ان کی زندگی کے مقاصد کو آگے بڑھانے اور ہر قدم پر کامرانی و کامیابی سے ہمکنار ہونے میں مدد دی اس کا اندازہ ان کے ایک ابتدائی مکتوب سے ہوتا ہے۔ بنرمانہ قیام رامپور جب دفتر امیر اللغات مالی مشکلات کا شکار ہو گیا اور دفتر بند ہونے کی نوبت آ گئی۔ اس پریشانی دیا س کے عالم میں بھی وہ اپنے برادر بزرگ خلیل حسن خلیل کو لکھتے ہیں۔

” دفتر امیر اللغات۔ ریاست رام پور

۱۳ دسمبر ۱۹۳۷ء

بھائی صاحب..... یہ خیال بالکل غلط ہے کہ رامپور سے نکلتے ہی ہر طرف سے لوگ آغوش کھول کر جلیں کو لینے کے لیے دوڑیں گے۔ جلیں چیز ہی کیا ہے بھائی صاحب دنیا کا رنگ بیدب ہے کبھی قسمت سے نوکری مل جاتی ہے ورنہ ایسے پڑھے لکھے معمولی شخص کا تو کیا ذکر اعلیٰ درجہ کی لیاقت رکھنے والے بھی خاک چھانتے ہیں۔

ہاں اطمینان کی بات فقط اتنی ہے کہ مجھے اس تغیر روزگار سے ہراس نہیں ہے اور اس بات پر پورا بھروسہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔

اس میں بھی ہمارے لیے بھلائی ہوگی جس کو ہم نہیں جانتے  
اور یقین ہے کہ وہ عزت و آبرو قائم رکھے گا جو محض اپنے  
لطف و کرم سے دے رکھی ہے؛ لہ

اس خط سے ایک سمت تو آپ کی افتاد طبعیت کھل کر سامنے آتی ہے جو  
سکسر المزاجی کی صورت میں ودیعت کی گئی تھی دوسری طرف اُنھوں نے ان تمام  
پریشانیوں کا جو مداوا تجویز کیا وہ اس ایقان کا مظہر ہے جو ان کو ابتداء ہی سے ذات  
خداوندی سے تھا۔

## حلیہ وضع قطع، لباس

اسی زہد و عبادت کا پرتوان کی وضع قطع میں ملتا ہے۔ جلیل کو جاننے والے  
تو بہت تھے لیکن پہچاننے والے کم کیوں کہ دور و دراز کے مقامات پر رہنے والے  
سیکڑوں افراد ایسے تھے جنھیں جلیل کو دیکھنے کی آرزو تھی۔ حیرت بدایونی کے الفاظ  
میں۔ ان محرومان دید کے صورتخانہ خیال میں جلیل مرحوم کا تصور اس طرح تھا کہ لمبے  
چوڑے، لحیم شقیم، بڑی بڑی مونچھیں، منڈھی ہوئی داڑھی، مفرد آنکھیں، رعب دار چہرہ  
کرخت آحاد اور پر تصنع گفتگو۔ لیکن یہاں نقشہ ہی اور تھا متوسط قامت، چھریا بدن،  
رنگ گندمی، بارش چہرہ، قدیم وضع کے لکھنوی پٹے، یخ سے مانگ نکلی ہوئی، سر پر  
زہن وضع کی سیاہ گول مخمل ٹوپی، لباس مخلف سے عاری سادہ اور شائستہ۔ اوسط  
سوری کا سفید پانجام، ملمن ماکرتا، ہلکے رنگ کی شیردانی، پاونیں جرابیں اور سلیم شای  
جوتا، آنکھوں میں گہر زہرہ، ہاتھ میں رومال اور سیخ۔ اس وضع و لباس میں جلیل شرفائے  
لکھنؤ کا سراپا نمونہ تھے اور یہ وضع ایسی تھی کہ ہر شخص کی نظریں وقت پیدا کرتی تھی۔  
سکاری تقریب میں دستار اور بگلوں کا لزوم تھا۔ ڈنر کے موقع پر یا  
بینکویٹ میں شرکت کے وقت انگریزی لباس پہننا پڑتا تھا۔

## وضع داری

جلیل کا شمار اگلے وقت کے لوگوں میں تھا۔ اسلاف کی وضع داری جو میراث میں ملی تھی اس کے تحفظ میں عمر گزاری۔ تربیتی ماحول کا بھی یہی اعتقاد تھا۔ جلیل کی ذات میں اودھ کی سائنتہ مرہاں مریخ قدیم ہندویں رکھ رکھاؤ اور شائستگی مجسم ہو گئی تھی۔ انھوں نے اپنی زندگی میں بہت کچھ دیکھا۔ زمانہ کروٹ پر کروٹ بدلتا رہا علمی ادبی، ہندویں اور اخلاقی انقلابات آئے اور گزر گئے لیکن اس شدید کشمکش کے دور سے تعلق رکھتے ہوئے بھی انہوں نے اپنی آن اور وضع داری میں فرق آنے نہیں دیا۔ مولانا سلیمان ندوی اس سلسلے میں اپنی ملاقاتوں کا ذکر لکھ لکھتے ہیں:

”جب کبھی حیدر آباد جانا ہوا ان (جلیل) کے یہاں ضرور حاضری دی۔ پُرانی وضع داری اور استقامت کی یہ مثال آج تعجب سے مٹنی جائے گی کہ ان سے پہلی ملاقات جس مکان کے جس سائبان کی جس سمت میں جس کرسی پر جس ہیئت سے ہوتی تھی آخر ملاقات بھی اسی مکان میں اسی سائبان میں اسی کرسی پر اور اسی صورت میں ہوتی۔“

اس سلسلے میں ایک اور ذکر یہاں ضروری ہے جس سے جلیل کی اس وضع داری پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ ان کے پہلے دو دیوان تاج سخن اور جان سخن حیدر آباد میں چھپے تھے۔ ان کا دوسرا ڈیشن لکھنؤ سے شائع ہوا۔ یہ اشاعت عبدالغفور بشر کی نگرانی میں ہوئی تھی جو ندوۃ العلماء میں ملازم تھے اور شاگرد جلیل بھی تھے۔ دیوان کی طباعت و اشاعت کے دوران انھیں یہ خیال ہوا کہ دیوان کے ساتھ ان کی فوٹو بھی ہونی چاہیے چنانچہ اس سلسلے میں جو خط و کتابت ہوئی وہ اس اعتبار سے قابل ذکر ہے کہ اس سے جلیل کی اسلاف پرستی و قدیم اقدار سے وابستگی کا اظہار ہوتا ہے۔

”حیدر آباد

دنوازا۔ سلام مسنون۔ آپ کا لوازشا مہینہ پہنچ کر کاشت  
حالات ہوا۔ آپ نے جو رائے دی ہے کہ تاج سخن میں  
میرے حالات اور فوٹو کا اضافہ کیا جائے یہ بات زمانہ  
حال کے مطابق ہے لیکن اگلے شعر نے تیرے لکیر آیر  
تک ایسا نہیں کیا۔ مجھے ان کے نقش قدم پر چلنا اچھا  
معلوم ہوتا ہے اور میں اسی کا خوگر ہوں۔

باقی خیریت۔ والسلام  
۳ مارچ ۱۹۳۱ء  
حیدر آباد

دنوازا۔ سلام مسنون۔  
قبل ازیں مختصر خط لکھ چکا ہوں۔ فوٹو، حالات اور تبصرہ  
کلام کو آپ ضروری سمجھتے ہیں اور میں اس کو خود نمائی کہتا  
ہوں اور ہلکا پن جانتا ہوں۔ آپ اپنی رائے پر نظر ثانی  
کیجئے اور غور فرمائیے۔ منشی جواد علی صاحب کا خط میں  
نے دیکھا۔ اس کام میں انہماک جیسا ان کو ہے اس کی  
نظیر نہیں مل سکتی۔ کس زبان سے شکریہ ادا کر دوں۔ اور  
آپ کو جزائے خیر دے۔ والسلام۔

نصاحت جنگ جلیلؑ

مختصر یہ کہ جلیل نے ادائل عمر میں بکھو کی تہذیب کی بہاریں دیکھیں اور آخر  
عمر میں مغربی تہذیب و معاشرت کے سیلاب میں مشرقیت اور تہذیب قدیم کا ٹکٹا ہوا  
جنازہ دیکھا۔ ٹوٹی اخلاقی تدوین کے اس انقلاب کی زد سے کوئی ادیب و شاعر

نہ بچ سکا۔ سبھی نے اپنی اصلیت پر رنگینوں کی تہیں چڑھالیں لیکن ان میں صرف جلیل ہی شاعری حیات کے اپنے مقام پر پہاڑ کی طرح اٹل رہے۔ زمانہ اور زمانے کی ہر شے بدل گئی لیکن جلیل جلیل ہی رہے بقول خود

وضع اداری کی ہے یہ شان جلیل  
رنگ بدلانہ عشر بھرا پنا

## سادگی و انکساری

جلیل کی ذات و فطرت میں ایسی سادگی و انکساری تھی جو بالعموم خدا رسیدہ بزرگوں میں نظر آتی ہے۔ کردار کی تشکیل میں خاندانی روایات کا اہم رول ہوتا ہے۔ جلیل نے جس گھرانے میں آنکھیں کھولیں اس کا تعلق اوسط طبقہ سے تھا۔ ان کے آباد اجداد نے متوسط طبقہ کی زندگی بسر کی تھی اس لیے وراثت میں انہیں شان استغنا کے بجائے انکساری و حلیمی ملی تھی۔

جلیل استاد شاہ تھے اور صاحب دربار بھی۔ ایک ہزار ماہوار پاتے تھے جو اس زمانے کے لحاظ سے بلند ترین عہدے کی تنخواہ تھی۔ اتنی کہ امیرانہ شان و شوکت اور ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ زندگی گزار سکتے تھے لیکن ان کی تربیت یا نہ فطرت اور سادگی پسند طبیعت نے یہ گوارا نہ کیا۔ اعلیٰ رات رکھنے کے باوجود کبھی نخر و ناز نہیں کیا۔ ظاہری تکلفات سے ہمیشہ دور رہے۔ عام لوگوں کی طرح سادہ زندگی بسر کی۔ امیری میں بھی فقیری کی اور اس امارت میں بھی فقر و سلوک کی منزل طے ہوتی رہی۔ طبیعت میں عاجزی و انکساری اتہا کی تھی۔ طریق گفتار میں آہستگی اور نرمی، انانیت کے بجائے ممنونیت۔ غرور، کم بینی اور خود ستائی نام کو نہ تھی۔ اپنی تعریف کسی کی زبان سے سُنانا پسند نہیں کرتے تھے۔ اگر کبھی کسی نے ان کے کلام کی تعریف کی بھی تو یہ کہہ کر مال دیتے تھے کہ یہ آپ کی قدر دانی ہے۔ اگر کوئی مدح میں اشعار لکھ لاتا تو اس کے سُسنے سے بھی گریز کرتے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ راقم الحروف کسی شاگرد کی غزلِ اصلاح کے لیے مناد ہوا ہے اور درمیان میں ایسا شعر بھی آگیا ہو جس میں ان کا اسم گرامی

ہو تو اس کو قلمزد کردادیتے عادت ابو العلائی اچھے شاگردوں میں تھے۔ ان کی ایک غزل کا مقطع تھا۔

اصل :- نہ کیوں ہونا ز مج کو شاعری پر اپنی اے عادت  
جلیل القدر کا شاگرد ہوں یہ فخر کافی ہے  
مری کیا شاعری جس پر ہو مج کو ناز اے عادت  
اصلاح :- جلیل القدر کا شاگرد ہوں یہ فخر کافی ہے

اصلاح کے ساتھ لڑتے یہ تحریر کیا ہے۔ اپنی شاعری اور اپنے استاد کی نسبت تعلی کرنا امیری سلسلے کے منافی ہے۔ یہاں کا اصول بالکل خاموشی ہے۔

اسرار اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ اپنے شاگردوں کو ہمیشہ اپنے نام کے ساتھ تلمذ ظاہر نہ کرنے کی ہدایت دیتے۔ دکن میں جلیل کا حلقہ احباب محدود اور مخصوص تھا تاہم ان کی ذات ایک وسیع حلقے کے لیے باعث کشش بن گئی تھی۔ اس ہجوم میں دوست احباب اور عقیدتمندوں کے ساتھ فیضیاب ہونے والے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد تھی۔ ان میں ہر درجہ اور طبقہ کے لوگ تھے۔ ادیب، شاعر، دانشور، علما، مشائخین، عمائدین سلطنت اور عام افراد وغیرہ۔ استاد شاہ ہونے کے خیال سے بعض اصحاب یہ خیال لیکر آتے کہ ملاقات کے لیے شاید وقت کا تعین کر دانا ہوگا۔ دریاؤں کی چابلوں یا گھنٹوں انتظار کی زحمت اٹھانی پڑیگی لیکن عموماً یہ ہوتا کہ اطلاع کر دانے پر وہ باہر آ جاتے کسی کو غزل سنانی یا دیکھانی ہوتی اور کسی کو کوئی ادبی نکتہ معلوم کرنا ہوتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کسی اختلافی ادبی مسئلہ کے دونوں فریق آ جاتے اور اس بارے میں جلیل کا قطعی فیصلہ چاہتے۔ ان کے علاوہ جامعہ مندوں کا ایک گروپ اور بھی تھا۔ کسی کو سہرا لکھوانے کی ضرورت ہوتی کسی کو تاریخ پیدائش یا تاریخ وفات لکھوانی ہوتی۔ کوئی نعت شریف کی فرمائش کرتا کوئی قوالی کے لیے کلام مانگتا۔ جلیل اپنی عظیم الفرصتی کے باوجود انکار نہ کرتے۔ سب کی فرمائش حتی الامکان پوری کرتے۔ بعد ازاں یہ فرمائشیں بھرتی کر پہلے تو مارا کر دگستاخ۔ حد سے زیادہ ہو گئیں۔ اس کا اندازہ غزل کے

ایک مقطع سے کیا جاسکتا ہے۔

جلیل احباب کی فرمائشوں سے ناک میں دم  
سمجھ رکھا ہے سب نے شعر ہی سانچے میں ڈھلتے ہیں

عام لوگوں کے ماسوازی دجاہت اصحاب کے ساتھ بھی ملاقات میں یہی عجز  
دانکسار تھا۔ بے تکلفی اور سادہ دلی کے باوجود آداب و حفظ مراتب کا برابر خیال  
رکھتے۔ پروفیسر محمد اعظم کے الفاظ میں :

..... (جلیل) سے ملاقاتوں میں میں نے ایسی خوبیاں  
پائیں جو اس زمانے کے لوگوں میں عفتا ہیں۔ وہ ملنے میں  
اس قدر تکلف اور حفظ مراتب کا اتنا خیال رکھتے تھے  
کہ اس زمانے میں ہمیں اس کی مثال نہیں ملتی۔“ اے

## اختلافی مسائل سے مفاہمت اور رائے

جلیل کا تعلق دبستان لکھنؤ سے تھا۔ اس طرح کہ وہ امیر میانی کے شاگرد  
تھے۔ امیر کو اسیر سے تلمذ حاصل تھا۔ اور اسیر کا سلسلہ مصحفی سے ملتا ہے جس پر  
جلیل کو ناز تھا۔

اس شخص کا جلیل کیا کہتا مصحفی کی زبان ہے گویا !  
دلی اور لکھنؤ دبستان کی چشمک ڈھکی چھپی نہیں۔ مختلف ادوار میں ان کے  
درمیان جو معرکے ہوئے اور گرما گرم بحثیں چلیں ان کے لٹریچر کا ذخیرہ بہت ضخیم ہے  
یہاں اس محل و موقع پر چند ایک ادبی معرکوں کا ذکر وہاں دلی چپی سے خالی نہ ہوگا۔  
جس میں جلیل نے بھی حصہ لیا تھا۔ دیکھنا یہ ہے کہ بحث و اختلافات کے اس بحوم میں  
انھوں نے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کس انداز میں کی۔

لکھنؤ کے دیا شنکر نسیم کی شہسوار پرچم دلوں شرار اور چکیت کا معرکہ

چھڑا ہوا تھا اور مختلف حضرات کی طرف سے تحقیق و تنقید ہو رہی تھی اس وقت جلیل بھی اس بحث میں شریک ہوتے تھے۔ یہ ادبی معرکہ ایسا تھا کہ اس میں ایک طرف تو خود لکھنؤ والے آپس میں اُلجھ پڑے تھے، دوسری طرف مولانا حالی کی وہ تنقید اور اعتراضات بھی زیر بحث آگئے تھے جو انھوں نے گلزار نسیم پر کئے تھے۔

ہوایہ تھا کہ چکبست نے گلزار نسیم کا نیا ایڈیشن شائع کرتے ہوئے اس کا مقدمہ لکھا۔ اس میں انھوں نے نسیم کو بعض اساتذہ لکھنؤ پر فی الجملہ ترجیح دی۔ یہ بات بعض اصحاب کو ناگوار گزری اور بات بڑھ گئی۔ سب سے پہلے مقدمہ پر عبدالحلیم شرر لکھنوی نے تنقیدی نظر ڈالی۔ اور نسیم کی مثنوی پر چند اعتراضات کئے۔ یہ اعتراضات جب رسالہ دگلداڑ ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئے تو ایک جماعت نے پسند کیا دوسرے نے غلط قرار دیا۔ اس طرح اس معرکہ میں چکبست و شرر کے علاوہ حسرت سہانی، شوق قدوائی، جلیل ماکپوری، حکیم برہم اور خاتون کنٹوری شامل ہو گئے۔

جلیل نے دونوں طرف کے بحث و مباحثہ کو نظر میں رکھتے ہوئے باہمی ہمت و یکسوئی کے لیے جن معتدل اور متوازن خیالات کا اظہار کیا تھا وہ یہ ہے :

”مدوح کی ستائش میں جس قدر مبالغہ کیا جائے جائز ہے“

مگر یہ طریقہ اچھا نہیں کہ اس کے مقابل دوسرے کا پہلو

دیا جائے۔۔۔ آپ [مخاطبت چکبست سے ہے]

کو اس کا حق کیا ہے کہ اپنی رائے سے ایک دوسرے کو

مقابل بنا کر آپس میں لڑا دیجئے۔۔

حیرت یہ ہے کہ مسٹر چکبست کی بحث شاعرانہ

پر قابل حضرات نے اس قدر توجہ کیوں فرمائی۔ سکوت

سے بہتر کوئی جواب نہ تھا۔“ لے

جلیل کا یہی مسلک یا آدیزش سے گریز کی پالیسی تھی جس نے انھیں حلقہ دبستان

میں مقبول بنا رکھا تھا۔ یہ بحث جہاں آگے چل کر یہ موڑ لیتی ہے کہ گلزار نسیم اور سحر البیان کا موازنہ شروع ہو جاتا ہے تو جلیل اس تکرار کو مزید بڑھنے سے روکنے کے لیے کسی معتدل و متوازن طریقہ پر اظہارِ خیال کرتے ہیں :

”ثنوی میر حسن دہلی کے لیے سرمایہٴ فخر ہے اور گلزار نسیم لکھنؤ کے لیے دجہ ناز۔ اور یہ کچھ آج کی تصنیفیں نہیں ان پر کئی دور گزر چکے ہیں اور ہر دور میں یہ دونوں مقبول رہیں۔ اب اگر اہل دہلی سحر البیان کی بُرائی کریں یا اہل لکھنؤ گلزار نسیم کو محو فرمائیں تو یہی کہا جائے گا کہ اپنے عیوب آپ کھولتے ہیں۔“ ۱

اسی سلسلے کی ایک کڑی پر ذیفر محمد اعظم کا حسب ذیل بیان ہے جو ان کے اور جلیل کے درمیان ایک گفتگو کا حاصل ہے :

”پینٹ دیا شکر نسیم کی مشہور ثنوی گلزار نسیم سے متعلق جو اختلاف رائے ہو گیا تھا اور لکھنؤ میں جو دو مکتبِ خیال قائم ہو گئے تھے اس کا ذکر آیا تو میں نے ان (جلیل) سے پوچھا کہ آپ کے خیال میں شرر اور چلبست کی علمی معرکہ آرائی میں کون حق بجانب تھا۔ تو فرمانے لگے۔ حضرت! اس میں تو سرسر شرر کی زیادتی تھی۔ گلزار نسیم کا کیا کہنا وہ تو ایک سدا بہار گلزار ہے۔ اس کی یاری کیوں اور نازک خیالیوں کو سمجھنے کے لیے تو ایسی غوامی کرنی پڑتی ہے کہ دماغ چکر اجاتا ہے۔“ ۲

جلیل کا یہی وہ رویہ تھا جس کے باعث ان کے یہاں کی ادبی نشستوں اور صحبتوں میں اختلافات کی گونج بہت کم سنائی دیتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ

دہقان لکھنؤ کی شاعری کے بڑے طرفدار و پرستار تھے اور کوئی اس کے خلاف بولتا تو ناگواری کا اظہار کرتے تھے تاہم اگر کبھی ملنے والے اربابِ ذوق دہلی اور لکھنؤ دہقان کے اختلافات لے بیٹھے تو انھیں نصیحت کرتے اور کہتے کہ بنیادی طور پر دونوں مکاتیب خیال درست و مکمل اور مستند ہیں۔ ذیلی اختلافات میں الجھنا دانشمندی نہیں۔ چنانچہ دہلی اسکول کے اکثر حضرات آپ سے ہمید عقیدت رکھتے اور ادبی مسائل میں مشورہ حاصل کرتے۔

مرزا رحمت اللہ بیگ دہلوی کی ایک تحریر سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔  
 ”ان (جلیل) کی محفل میں دہلی اور لکھنؤ کی زبان کے جھگڑو  
 کا ذکر تک نہیں آتا تھا۔ میں نے ایک دفعہ ایک غزل سنانی  
 اس کا مطلع یہ تھا۔

مے ہے ساقی ہے بھری برسات ہے اب مری عورت خدا کے ہاتھ سے  
 قافیوں پر اعتراض کے ذکر پر انھوں نے کہا۔ دہلی والے ہاتھ  
 کو ہات بھی لکھتے ہیں چنانچہ داغ دہلوی مرحوم کا شعر سنایا  
 ضعف سے اٹھتے نہیں دست دُعا

اب ہماری شہرم اس کے ہاتھ ہے“ اے

اس کے علاوہ ایسے استفسارات یا سوالات جن کے جواب میں خواہ مخواہ  
 جھگڑا پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا خاصوشی اختیار کرتے مثلاً ڈاکٹر محمدی الدین قادری  
 نور نے ایک دفعہ تحریراً دریافت کیا۔ کیا اہلِ دکن کو اہلِ زبان کہہ سکتے ہیں؟  
 جواب میں یہ کہہ کر دامن بچالیا کہ اس تعلق سے مختلف رائے ہو سکتی ہیں۔

جو وضع داری جلیل کی زندگی میں تھی وہی زبان و بیان اور صحت الفاظ کے تعلق  
 سے تھی۔ قدام اور استادانِ سخن کی روش سے سرگرم نیز یا بے راہروی کسی قیمت پر  
 گوارا نہ تھی۔ یہی سبب ہے کہ بقول سلیمان ندوی ان کے کلام سے زبان کے الفاظ

محاورات اور امثال کی تصدیق ہوتی ہے۔ جلیل قواعظ کے سختی سے پابند تھے اور اس معاملہ میں کسی کا پاس اور کسی قسیم کی رواداری روا نہیں رکھتے تھے۔ اپنی بے لاگ رائے دوڑا دیتے تھے۔

نور اللغات کی تدوین کے دوران اس کے مولف نور الحسن نے ایک استفاء میں جناب داغ دہلوی کا یہ شعر لکھ بھیجا:

اک اداستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی

ان تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

اور دریافت کیا۔ ادا چھانا زبان کے اعتبار سے درست ہے یا نہیں۔ اس کے جواب میں جلیل نے لکھا:

”ادا چھانا، غمزہ چھانا یا ناز چھانا درست نہیں۔ داغ

صاحب نے جو ادا چھانا کہا ہے۔ وہ تنہا انھیں کی گویائی

ہے،“ لے

ایک تفسر نے غالب کا یہ شعر لکھ بھیجا:

قیامت ہے کہ ہودے مدعی کا ہمسفر غالب

وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جاتا ہے مجھ سے

اور دریافت کیا کہ اس میں تہ کا استعمال درست ہے یا نہیں۔ اس کے جواب میں جلیل نے اپنی رائے دی:

”ایک ہی جملے میں تہ کو لانا جیسا کہ اس شعر میں ہے درست

نہیں ہے۔ اس جگہ نہیں کہتے ہیں۔ صحیح جملوں ہے۔

وہ کافر جو خدا کو بھی نہیں سونپا جاتا۔“ لے

ایک اہل ذوق نے غالب کا ایک شعر لکھ کر ”نذر کرنا“ کے تعلق سے ایک استفسار کیا۔ جلیل نے اس کی توضیح یوں کی:

نذر فی نفسہ مونث ہے جیسے نذر گورانی گئی۔ لیکن پیش کرنے اور دینے کے معنی میں اس کا استعمال تذکیر کے ساتھ ہوتا ہے جیسے یہ مال آپ کے نذر ہے مثلاً تسنیم کا یہ شعر  
 زہد و تقویٰ آتے ہی فصل بہار کر دیا سب نذر میں نے جام کے  
 غالب کے اس شعر میں :

غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے سلیں  
 حسیج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

نذر پیش کرنے کے معنی میں جو مونث کہا ہے زبان کے خلاف ہے  
 جناب ریاض خیر آبادی کو اپنے ایک مکتوب میں موٹر کی تذکیر و تائید پر یوں لکھتے ہیں۔  
 ”معلوم ہوا ہے کہ آپ نے موٹر کو مذکر باندھا ہے اور یہ  
 مصرع کہا ہے

موٹر اتنے فنق اتنے کہ مدہ ہو جن کا شمار

دکن میں علی العموم ہونٹ بولتے ہیں اور ہماری زبان پر بھی  
 مونث ہی ہے اگر ہندوستان میں مذکر قرار پا گیا ہے تو براہ کرم  
 اس سے مطلع کیجئے۔ قرینہ تو مونث ہی کا ہے کیوں کہ تمام  
 گاڑیاں مونث بولی جاتی ہیں اور ریل بھی۔ فنن کو مذکر  
 کہنا ہماری زبان کے خلاف ہے۔ بہر حال جمہور کا جو  
 استعمال ہوا اس سے آگاہ و مستفیض فرمائیے“ لے

ماہر القادری کے ایک شعر میں ”نغمہ گانا“ کے استعمال پر ایک بڑا ادبی معرکہ ہوا۔ ماہر کا شعر تھا  
 ہم نشیں آمل کے گائیں نغمہ دل کے ساز پر

میں محمد کو پکاروں تو خدا کا نام لے

اس شعر پر عبدالرحیم شبلی معاون مدیر عالمگیر نے سب سے پہلے بحث چھیڑی

بحث یہ تھی کہ ”نغمہ گانا“ زبان ہے یا نہیں۔ اس بحث میں مختلف شعرا اور ادیبانے اپنے اپنے خیال کا اظہار کیا جس میں یگانہ چنگیزی، سیما اکبر آبادی، جلیل ماکپوری، صفی لکھنوی، آثر لکھنوی، کسری منہاس اور جوش ملیحانی نے حصہ لیا۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ جلیل نے کسی بے لاگ رائے دی اور اس رائے کو کیا وزن ملا۔

کسری منہاس [لاہور] نے بحث کا آغاز کرتے ہوئے لکھا کہ اساتذہ فن کے یہاں اس روزمرہ ”نغمہ گانا“ کا استعمال قطعی نہیں۔ اپنے بیان کی دلیل میں انھوں نے حضرت جلیل کی رائے کا حوالہ یوں دیا:-  
 ”استاد جلیل کی خدمت میں میں نے ایک غزل برائے اصلاح مرسل کی تھی جن کا ایک شعر یہ تھا:

نغمے خوشی کے گائے ہزاروں ہزار نے

گھونگھٹ اٹھا جو رخ سے جس بہار کا

مروج نے مصرع اول میں ”نغمہ“ کو ”گائے“ سے بدل دیا اور

ساتھ ہی یہ نوٹ بھی لکھ دیا۔ ”نغمہ گانا زبان نہیں“،

کسری منہاس کے بیان میں جلیل کا جو حوالہ دیا گیا تھا اس کا سہارا کئی اساتذہ سخن نے لیا۔ جعفر علی خاں آثر لکھنوی:

”شاعری میں ایک بحث چھڑی ہے کہ ”نغمہ گانا“ صحیح ہے

یا غلط۔ میری رائے میں حضرت جلیل مروج کا فیصلہ ناظر ہے

کہ ”نغمہ گانا زبان نہیں“،

صفی لکھنوی نے رائے دی:

”معاورہ اردو میں نغمہ گانا یا سرگانا مستعمل نہیں اس لیے ”نغمہ گانا“

قطعی غلط ہے“

جوش ملیحانی نے لکھا:

”حضرت جلیل اور مولانا صفی کی رائے ”نغمہ گانا“ کے خلاف ہے“

تو مزید بحث کی گنجائش نہیں،

بیخود دہلوی نے اظہار خیال کیا:

”نغمہ گانا کوئی محاورہ نہیں۔ گیت گانا، غزل گانا یا مرث

گانا اہل زبان کا محاورہ ہے۔ اردو میں ہرگز کوئی نغمہ گانا

نہیں بولتا۔“

دل شاہجہاں پوری نے کہا:

”بھوجا جب استفسار کہ نغمہ گانا صحیح ہے یا غلط؟ گزارش

ہے کہ محکو جناب لڑاب نصاحت جنگ جلیل کی رائے سے

اتفاق ہے۔“

سیات ابر آبادی، یگانہ چنگیزی اور الم مظفر نگری نے نغمہ گانا کو درست قرار

دیا۔ الم صاحب تو جوش جذبات میں یہاں تک کہہ گئے۔

”واقعہ یہ ہے کہ بعض حضرات جلیل کی رائے سے مرعوب

ہو گئے اور اس مسئلہ پر غور و فکر کی زحمت گوارا نہیں فرمائی

بلاشبہ حضرت جلیل ہر طرح واجب الاحترام ہیں اور ان

کی ادبی خدمات لائق اعتنا و ستائش، مگر اس کے معنی نہیں

کہ ان کی ہر رائے کو بلا غور و فکر تسلیم کر لیا جائے۔“

حاصل کلام یہ کہ جلیل کی رائے ہی بکثرت آرا تسلیم کی گئی۔

اس سلسلے میں ایک اور ادبی معرکہ کا ذکر بھی ضروری ہے جس میں جلیل نے اپنی

قطعی رائے کا اظہار بڑے اعتماد کے ساتھ کیا۔ یہ بحث لفظ ”چاہئے“ سے متعلق ہے۔

چاہئے میں قدیم ایام سے صرن ایک لفظی تغیر دیکھا جاتا ہے۔ یعنی جب اسم

جمع ہوتا ہے تو چاہئے کی جگہ چاہئیں لکھتے اور بولتے ہیں۔ لیکن سب سے پہلے اخبار

فصح الملک غازی آباد میں ایک سوال اٹھایا گیا کہ ”ریاض الاخبار“ میں ”غزلیں آنا چاہئے“

نکھا ہے حالانکہ چاہئیں ہونا چاہیے۔ اور ایک بڑا حصہ ملک کا اسی کا عامل ہے۔ اسی اخبار کے مدیر نے آخر میں لکھا۔ جناب جلیل کو اگر فرصت ہو تو وہ اس بحث پر ایک بسیط نظر ڈال کر ممنون فرمائیں۔

چنانچہ ۱۲ مئی ۱۹۰۶ء کے ریاضی لاخبر میں جلیل کی یہ رائے بھی

”چاہیے کہ بحالت جمع چاہئیں کہنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں

ہوتی۔ یہ ایک غلطی ہے جو اکثر اخبارات میں رائج ہو گئی

ہے۔ اس غلطی کی گرفت سب سے پہلے عالیجناب

وزارت مآب بین السلطنت نے فرمائی تھی۔ بعض اصحاب

چاہیے کو لفظ جمع کی حالت میں چاہئیں لکھتے ہیں۔ مثلاً

دوائیں دی جانی چاہئیں۔ یہ درست نہیں۔ چاہیے ہمیشہ

اپنی حالت میں رہتا ہے۔ اس میں تغیر نہیں ہو سکتا۔۔۔۔

حضرت فصیح الملک دارغ دہلوی کا کلام دفتر دفتر

موجود ہے مگر وہ دو ایک جگہ بھی اس کے عامل نہیں پائے

جاسکے۔“ اے

لفظ دادی کی تذکیر و تانیث کے تعلق سے ایک صاحب ذوق سید محمد اختر اختر

گنبدوی کو ان کے ایک استفسار کے جواب میں رداع عام کے خلاف بڑی قطعیت کے

ساتھ اپنی رائے دی ہے۔ جواب میں لکھتے ہیں،

”مکرمی سلام سنون

آپ کا لٹاؤد شنہ آیا۔ یاد آؤدی کا شکریہ۔ یہی سخت

عظیم الفرصت ہوں جواب میں تاخیر ہوئی۔ اس کو معاف

فرمائیے گا۔

دادی کا استعمال شوا کے یہاں جہاں تک دیکھا گیا مذکر

ہی پایا۔ چنانچہ دو شعر نقل کئے جاتے ہیں

دل کو کس وقت خیالِ رخ روشن نہ ہوا ہم سے رحلت میں جدا داری امن نہ ہوا  
دلے قسمت پاؤں اپنے رہ گئے تھک کر امیر دادی مقصود جب دو چار منزل رہ گیا  
فرہنگِ آصفیہ میں وادی کو مونث لکھا ہے لیکن نہ کوئی شعر ہے  
اور نہ شعر کا کوئی فقرہ ہے جس سے مونث ہونے کا ثبوت  
ہو سکے۔

وادی اگر مونث ہوتا تو اس کی جمع حسب قاعدہ وادیاں  
ہوتی مگر جب مونث ہونا قرار نہیں پاتا تو مذکر کی جمع صرف  
انفال میں کی جائے گی۔ لفظ وادی میں کوئی تغیر نہ ہوگا۔ یعنی  
تمام وادی سیلاب سے بھرے پائے گئے اس میں دہلی کھنڈ  
کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ وادی کو بے تکلف مذکر استعمال  
کرنا چاہیے۔ باقی خیریت۔ والسلام  
نیازمند فصاحت جگ جلیل لے

## معاصرین کے ساتھ تعلقات

جلیل کے کردار کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ اپنے معاصرین کا نام بڑے احترام  
سے لیتے تھے۔ رشک و حد اور تعلیٰ شہر کا عام خاصہ ہے لیکن جلیل پر یہ مثل صادق  
نہیں آتی کہ بوجہ ہم پیشہ باہم پیشہ دشمن۔ سب سے بڑے خلوص اور خندہ پیشانی سے  
ملتے۔ بڑی گرمجوشی سے ان کا استقبال کرتے۔ اس میں کھنڈ یا دہلی کے دبستانوں کی  
کوئی تفریق نہ تھی۔ تمام معاصرین کے ساتھ نہایت خوشگوار تعلقات تھے۔ چنانچہ جب ان  
کا پہلا دیوان تاجِ سخن چھپا تو اس کو سر ہننے والوں، اور قطعہ تاریخ نکالنے والوں میں سارے  
ہندو دکن کے معاصرین شامل تھے۔ ان میں جلیل کے خواجہ تاش یعنی حضرت امیر میانی کے

تلاذہ، داغ دہلوی کے تلاذہ دہلی، لکھنؤ، لاہور اور دکن کے معروف اور استاد شاعروں کی بڑی تعداد تھی مثلاً ریاض خیر آبادی، ممتاز علی آہ، ظہیر دہلوی، دلی شاہ بھماں پوری، حکیم برہم، حفیظ جونپوری، شوکت بلگرامی، کوثر خیر آبادی، احسن مارہروی، عزیز جگ دلا، احسن مارہروی، عزیز لکھنوی، سائل دہلوی، کاظم حسین شیفتہ کلنٹوری، وسیم خیر آبادی اور کاظم حسین محشر لکھنوی وغیرہ۔

جہاں تک مرزا داغ اور جلیل کے باہمی تعلقات کا سوال ہے ان کے درمیان کچھ چشمک کی باتیں سننے میں آتی ہیں لیکن حقیقت کیا ہے اس کی وضاحت ضروری ہے۔ جلیل جب اپنے استاد امیر مینائی کے ساتھ حیدر آباد آئے اس وقت مرزا داغ دہلوی یہاں استاد شاہ تھے۔ دکن میں داغ و جلیل کی یکجہتی ۳۴ سال رہی۔ اس عرصہ میں داغ دہلوی بحیثیت استاد شاہ اور جلیل بحیثیت جانشین امیر مینائی اپنی اپنی فکر کے جوہر دکھا کر مطلع دکن پر چھارہ ہے تھے۔ جناب جلیل نے یہاں کے مشاعروں میں شہرت و مقبولیت حاصل کی جن میں دکن کے علاوہ دہلی اور لکھنؤ کے ارباب سخن کی ایک بڑی تعداد شریک رہتی تھی، ان میں مرزا داغ کے شاگردوں کا ایک بڑا گروہ ہوتا تھا۔ جلیل کے معتقدین اور شاگردوں نے بھی اپنا حلقہ بنا لیا تھا۔ ان میں دونوں جانب کچھ ایسے بھی تھے جو جلیل و داغ کو ایک دوسرے کا مد مقابل قرار دیکر ان دونوں کے درمیان اختلافات بڑھا رہے تھے۔ لگائی بٹھائی کرنے والوں نے مرزا داغ کو یہ احساس دلایا کہ جلیل کا ورود حیدر آباد میں ان کے شاعرانہ مرتبت و عظمت کے لیے نیک فال نہیں ہے۔ با اینہم یہ ممکن نہیں کہ جلیل کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے جناب داغ کو واقعی فخر و پریشانی رہی ہو۔ حقیقت جو بھی ہوتا ضرور تھا کہ ان کے شاگردوں اور ماننے والوں میں تعادل کا یہ رجحان عام ہوتا جاتا تھا۔ ۲

نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر مشاعروں میں جن میں داغ اور جلیل اپنے اپنے تلاذہ کے

۱۔ کسری مہناس۔ جلیل اپنے آئینے میں نقوش سالنامہ ۱۹۶۶ء ص ۲۳۲

۲۔ ذکی کا کوری۔ جلیل مانکیوری۔ ص ۵۳

ساتھ شریک ہوئے ادبی چشمیں شروع ہو گئیں۔ اگرچہ لڑک جھونک شاگردوں کے مابین ہوتی تھی جس کا تعلق ان حضرات کی ذات سے نہ تھا پھر بھی وہ ان اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکے۔ مرزا داغ کے بعض شاگرد تو چھپ چھپ کر جلیل کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔ اسی زمانے میں جلیل نے ایک غزل کہی جو بہت مقبول ہوئی اس کا مطلع یہ تھا۔

کوئی حسین ہو ہیں اک نگاہ کر لینا جگر کو تھام کے چپکے سے آہ کر لینا  
مقطع میں جلیل نے فرمایا تھا

وہ جس سے ملتے ہیں اس سے ضرور کہتے ہیں

جلیل سے نہ کہیں رسم و راہ کر لینا

اس مقطع پر لوگوں کو گمان ہوا کہ یہ اشارہ مرزا داغ کی طرف ہے جو اپنے احباب اور شاگردوں کو جلیل سے نہ ملنے کی تاکید اس سبب سے کرتے تھے کہ ان سے مل کر کہیں ان کی خوشگویی کے گردید نہ ہو جائیں۔ یہ روایت خواہ درست ہو یا نادرست ہو اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ داغ و جلیل کے معتقدین کے درمیان تناؤ ضرور پیدا ہو گیا تھا جس کا اظہار ذیل کے واقعے سے ہوتا ہے۔

درگاہ حضرت فیض پر ہونے والے ایک مشاعرہ میں جلیل کے علاوہ ظہیر دہلوی اور ترکی صاحب بھی شریک تھے۔ اس مشاعرہ میں بوجہ شہرت و مقبولیت اور حاضرین کے اشتیاق کے مد نظر جلیل کو ظہیر دہلوی سے پہلے پڑھایا گیا۔ اس پر ظہیر دہلوی نے ناراض ہو کر اپنی غزل چاک کر کے پھینک دی اور داغ اپنے شاگردوں سے ناراض ہو گئے کہ انہوں نے بائیکاٹ کیوں نہ کیا۔ بعد ازاں مرزا داغ نے ہمارا جہ شادی خدمت میں ایک غزل گویا کہ:

گرانا۔ اس مکتوب سے مشاعرہ کے معرکوں کا اندازہ بھی کیا جاسکتا ہے،

”عالمیاجاب معلی القلوب یمن السلطنة ہمارا جہ سرکش پڑا دلا رہا کہی

تسلیم قبول ہو۔ کل جو مشاعرہ فیض صاحب کے مزار پر

ہوا ترکی صاحب کی کیفیت نفاق مجھ پر نکشف ہوئی۔

بہت بہتر کیا سید ظہیر الدین صاحب نے جو اپنی غزل چاک کر کے

اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میں اپنے شاگردوں سے سخت ناراض  
 ہوں کہ وہ ان کے ساتھ کیوں نہ اُٹھے۔ ظہیر کو خدا  
 جانے لوگوں نے کیا سمجھا۔ میں ان کا طرفدار بدل ہوں۔  
 اس کی وجہ کیا کہ ان کا نمبر توڑ کر جلیل صاحب کو  
 پڑھوایا گیا اور ان (ظہیر دہلوی) کے آگے سے شیع  
 اُٹھالی۔ یہ سب چالاکیاں ترکی صاحب کی تھیں میری  
 غزل جو پڑھی گئی تو ترکی صاحب نے کہا ایک شعر  
 اچھا ہے۔ جلیل صاحب کی غزل کی تعریف میں وہ جو  
 کہتے تھے سُننے والوں کو ہنسی آتی تھی۔ داغ مضمون  
 کہنا نہیں جانتے۔ جلیل مضمون کہنا جانتے ہیں۔ امیر کو  
 تو یہ مجال نہیں ہوئی۔ جلیل کیا داغ کو مٹا سکتے ہیں۔  
 میری اصلاحی غزل کو خدا کی شان ترکی صاحب سمجھیں  
 اور نیک و بد بتائیں۔ ضروری گزارش یہ ہے کہ ان  
 کو اصلاحی غزل نہ دکھایا کیجئے اور میرے پاس بھی ان  
 کو نہ بھیجے گا۔ میں منافق سے یلنا نہیں چاہتا۔“  
 فصیح الملک داغ لہ

اس خط سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ جناب داغ کو ساری شکایت  
 ترکی صاحب سے تھی اور انھیں پراخوں نے اپنا سارا غصہ اتارا ہے۔ دوسری طرف اس

تحریر سے کوئی ایسی بات ظاہر نہیں ہوتی جس سے یہ اندازہ ہو کہ مرزا داغ کو جلیل سے کوئی شکایت تھی۔ اس میں شک نہیں کہ مشاعرہ کی ان چشمکوں میں زیادہ ہاتھ دونوں کے طرفداروں کا تھا۔ اس کی ذمہ داری داغ اور جلیل پر راست عائد نہیں ہوتی۔ جیسا کہ تمکین کاظمی کی ایک تحریر سے ظاہر ہوتا ہے جس کا ذکر ڈاکٹر عبدالحق انصاری نے اپنی سوانح جلیل میں کیا ہے۔ اسی مشاعرہ والے واقعہ کی نسبت جناب کاظمی اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ مشاعرہ میں۔ اختر و جلیل نے ترکی کی زبان سے ظہیر و داغ کے خلاف کہلوایا۔ ظہیر برا فروختہ ہو گئے اور سارا قصہ داغ کو کہہ سٹایا۔ ہمارا جہ کش پر شاہ د ترکی پر بہت خفا ہوئے۔ ترکی نے اختر و جلیل سے قطع تعلق کر لیا۔<sup>۱</sup> لہ

کاظمی صاحب کے اس الزام کی تکذیب خود انہی کے بیان سے ہوتی ہے۔ تمسکی کے حالات میں وہ لکھتے ہیں۔

”لوگوں کے کلام پر اعتراض کرنا ان کا مشغلہ تھا۔ ان کی یہ عادت نا حیات رہی۔ مشاعروں میں بھی کسی نہ کسی پر اعتراض کر کے ہنگامہ برپا کر دیتے تھے۔“<sup>۲</sup>

حقیقت یہ ہے کہ جلیل کی مرعجاں مرغ طبعیت کے پیش نظر اس قسم کی معاملہ چشک ان کی ذات سے منسوب نہیں کی جاسکتی۔ سچ ہی ہے کہ جب تک جناب داغ یقید حیات رہے جلیل اور داغ کے باہمی تعلقات بہت پاک صاف رہے۔ جلیل ان کا احترام دیا ہی کرتے تھے جو استاد شاہ ہونے کی حیثیت سے موزوں و مناسب تھا۔

ڈاکٹر عصمت جاوید کی اس تحریر سے بھی میرے بیان کی تہدیق ہوتی ہے۔

”جلیل مانچوری امیر نیائی کے شاگرد و رشید بھی تھے اور شاگرد معنوی بھی۔ وہ اپنے استاد کی طرح متقی، (بیدار، پرہیزگار،

وضع دار اور بزرگوں کے قدر دان تھے۔ پھر وہ اپنے استاد

۱۔ ڈاکٹر عبدالحق انصاری۔ جلیل مانچوری۔ ص ۶۵

۲۔ تمکین کاظمی۔ ماہنامہ نقوش لاہور۔ شخصیات۔ نمبر ترکی اور محلی۔ ص ۱۲۲۵

کے محسن داغ جیسے بزرگ کے خلافت کوئی بات بھی ذہن میں  
کیسے لاسکتے تھے البتہ پیراں نمی پرند و مریداں می پرانند  
کے مصداق شاگردوں نے ممکن ہے جلیل کے خلافت داغ  
کے کان بھرے ہوں، اور داغ کے دل میں رنجش پیدا ہو گئی  
ہو۔ لیکن بحیثیت مجموعی ان دونوں اساتذہ فن کے درمیانی  
تعلقات ناخوشگوار نہیں تھے، اے

مقامی اور بیرونی معاصرین اہل قلم اور شعرا جو جلیل سے ملنے آتے ان میں جوش  
ملیح آبادی۔ خانی بدایونی۔ عزیز جنگ دلا۔ علی اختر۔ اتحاد حیدر آبادی۔ مرزا فرحت اللہ بیگ  
حرّت موہانی۔ علامہ اقبال۔ حیرت بدایونی۔ حسن نظامی۔ جگر مراد آبادی۔ مولانا سلیمان ندوی  
حبیب الرحمن شروانی۔ عبداللہ عماری۔ ضیا یار جنگ اور تنہا عمار پوری کے نام قابل  
ذکر ہیں۔ جلیل ان سے نہ صرف محبت و مروت سے پیش آتے بلکہ ان کے کلام و  
خدمات کا اعتراف بھی بڑی فراخ دلی سے کرتے تھے  
مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی اپنی ملاقاتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”خدا معلوم کیا بات ہے کہ تین پرانی تہذیب کا دلدادہ ہوں  
اور یہی وجہ ہے کہ میں حافظ جلیل حسن جلیل کا شاگرد رہا تو  
نہیں مگر ایک عرصہ تک ان سے عقیدت رہی ہے میں چھو  
گی طرح ان سے ملتا اور وہ بزرگوں کی طرح پیش آتے۔  
اطلاع کروائی اور وہ فوراً باہر نکل آئے۔ سب کی خیریت پوچھی  
اور اس کے بعد کہا کچھ لائے ہو۔ میں نے کہا۔ جی ہاں۔ اور کوئی  
غزل یا نظم سنائی۔ وہ جس طرح اچھے اشعار کی تعریف کرتے تھے  
اس سے کیا بتاؤں میرا دل کتنا بڑھ جاتا تھا“ ۳

۱۔ ڈاکٹر عصمت جاوید۔ پیش گفتار۔ جلیل مانیکپوری [ڈاکٹر عبدالخالق] ص ۱۹  
۲۔ خٹاوند علی آہ۔ لکھنؤ میٹائی ص ۱۳۵، ۱۹۴۱ء، ۳۔ اخبار میٹائی، جلیل تبرہ، ۱۷ جنوری ۱۹۴۶ء

جگر مراد آبادی جب بھی حیدر آباد آتے جیل کے یہاں ضرور تشریف لاتے۔ میری یادداشت میں ایک ملاقات محفوظ ہے۔ جناب جگر کے جیل منزل آنے کی خبر سن کر کچھ اور شائقین بھی جمع ہو گئے اور ایک شعری نشست کی صورت پیدا ہو گئی۔ جگر مراد آبادی نے سب سے آخر میں اپنا کلام سنایا۔ جگر صاحب کے ترنم سے پڑھنے کا سماں راقم الحروف کو اب تک یاد ہے۔ غزل یہ تھی

پھول کھلے ہیں گلشن گلشن لیکن اپنا اپنا دامن

والد مرحوم نے جب دل کھول کر اشعار کی داد دی تو جگر صاحب نے بڑی عقیدت و انکسار سے کہا تھا کہ۔ آپ یہ کیا فرماتے ہیں میں نے آپ کے کلام سے بہت استفادہ کیا ہے۔

مولانا سلیمان ندوی اپنی ملاقاتوں کے بارے میں لکھتے ہیں :

”خاکسار کو پہلی مرتبہ مارچ ۱۹۱۱ء میں نواب عماد الملک کے کتب خانے کو ندوہ میں لانے کے سلسلے میں حضرت استاد مرحوم کے حسب ایما حیدر آباد جانے کا اتفاق ہوا۔ وہ عقیدت جو حضرت جلیل سے تھی کشاں کشاں ان کے آستانہ تک لے گئی۔ بڑی محبت اور شفقت سے ملے۔ اس کے بعد جب کبھی حیدر آباد جانا ہوا ان کے یہاں حاضری دی۔“ ۱

۱۔ مولوی عبدالغفور شہر ندوی مددگار ندوۃ العلماء لکھنؤ نے جگر مراد آبادی سے متعلق مجھے یہ روداد سنائی تھی کہ لکھنؤ کی ایک محفل شعر میں جلیل کا یہ شعر زیر بحث آیا۔

نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں

وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

تو جگر صاحب نے کہا کہ اس شعر کے بدلے میں جلیل صاحب کو میں اپنا پورا دلوان دینے کیلئے تیار ہوں۔

۲۔ رسالہ معارف، مارچ ۱۹۴۶ء ص ۲۳۲۔

خواجہ حسن نظامی جب حیدر آباد آئے ضرور ملتے۔ اس بات کا ذکر انھوں نے یوں کیا ہے:

”۱۹۱۸ء میں جب پہلی بار حیدر آباد جانا ہوا اور حضرت جلیل سے واقف نہ تھا کیوں کہ میں شاعر ہوں نہ شعراء سے واقفیت رکھتا ہوں۔ ایک دن لڑاکا عوینہ جنگ و آلا سے ملنے گیا تو سنا کہ لڑکوں کے مکان کے سامنے حضرت جلیل بھی رہتے ہیں اور منشی امیر احمد صاحب مینائی کے صاحبزادے اختر مینائی بھی رہتے ہیں۔ ان دونوں سے ملا اور پھر معمول ہو گیا کہ جب حیدر آباد جاتا تو ان سے ضرور ملتا۔“ ۱

علی اختر بھی جلیل کے مشفقانہ سلوک اور حسن اخلاق سے بے حد متاثر تھے۔ کہتے ہیں:

”جو شخص ایک بار ان سے مل لیتا اس کے دل سے ان کی مروت و اخلاق کا نقش کبھی نہیں مٹ سکتا تھا۔“ ۲

پروفیسر محمد اعظم (جامعہ عثمانیہ) نے جلیل کی ملاقاتوں سے جو حفظ حاصل کیا اس کا ذکر یوں کرتے ہیں:

”... ملاقاتوں میں میں نے ان میں ایسی خوبیاں پائیں جو اس زمانے کے لوگوں میں عتنا ہیں۔ وہ ملنے میں اس قدر تکلف اور حفظ مراتب کا اتنا خیال رکھتے تھے کہ اس زمانے میں اس کی مثال نہیں ہو سکتی۔“ ۳

ڈاکٹر محمد اقبال ہمارا جہ کشن پر شاد شاد سے ملاقات کے لیے حیدر آباد آئے تو نہ صرف یہ کہ وہ حیدر آباد کے شعری ماحول سے متعارف ہوئے بلکہ یہاں کے اہل کمال سے بھی ملے۔ پاکستان کے محمد عبداللہ قریشی اپنی ایک تحریر میں اس کا ذکر

۱۔ اخبار میزان ۱۷ جنوری ۱۹۶۷ء

۲۔ اخبار رہبر وطن ۱۲ جنوری ۱۹۶۷ء

۳۔ مجلہ عثمانیہ جلیل نمبر ۲۶ ص ۵۷

یوں کرتے ہیں :

”اس وقت مہاراجہ کا آفتاب اقبال انتہائی عروج پر تھا۔

میر محبوب علی خاں کا آخری زمانہ تھا اور مہاراجہ نہ صرف ان کے صدر المہام تھے بلکہ ان کی شاہانہ وازشوں اور قدر افزائیوں

سے پوری طرح بہرہ باب تھے۔ ۱۹۰۸ء میں اقبال کی آمد پر

مہاراجہ نے ان کے اعزاز میں ہنایت شاندار دعوت کا

اہتمام کیا، مجلسی شعرو سخن بھی منعقد کی جہاں اقبال کی ملاقات

اس دور کے باکمال شعرا سے ہوئی ان میں ظہیر دہلوی، جلیل

مانپکوری، گرامی اور نظم طباطبائی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۱۹۰۹ء میں علامہ پھر حیدر آباد آئے تو گرامی کی صحبتوں سے مستفید ہوئے اور

حیدر آباد کی معروف شخصیتوں سے بھی ملے۔ اس موقع پر جلیل نے جو اس وقت تک اس

شاہ ہو چکے تھے اقبال کے اعزاز میں ایک عشا ئیہ ترتیب دیا تھا جس میں حیدر آباد کے

متعدد ممتاز شاعر دل اور ادیبوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔

بعد ازاں اقبال نے اس ملاقات کو ایک بیان کی صورت میں شائع کیا جو صحیفہ اقبال

نمبر حصہ اول کے صفحات ۵، ۱، ۱۰۶ پر چھپا ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے علامہ اقبال کی

سوانح ”زندہ رود“ کی دوسری جلد کے صفحہ ۴۴۴ میں اسی ذکر کو دہرایا ہے۔ ان کا ماحذ

بھی یہی ہے۔ علامہ کے الفاظ یہ تھے :

”میں گزشتہ سال حیدر آباد گیا تھا تو یہ ضروری بات تھی کہ

میں وہاں کے اہل کمال سے ملوں۔ چنانچہ حافظ جلیل حسن صاحب

جلیل مانپکوری کے ہاں میری دعوت ہوئی۔ وہیں مولانا ظہیر

دہلوی بھی تشریف رکھتے تھے۔ انہوں نے مجھ سے شعر چڑھنے

کا فرمائش کی تھی مگر سنانے سے زیادہ مجھے خود یہ شوق تھا

کہ ان کی زبان سے کوئی شعر سنوں۔“ اے

واضح رہے کہ علامہ کی پہلی ملاقات جو مہاراجہ شاد کی دعوت کے موقع پر جلیلی سے ہوئی اس وقت مرزا داغ کا انتقال ہو چکا تھا اور جلیلی کی مندرجہ جانشین آئینہ کی حیثیت سے تھی۔ دوسری ملاقات کے وقت جو جلیلی منزل میں ان کی جانب سے ترتیب دیئے ہوئے عشاءِ ثانیہ میں ہوئی تھی وہ استاد شاہ ہو چکے تھے۔

## خوش طبع، مشاغل و معمولات

منات سنجیدگی اور زہد و عبادت کے باوجود جلیلی زاہد خشک مطلق نہ تھے۔ بہت ہی خوش طبع و خوش مزاج۔ ملنے والا خواہ کوئی ہو چھوٹا یا بڑا بڑی خندہ پیشانی سے بات کرتے تھے۔ اچھی بات کا لطف تالی بجا کر لیتے تھے۔

وقت کی پابندی ان کی فطرت تھی جو تمام زندگی قائم رہی۔ مختلف مشاغل کے اوقات متعین تھے۔ راقم الحروف نے ان میں کبھی فرق آتا ہوا نہیں دیکھا۔ رات کے آخری پہر بیدار ہو جاتے صبح کی نماز باجماعت افرادِ خاندان کے ساتھ ادا کرتے تلاوتِ قرآن اور اوراد و وظائف کا سلسلہ طلوعِ آفتاب کے بعد تک جاری رہتا۔ نو بجے ناشتہ کرتے اس سے فارغ ہو کر باہر دیوان خانہ میں آ بیٹھتے۔ دیوان خانے دو حصے تھے۔ ایک بڑا ہال اور دوسرا اس کے سامنے اس سے ملحق دراندہ جو قدیم وضع کے صوفوں اور کرسیوں سے آراستہ تھا۔ دراندے میں دیواروں پر فریم آویزاں تھے جن میں بیل بوٹوں کے درمیان خطِ تعلیق میں ہنایت خوبصورتی سے لکھے ہوئے اشعار درج تھے۔

کارِ دنیا کے تمام گرد ہرچہ گیریدہ مختصر گیریدہ  
تم کو تو میں کہتا نہیں کچھ حضرت ناصح پیر جس کو ہو یک ایسی وہ عاقل نہیں ہوتا  
دوسرا شعر ان لوگوں کے لیے لکھوایا گیا تھا جو بلا ضرورت باتوں میں وقت ضائع

کرتے تھے۔ اندرونی ہال میں ایک صوفہ اور بیرونی دروازے میں ایک آرام کرسی والد مرحوم کے لیے مخصوص تھی۔ سامنے تپائی پر خاندان قریب ہی رکھا ہوتا۔ صوفے کے دائیں جانب النور الدین عقیق دفتر اصلاح کے ساتھ تیار موجود ہوتے۔ ۹ بجے صبح سے ۱۲ بجے تک جلیل کی نشست یہیں رہتی۔ پہلے کلام شاہی دیکھا جاتا، پھر شاگردوں کے کلام پر اصلاح دیتے۔ کبھی کبھی فکر سخن بھی کرتے۔ اسی درمیان ملنے والے آجاتے اور ملاقات کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ ۱۲ بجے اُٹھ جاتے۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد ۲ بجے تک قیلولہ کرتے پھر ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر باہر آ بیٹھتے۔ صبح کے کام کا سلسلہ پھر شروع ہو جاتا جو نماز عصر تک جاری رہتا۔ پھر مکان کے اندر چلے جاتے اور نماز مغرب سے کچھ قبل باہر آ بیٹھتے۔ یہ صرف احباب سے ملاقات کا وقت ہوتا۔ گرمیوں کے زمانے میں نشست کا انتظام صحن میں ہوتا۔ پروفیسر محمد اعظم ایسی ہی اک ملاقات کی تصویر یوں کھینچتے ہیں:

”جلیل منزل پر پہلی بار بلبل میں پہنچا گرمی کے دن تھے اور شام کا وقت۔ مکان کے صحن میں چھڑکاؤ ہو چکا تھا اور کرسیوں کا ایک حلقہ نیم دائرہ بنا رہا تھا جس کے بیچ میں ایک آرام کرسی پڑی تھی۔ اسی آرام کرسی پر ایک پیر مرد اکیلے بیٹھے بیچ ٹپھ رہے تھے۔“

میں نے صاحب سلامت کے بعد کہا جناب جلیل تشریف رکھتے ہیں۔ جی ہاں تشریف رکھتے تھے ہی جلیل کہتے ہیں، اے

نماز مغرب کے بعد پھر جو سلسلہ شروع ہوتا تو نماز عشاء سے جاملتا۔ نماز عشاء کے وظائف سے فارغ ہو کر پھر اندر آ جاتے۔ کھانے کے بعد دس بجے تک اہل خاندان سے محو گفتگو رہتے پھر سونے کے لیے اُٹھ جاتے۔

جلیل کے مشاغل بہت محدود تھے۔ زیادہ وقت تو نماز و وظائف اور تلاوت

اے محمد اعظم۔ ”چند لمحے حضرت جلیل کے ساتھ“ مجلہ عثمانیہ جلیل نمبر ۵۳

میں صرف ہوتا۔ جمعہ کی نماز محلہ کی مسجد میں ادا ہوتی۔ پہلے گھوڑا گاڑی سواری استعمال میں تھی پھر جب موٹر آگئی تو اسی سواری پر باہر نکلتا ہوتا۔ ہفتہ میں ایک بار باغ عمام تفریح کے لیے جاتے اور صبح کی ابتدائی ساعتوں کے ایک دو گھنٹے وہیں گزارتے بغیر اور بزرگان دین سے بڑی عقیدت رکھتے تھے حضرت یوسفینؒ سے خاص ارادت تھی۔ ہفتہ میں ایک بار جمعرات کے روز ضرور جاتے۔ درگاہ شریف میں اگر اس وقت قوالی ہوتی رہتی تو راقم الحروف نے دیکھا ہے کہ ان کو دیکھتے ہی قوال آپ کی نعت یا منقبت شروع کر دیتے اور انعام و اکرام حاصل کرتے۔ درگاہ شریف یوسفینؒ پر حاضری کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اسی درگاہ کے احاطہ میں حضرت امیر میاں اور مرزا داغ کے مزار ہیں۔ ان پر فاتحہ پڑھنا آپ کے مشاغل میں سے ایک تھا۔

پان کھانا آپ کا دلچسپ شغل تھا۔ پان کے بڑے شائق تھے۔ پان بہت کھاتے اور بڑے اہتمام سے کھاتے۔ پکے ہوئے پیلے پان منگو کر ان کی نسیم نکالی جاتیں اور تب اس پکے پان کے بیڑے بناتے جاتے۔ کتھے کی تیاری بھی خاص طریقہ سے ہوتی جس سے اس کی کڑواہٹ اور کسلا پن دور ہو جاتا۔ پان کے ساتھ زردہ کا استعمال بھی ہوتا تھا۔ پان خود کھاتے اور دوسروں کو بھی کھلاتے۔ دوست احباب اور ملنے والوں کی تواضع پان ہی سے ہوتی کیوں کہ اس زمانے میں چائے کا رواج عام نہ تھا۔

پان کے تعلق سے ایک دل چسپ واقعہ بھی بیان کر دوں۔ شاگردوں میں خور کے ایک پٹھان اسماعیل خاں عالی تھے وہ آتے تو اپنی پان کی ڈبیا ساتھ لاتے بیٹھتے ہی پہلے تیائی پر رکھے ہوئے خالصدان میں سے ایک بیڑہ نکال کر منہ میں رکھ لیتے اور اس کے ساتھ ہی بلا کسی وقفہ کے اپنی ڈبیا حبیب میں سے نکال کر پان پیش کرتے۔ ناچار حلیں کو ایک بیڑا اس میں سے اٹھالینا پڑتا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ ان کے پان میں چوننا بہت ہوتا تھا۔ کھاتے ہی منہ کٹ جاتا۔ اس لیے ادھر سے انکار ادھر سے اصرار ہوتا بالآخر خاں صاحب پان دیکر ہی چھوڑتے۔ اب حلیں کی یہ کوشش ہوتی کہ ان کی نظر جاکٹر رہی رکھے ہوئے اگالہ ان میں ڈال دیں لیکن جب کبھی ایسا نہ کر پاتے تو عجوبہ کھلینا پڑتا۔ اس زمانے میں ہوتا کہ کٹر کھانا بشکل کھایا جاتا۔

ایک عجیب مشغلہ یہ بھی تھا کہ ہر ماہ بازار سے چڑیاں خرید کر منگواتے۔ اس کے لیے ایک پتھر مخصوص تھا۔ جب پتھر چڑیوں سے بھر کر آجاتا تو صحن میں بیٹھ کر پتھر کا دروازہ کھلواتے۔ دروازہ کھلتے ہی چڑیاں چھپاتی ہوتی اڑ کر دیواروں اور درختوں پر جا بیٹھتی چڑیوں کی رہائی کا یہ منظر دیکھ کر بہت محفوظ ہوتے۔ ان میں کبھی کوئی چڑیا ایسی بھی ہوتی جو ناتواں و شکستہ پر ہونے کی وجہ سے اڑ نہیں پاتی۔ اس کے لیے ماہ پانی کا انتظام ہوتا تا آنکہ وہ اڑنے کے قابل ہو جاتی۔ جلیل نے شاید اسی منظر سے متاثر ہو کر یہ شعر کہا تھا ہے

اس گرفتار کی پوچھو نہ تڑپ جس کے لیے  
در قفس کا ہو کھلا طاقت پر واز نہ ہو

شاعری

## نعت گوئی

نعت گوئی پہ مری سب کو گماں ہے کہ جلیل  
فیض ہے اس میں امیر الشعرا سے محب کو

اردو شاعروں میں جو درویش شعر اگزیرے ہیں ان میں مرزا جاجاناں،  
خواجہ میر درد، غلام احمد شہید، محسن کاکوروی، کرامت علی شہید اور امیر احمد امینائی  
کا نعتیہ کلام اردو کے لیے سرمایہ ناز ہے۔ انھیں کی طرح دبستان لکھنؤ کے سلسلے  
کے آخری استاد شاعر جلیل شاگردو جانشین امیر بھی درویشانہ شان و عمل کے شاعر  
تھے جنھوں نے اپنے استاد سے شاعری کے علاوہ تقویٰ اور تقدس بھی حاصل کیا۔  
بقول سلیمان ندوی:

”حضرت جلیل کو دنیا نے جانشین امیر کہہ کر لپکا رہا۔ جانشینی حقیقت

میں پوری عقی۔ ظاہری دباطنی دونوں اوصاف کے لحاظ سے

وہ جانشین تھے۔ جو زہد و تقویٰ، پابندی دین اور ذکر و فکر و

مراقبہ اور خدا ترسی استاد میں تھی شاگرد کو ملی،“ لہ

چنانچہ جلیل کے نعتیہ کلام سے متاثر ہو کر انھوں نے اپنے رسالہ معارف میں لکھا تھا،

”جب نبوی کا ظہور ان کے نعتیہ کلام سے ہوتا ہے۔ ان کی

ایک نعتیہ غزل جو ابھی حیدرآباد کے اخبار میں نظر سے گزری

حسب ذیل ہے :-

لب پہ جس دم مرے ندامت شیر لٹھا آیا	عمر رفت پلٹ آئی کہ مسیحا آیا !
جس قدر روادی غربت میں چھپے تھے کانٹے	پھول سب بن گئے جس وقت مدینا آیا
یابی کہ جسے جو کشتی کا اٹھایا لنگر	وجد موجوں نے کیا جوش میں دریا آیا
ہو گئی بیخودی شوق میں لے راہ دراز	آنکھ کھولی تو نظر گنبدِ خضریٰ آیا

صرف حبّ نبوی حسرت میں کام آتی جلیل  
طاہر میں آئیں نہ زہد آیا نہ تقویٰ آیا“ لے

اردو میں لفظ نعت کا استعمال ایک مخصوص اصطلاح کے طور پر ہی  
لظہر آتا ہے۔ اس سے صرف آنحضرت صلم کی مدح مراد لی جاتی ہے۔ چنانچہ ایسے  
تمام منظوم انکار جن میں رسول خدا سے محبت اور عقیدت کا اظہار کیا جاتا ہے یا  
ان کے محاسن بیان کئے جاتے ہیں نعت کی تعریف میں آتے ہیں۔

نعت کا موضوع بظاہر بڑا آسان، عام اور قریب کا موضوع لگتا ہے لیکن اگر  
نعت کی باریکیوں کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس موضوع سے عہدہ برآ  
ہونا آسان نہیں ہے، ایک نقاد کے الفاظ میں نعت گوئی تلوار کی دھار پر چلنا ہے۔  
نعت کی تخلیق میں سب سے بڑی دقت الوہیت اور نبوت کے حدود کو سمجھنے کی  
ہے۔ اگر شاعر بڑھتا ہے تو الوہیت تک پہنچ جاتا ہے اور کمی کرتا ہے تو تنقیص ہوتی  
ہے دونوں جانب سخت حد بندی ہے۔ بہت سارے شعرا نبوت کے دائرہ کو  
الوہیت سے ملا دیتے ہیں۔ جوش محبت اور والہانہ شیفتگی کے عالم میں حد سے  
گزر جاتے ہیں۔

جلیل کے نعتیہ کلام کے مطالعہ سے یہ خوشگوار انکشاف ہوتا ہے  
کہ جلیل نے نعت کے مشکل مقامات بھی انتہائی سلیقے سے طے کئے ہیں۔  
حدیث اور عقائد کی صحت کو ملحوظ رکھتے ہوئے مذاق شاعرانہ کے ساتھ  
نکتہ آفرینی بھی کی ہے۔ اور عقیدت و محبت کے اظہار میں تہذیب و متانت  
کا پاس ان کے نعتیہ کلام کا جوہر ہے۔ محسن کا کوروی اردو کے واحد شاعر  
ہیں جنہوں نے نعت گوئی کو مستقل فن کی حیثیت دی۔ امیر مینائی نے نعت کا  
پایہ بہت بلند کیا۔ جلیل نے اس روایت کو اور آگے بڑھایا۔

جلیل کی نعتیں جذبات کی غیر فانی بنیاد پر استوار ہیں جن میں حبّ نبی بھی ہے

اور وارفتگی و شیفتگی و عقیدت بھی۔ پھر یہ کہ وعظ اور شاعری میں فرق ہے۔ وعظ کی یکسانیت اور طوالت سے سامعین گھبرا اٹھتے ہیں لیکن یہی اسرار و رموز شعر کے جام میں ڈھلنے لگتے ہیں تو سننے والے مسحور و مخمور ہو جاتے ہیں:

مے عشق محبت کی سرے دل میں بھری ہے  
انٹری ہوئی اس شیشہ نازک میں پری ہے  
اہلی عشق دے اس کا مدینہ کا جو سلطان  
محمد نام ہے تاج رسل ہے شاہ خدایاں  
صبا کیا کھلائے گی دل کی کلی  
تمہاری کلی کی ہوا چاہیے  
یہ سنتے ہیں کہ آنسو موتیوں میں تولیے جائیگی  
مزه ہوتا جو ہم دریا بہاتے اپنی آنکھوں سے  
حیاں بلب ہو کے چلا ہوں میں زیارت کیلئے  
دے مری عمر کو اللہ وفا تھوڑی سی  
کیا کہوں کون ہے جس کے لئے دیوانہ ہو  
سب انھیں سید مکتی مدنی کہتے ہیں  
رات بھر حشر ہیں میں ہوں اور عرض حال ہے  
یار بابی ہو گئی جب شام تنہائی پر ہوئی  
جلیں نے نعت گوئی کو محض رسمی طور پر نہیں اپنایا ہے بلکہ اس کو

پوری توجہ اور پورے شعور کے ساتھ فکر کی جولا لگا ہوا ہے۔ اس کا ثبوت ان کا نعتیہ کلام کا مجموعہ ”معراج سخن“ جس کی اشاعت کا سال ۱۹۲۸ء ہے۔ نعت میں غزل کی ہیئت کو خاص طور پر تمام نعت گو شاعروں نے استعمال کیا ہے۔ اصناف شاعری میں یہ وہ صنف ہے جس سے سبھی شعرا نے اردو ساثر و مرعوب ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ نعت گوئی کے لیے یہی سوزوں ترین ہیئت ہے۔ جلیں نے اسی روایت پر عمل کیا ہے۔ اس ہیئت کو مستقل طور پر اپنانے کا نتیجہ یہ ہے کہ غزل و تغزل کے اثرات نعت ماک پر بھی پڑے یعنی ایجاد و اختصار، رموز و ایما، اشارہ و کنایہ اور غزل کی دوسری خصوصیات جلیں کی نعتوں میں حضور اکرم سے محبت کے ذکر اور مدح و توصیف کے بیان پر غزلیہ انداز کی گہری چھاپ ہے مثال کے طور پر جلیں کے اشعار ذیل ملاحظہ ہوں۔

اے نسیم چمن کوئے رسول عربی  
سچ بہتا شجہ کو یہ انداز کہاں آیا  
جو راہ میں کسی بیمار کو غش آتا ہے  
تو آ کے ہوش میں لاتی ہے بو دینے کی

آکے طیبہ میں بھی طیبہ کی طلب باقی ہے      پیاس بجھتی نہیں یارب لب دریا میری  
ایک خلوت گاہ ہے اور اک تنجلی گاہ ہے      دیدہ دل آپ کے دونوں ہیں گھر یا مصطفیٰ  
کیا حسن کی ہے صلی علی اگر می بازار      یوسف بھی خریدار ہے محبوب خدا کا  
بلبلوں میں ذکر رخسار نبی ہونے لگا      رنگ و لہر پاب چین کے پھول اتر آئیں گے  
ان اشعار میں نعتیہ مضامین کی ادائی میں لوازمات غزل کا جواہر تمام

نظر آتا ہے وہ غزل کی دین ہے اور آپ دیکھیں گے کہ اس التزام سے  
جو حسن نعتیہ شعروں میں پیدا ہو گیا ہے وہ کسی دوسری صورت میں ممکن نہ تھا۔  
نعتیہ غزل کا ایک اسلوب وہ بھی ہے جس میں غزل اور نعت کے  
اشعار میں امتیاز مشکل ہو جاتا ہے ایسی نعتوں میں اگرچہ شاعر کا محرک نعت کی  
تخلیق ہی ہوتا ہے مگر غزل گوئی کی روایت سے دیرینہ وابستگی اور غزل  
کے مزاج کی ایک مخصوص تربیت اور اس کے اثرات کے سبب اس قسم کی  
نعت پر غزل کا پورا رنگ چھا جاتا ہے مثلاً جلیل کی غزل کا مشہور مطلع ہے،  
لنگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں  
وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

یہ مطلع تو غزل ہی کا ہے لیکن بہت سے اہل نظر خیال و مضمون کی جامعیت  
کے لحاظ سے اسے نعت کا شعر قرار دیتے ہیں اور نعت کے ذکر میں اس  
کا حوالہ دیتے ہیں۔

غزلیہ انداز میں نعت کے شعر جلیل کی بیشتر نعتوں میں مل جاتے ہیں مثلاً،  
صبا کیا کھلائے گی دل کی کلی      تمہاری گلی کی ہوا چاہیے  
بیخودی عشاق کی پوچھیں تو کہنا اے صبا      آپ آئیں گے نہ جب تک ہوش میں آئیں گے کیا  
لنگاہ لطف ہی کافی تھی بیمار محبت کو      نہ سنستے حال لیکن دیکھ جاتے اپنی آنکھوں سے  
قدرت کے مرتع میں کیا کیا تھے حسیں لیکن      کھینچی جو تری صورت ہر شکل بیٹا ڈالی  
میں کی طلب کیوں ہو مر لیان محبت کو      مسیحا سے تو بڑھ کر آپ کا بیمار ہوتا ہے

## غزلِ شاعری

جلیل مانکپوری اس سلسلے کی آخری یادگار تھے جو میر و مرزا سے شروع ہوا تھا۔ ان کا تعلق لکھنؤ و بٹان سے تھا ان کی غزلوں کا عام آہنگ وہی ہے جو قدیم سلاسیکی غزلوں کا تھا لیکن ان کا اجتہاد یہ ہے کہ انہوں نے روایات و رسمیات کی نمود کو قائم رکھتے ہوئے ان پر ذاتی احساس، مشاہدہ، اور اصلیت کا رنگ چڑھایا۔ بڑی شاعری روایت کے بھرپور احساس سے جنم لیتی ہے اور شاعر روایت کے احساس سے اپنی شخصیت کی تعمیر کرتا ہے جلیل کے پاس روایت کا کٹنا احساس کا احترام تھا اور اس روایت میں رہ کر انہوں نے اپنی شخصیت و انفرادیت کی کتنی تلاش کی اس کا جواب ان کی غزلوں کے دواوین ہیں جو اس فنکارانہ پختگی کا احساس دلاتے ہیں۔

جلیل کی شاعری کو ان کے دواوین کی اشاعت کے لحاظ سے دو ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ابتدائی شاعری کا دور مانکپور سے شروع ہو کر رام پور چھوٹنے تک کے عرصہ کا احاطہ کرتا ہے جب کہ انھیں امیر نیائی نے استفادہ کرنے کا پورا موقع حاصل رہا چنانچہ اس دور کا کلام اپنے استاد کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے بقول خود

شعر گوئی پہ تری سب کو گماں ہے کہ جلیں  
بزم میں روح امیر الشعرا آئی ہے

اشعار فصاحت و بلاغت کا مرقع ہیں اور اعلیٰ درجہ کی کلاسیکیت رکھتے ہیں۔ اساتذہ کھنؤ کا اثر صاف نمایاں ہے درحقیقت یہ وہی کلام ہے جو جلیل کو استادوں کی صف میں لاکھڑا کرتا ہے۔ متانت سنجیدگی، بلند خیالی، معنی آفرینی اور محاورات کی کثرت ہے۔ استعارات و تشبیہات کی فراوانی اور رنگ ناسخ کی رعایت لفظی کی پیری بھی ملتی ہے ناسخ کے سلسلے میں منسلک ہونے کے باوجود مصحفی کے سلسلے کو جلیل زیادہ پسند کرتے ہیں۔

اس سخن کا جلیل کیا کہنا مصحفی کی زبان ہے گویا  
اس پہلے دور کے کلام کا سب سے نمایاں عنصر کھنؤ کے قدیم مروجہ رسمی  
مضامین کا ہے لیکن طرزِ ادا میں قدرت و تازگی ہے۔ زیادہ تر اشعار روایتی اور عاشقانہ  
رنگ کے ہیں۔ ان میں زبان کا رکھ رکھاؤ، معاملہ بندی اور رعایت لفظی کا عنصر غالب ہے  
ڈاکٹر ذکی کا کوری کے الفاظ ہیں :

”ناج سخن (دیوان اول) میں ان کے بعد کے کلام کے مقابلہ میں  
بعض اشعار کہیں کہیں غیر مانوس یا اوق الفاظ یا مشکل تراکیب ہیں۔  
کبھی کبھی لفظی تنقید کی صورت بھی پیدا ہو جاتی ہے مگر عام طور  
پر کلام میں فصاحت روانی اور عنایت بدرجہ اتم موجود ہے  
اسی دیوان میں جلیل مانچوری کی بہت سی کامیاب ترین اور معرکہ  
اشعار ایسے موجود ہیں جن کو اردو کی غزلیہ شاعری کے اعلیٰ ترین  
انتخاب میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا“ اے

پہلے دور کا رنگ سخن ذیل کے اشعار میں دیکھئے جن کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ آج بھی زبان  
خاص و عام میں۔

نگاہ ہرتی نہیں چہرہ آفتاب نہیں وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں  
بات ساقی کی نہ ٹالی جاتے گی کر کے توبہ توڑ ڈالی جاتے گی

جلیل آساں نہیں آباد کرنا گھر محبت کا یہ ان کا کام ہے جو زندگی برباد کرتے ہیں  
 جب تیں چلوں تو سایہ بھی اپنا نہ ساتھ لے جب تسم چلوں میں حیلے آساں حیلے  
 اپنا دیوان مرتع ہے حسینوں کا جلیل نکتہ چیں تھک گئے کچھ عیب لے نہ گئے  
 جلیل کی شاعری کے دوسرے دور کے کلام میں پہلے دور کے مقابلے میں تغزل  
 کی چاشنی بہت زیادہ ہے کیوں کہ اس دور میں بالعموم سادگی زبان و بیان کی طرف زیادہ  
 توجہ دی جا رہی تھی اور اسی طرز شاعری کو بالخصوص دکن کے شعری ماحول میں قبول عام حاصل  
 تھا۔ بیشتر غزلیں اسی دور کی ترجمان ہیں جب کہ اسیر و امیر کی شاعری کا رنگ رفتہ رفتہ  
 زائل ہو رہا تھا اور اس کی جگہ صفائی و سادگی نے لے لی تھی۔ غیر شعوری طور پر یہ اثرات  
 جلیل نے قبول کئے۔ جلیل کی مقبولیت میں اس رنگ کا بڑا حصہ ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے  
 ہیں کہ اس دور کی غزلوں میں صفائی سادگی اور رنگینی و شوخی کا زیادہ اہتمام ہے جہاں  
 شوخی تیز ہو گئی ہے وہاں پیرایہ بیان شائستہ ہے، خالص بدائع اور تشبیہات استعارات  
 صرف بقدر ضرورت ہیں جن میں تغزل اپنے سادہ پیرایہ میں ہے جیسا کہ ذیل کے اشعار سے  
 ظاہر ہوتا ہے۔

موسم گل میں عجب رنگ ہے میخانے کا شیشہ جھکتا ہے کہ منہ چوم لے پیمانے کا  
 جلتے ہو خدا کا نظ ہاں اتنی گوارش ہے جب یاد ہم آ جاؤں ملنے کی دُعا کرنا  
 دیکھا جو حُسنِ یار طبعیت محپل گئی ! آنکھوں کا تھا قصور پھری دل پہ چل گئی  
 مری نظر نے عجب کار لا جواب کیا کہ جھکو لاکھ حسینوں میں انتخاب کیا  
 حُسن دیکھا جو بتوں کا خدا یاد آیا راہ کعبے کی رہی ہے مجھے میخانے سے  
 مجموعی طور پر یوں کہا جاسکتا ہے کہ جلیل بنیادی طور پر خالص لکھنوی شاعر تھے۔  
 وہ قدیم سلسلہ تلمذ کے خاتم اور لکھنوی شاعری کے آخری نمائندے تھے تاہم انہوں نے  
 اپنی ذات میں اور اپنی شاعری میں انیسویں صدی کے نصف آخر کے دونوں مکاتیب کی  
 خصوصیات یکجا کر لی تھیں۔ اس رنگ تغزل کو دہلی اور لکھنؤ اسکول کا سنگم کہنا درست ہوگا  
 فرحت اللہ بیگ دہلوی کے الفاظ میں — ”شاعری میں انہوں نے دہلی اور لکھنؤ کے رنگوں  
 کو سمو یا تھا۔“ قاضی عبدالغفار (مدیر پیام) نے اس رنگ سخن کی وضاحت یوں کی ہے۔

”جلیل کی عجب خصوصیت تھی کہ انھوں نے اپنی ذات اور اپنی شاعری میں انیسویں صدی کے نصف آخر کے دو سکا تیب کی خصوصیات یکجا کر لی تھی۔ وہ امیر مینائی کے بھی جانشین تھے اور داغ کے بھی۔ داغ کی زبان کی بے ساختگی اور امیر مینائی کے تفکر و دوزں سے جلیل کی شاعرانہ فطرت نے اپنا حصہ حاصل کیا تھا۔۔۔ جلیل کے وجود میں دلی اور کھنؤ کی شاعری کے ان مختلف عناصر نے اپنا سنگم بنا لیا تھا جو نصف صدی سے زیادہ ایک دوسرے سے جدا رہے“ اے

ڈاکٹر یوسف سرمست لکھتے ہیں :

”دبستان لکھنؤ کے لطیف ارتعاشات ان کی شاعری میں بڑے توازن کے ساتھ سموئے ہوئے ہیں۔ دبستان دلی کی خصوصیت داخلیت بھی ان کی شاعری میں سمٹ آئی ہے۔ ان دونوں دبستانوں کی قدامت نے جلیل کی شاعری میں نکھار پایا ہے“<sup>۲</sup> اختر الایمان اس تعلق سے اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں :

”جلیل حسن جلیل“ داغ کے اسکول کے کم و بیش آخری شاعر ہیں جنھوں نے اپنے سوا اپنے استاد امیر مینائی کو مزید شہرت دی اور ان کی روایت کو زندہ رکھا۔

[مکتوب بنام علی احمد جلیلی ۲۲ دسمبر ۱۹۸۹ء]

ڈاکٹر حفیظ قتیل بھی اسی جانب اشارہ کرتے ہیں :

”دبستان لکھنؤ میں مصحفی کا یہ وہ طرزِ عمل ہے جس کو ہم داخلی کہہ سکتے ہیں نہ خارجی۔ دلی اور کھنؤ کے ذہنی ٹکراؤ کا یہ نتیجہ تھا جو جرأت

اور داغ کے پاس سطحی جذبات کی ترجمانی کی صورت میں نمایاں  
ہوا، [ حفیظ قتیل۔ مجلہ عثمانیہ جلیل نمبر ۱۱۰ ]

اعجاز صدیقی مدیر شاعر رقمطراز ہیں:

”جلیل دہستان لکھنؤ سے تعلق رکھتے تھے لیکن جوانی ہی کے عالم  
میں وہ لکھنؤ کے شاعرانہ ماحول سے الگ ہو گئے یہی وجہ تھی کہ  
قنوطیت کے اثرات ان کی شاعری میں نہیں پائے جاتے اگر  
حضرت امیر میاں سے ان کی نسبت کا ذکر نہ کیا جائے تو وہ اپنے  
رنگ سخن سے کلیتہاً دہلوی معلوم ہوتے ہیں۔“

اودھ کی شریا حسین کا یہ تبصرہ بھی میرے اس بیان کی تائید میں ہے  
”جلیل کے ترنم اظہار میں ہجر و سوز کی بہ نسبت وصل و نشاط کی  
کیفیت نمایاں ہے۔ وہ اس رنگ کے دوسرے استادہ سخن  
مثلاً موتی داغ کے مقابل میں زیادہ ضبط اور تہذیب حسن  
سے کام لیتے ہیں۔“

اعجاز صدیقی کے یہ الفاظ کہ جلیل کی شاعری میں قنوطیت کے اثرات نہیں پائے  
جاتے جلیل کے اس رنگ سخن کا طرف اشارہ کرتے ہیں کہ جلیل شاعر نشاط ہیں۔ انہوں  
نے غم کی مستقل پرورش نہیں کی نہ اس کے متلاشی رہے اپنے دور کے شاعر دل میں  
جلیل واقعی رجائیت پسند ہیں، شکست، محرومی، الوسی اور رنج و الم کے جذبات کا  
اظہار ان کے مزاج کے منافی ہے۔ بات یہ ہے کہ جلیل کا زمانہ فراغت و خوشحالی کا  
زمانہ تھا اس لیے نشاطیہ کیفیت کی فراوانی ہے جس میں زندگی اپنے فطری انداز میں  
کھیلی اور اٹکھیلیاں کرتی نظر آتی ہے۔

۲ شریا حسین حیدر آباد میں پیدا ہوئے شعراء میں ۲۱

۱۰ سالہ احمد جلیل مانیکپوری کا رنگ تفریق۔ ماہنامہ ”تب و ثناء“ جنوری ۱۹۷۱ء ص ۱۰۰

دھال یا رہی ہے دور میں شراب بھی ہے قمر بھی ہے مرے پہلو میں آفتاب بھی ہے  
 پیارا پیارا حسن دیکھا دل کو پیارا ہو گیا جو حسیں چمکا مری آنکھوں کا تارا ہو گیا  
 ترا شباب رہے ہم رہیں شراب رہے یہ دور عیش کا تا دور آفتاب رہے  
 ساتی بھی ہے چمن بھی ہے ٹھنڈی ہوا بھی ہے ٹوٹے جو آج توبہ تو ابدل مزا بھی ہے  
 آج کل آئینہ رویوں میں گزرتی ہے جلیں بارک اللہ غصیا ہے سکندر تیرا  
 اس نشاطیہ شاعری کے ڈانڈے دربار سے بھی ملے جاسکتے ہیں جن سے  
 جلیں کی شاعری کا بڑا حصہ وابستہ رہا۔ جلیں کے بیشتر نقادوں نے جلیں کی شاعری پر دیا  
 کے اثرات کو تسلیم کیا ہے۔  
 ڈاکٹر تاثیر کا کہنا ہے کہ

”ہمدی غزل درباروں کی پیداوار تھی۔ لہذا ابول اور رئیسوں کے  
 درباروں کی۔ ان میں اسی قسم کے تاثرات کا اظہار ہوتا تھا جو  
 اسی فضا میں پنپ سکتے تھے۔ ہلکی چھلکی تفریحی غزل کی شاعری  
 درباری فضا میں کامیاب ہوئی۔“

جلیں کا تعلق دربار سے رہا ہے۔ یہ دربار بھی پُرانی قسم کا  
 دربار نہیں۔ اصلاح شدہ دربار ہے لیکن ہے درباری اور حالاً  
 بدلنے کے باوجود ذہنی روایات وہی پُرانی ہیں۔“

نسیاز فتح پوری لکھتے ہیں:

”ابتداء میں وہ (جلیں) اپنے استاد اسیر مینائی کے ساتھ رام پور  
 میں رہے اور پھر حیدرآباد چلے گئے اس لیے ان کی شاعری  
 درباری شاعری کے اثر سے کبھی علیحدہ نہ ہو سکی۔“  
 پروفیسر مسعود حسین اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ۔

”جلیں کی عمر کا بیشتر حصہ خسران دکن کے دربار میں گزرا لیکن

یہ امر لائق تحسین ہے کہ انھیں دربار یاد درباری نے بگاڑا نہیں بلکہ ان کی موجودگی میں دربار کا مذاق سُخن بلند ہو گیا۔ انھوں نے اہل دکن کو نہ صرف اردو زبان کا محاورہ اور روزمرہ سکھایا بلکہ معاملاتِ حسن و عشق کی تہذیب کی ”لہ

جلیں کے کلام کی دیگر خصوصیات پر نظر ڈالیں تو کئی پہلو سامنے آتے ہیں۔ مناسب ہے کہ قدرے تفصیل اور معتبر حوالوں سے ان کا جائزہ لیا جائے۔

## زبان و بیان۔ سادگی۔ صفائی

جلیں کے کلام کی سب سے نمایاں خصوصیت سادگی و صفائی۔ سلاست۔ زبان و بیان کی خوبی، ترنم اور غنائیت ہے۔ بقول غلام حسن کسری جس صفائی زبان کی طرف امیر نے قدم ٹھایا تھا جلیں نے اس کی تکمیل کی۔ زبان و بیان پر انھیں قدرت حاصل ہے۔ ان کے کلام کی سادگی، سلاست و روانی جادو کا کام کرتی ہے۔ جلیں کے بیشتر نقادوں نے اس خصوصیت کا اظہار کیا ہے۔

”زبان کی سادگی و صفائی طرزِ ادا سلاست اور روانی ان (جلیں) کی شاعری کی اصل بیک گراؤنڈ ہے۔ سلاست بیان کا یہ عالم ہے کہ گویا ایک نرم سبک رو چپتر ہے جو ہلکے ترنم کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے۔

[نیاز فتحپوری۔ نگار غزل نمبر۔ پاکستان اڈیشن۔ ص ۲۷۴]  
”جلیں غزل کے روایتی آہنگ کے استاد ہیں۔ بکھری ہوئی زبان اور نرم رچی ہوئی موسیقیت ان کے کلام کی وہ ممتاز خصوصیت ہے جس نے ان کو اس قدر مقبول بنا رکھا ہے“  
[مجنوں گورکھپوری۔ نگار۔ غزل نمبر۔ ص ۲۷۵]

”استاد جلیل کا خاص رنگ ان کے بیان کی روانی، بے تکلفی اور خیالات کا سلجھاؤ ہے۔ ان کے اس قدرتی حُسن کو زور کی ضرورت نہیں“

(تمکین کاظمی۔ استاد جلیل۔ مجلہ عثمانیہ جلیل نمبر ۱۲۲)

”ان (جلیل) کی ہر غزل کے اشعار میں جلیل کا وہ منفرد رنگ ملتا ہے جس کے لیے انھیں قبولیت دوام ہے اور جس میں زبان و بیان کی وہ جاشنی ملتتی ہے جو جلیل کی شاعری کا طوق امتیاز ہے۔“  
(پروفیسر سعود حسین خان: قلمی تجربہ بنام علی احمد جلیلی ۱۹۸۹ء)  
”ان (جلیل) کی غزلوں کو پڑھئے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اردو زبان کتنی پیٹی اور رسیلی ہے اور جذبات و احساسات کی کیسی کیسی نزاکتوں کو ادا کرنے کی قدرت رکھتی ہے۔“

(علی سردار جعفری - دیباچہ روح سخن ص ۶)

## سہل ممتنع

سہل ممتنع سادگی بیان و حُسن زبان کی اس صفت کا نام ہے جس میں شاعر الفاظ کو بلا کسی تعقید لفظی اس صفائی کے ساتھ موزوں کرتا ہے کہ شعر نثری ترکیب میں موزوں ہو جاتا ہے۔ ادق کلام خواہ کتنا ہی نثری ترکیب میں ہو سہل ممتنع کے منافی ہے۔

غزل کا فن چونکہ ایجاز کاری ہے اس لیے زبان کے برتنے کا خاص اہتمام چاہتی ہے اور چونکہ غزل بنیادی طور پر گفتگو کی زبان کی متقاضی ہے اس لیے کسی شعر میں استعمال کئے جانے والے الفاظ جتنے نیچرل، سادہ اور بے ساختہ طور پر ترتیب پائے گئے اور ادا ہوں گے اتنے ہی شعر کی تاثیر بڑھانے میں مدد و معاون ہوں گے۔

میل کے کلام کے اس وصف پر ڈاکٹر ذکی کا کوروی یوں روشنی ڈالتے ہیں:

”جلیل موضوع سے زیادہ زبان کو اہمیت دیتے ہیں جلیل کے کلام کی عموماً اور غزلوں کی خصوصاً سب سے بڑی خوبی

عام فہم، سلیس، آسان اور فصیح زبان کا استعمال ہے۔ جلیل کے  
کلام میں جتنی بڑی تعدادِ سہل قمع میں اچھے اشعار کی ملتی  
ہے اتنی بڑی تعداد عام طور پر اردو کے شاہیر شعرا کے یہاں  
بھی کم ملے گی۔“ لے

مثال کے طور پر ذیل کے اشعار دیکھئے ایسا لگتا ہے کہ نثر پارے ہیں جو موزوں ہو گئے ہیں۔  
نثر اور نظم میں فرق کرنا مشکل ہے۔

یا خدا دردِ محبت میں اثر ہے کہ نہیں	جس پہ مَرنا ہوں اسے میری خبر ہے کہ نہیں
چلتے پھرتے جہاں نظر آئے	آنکھ سے دل میں وہ اُتر آئے
کھدویہ کو بچن سے کہ مَرنا نہیں کمال	مَر مَر کے ہجر یار میں جیسا کمال ہے
آپ اور سوگ مرا کیا کہنا	دیکھئے لب پہ ہنسی آتی ہے
میں نے جو نہیں چاہا کیا اس میں خطا میری	یہ تم ہو یہ آئینہ انصاف ذرا کرنا !
یہ جو سر نیچے کئے بیٹھے ہیں	جانِ کتنوں کی لئے بیٹھے ہیں

## معاملہ بندی

غزل میں معاملاتِ حُسن و عشق کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ غزل کا بنیادی  
تصور خواہاں سے چھپر اور حسینوں کے ساتھ ناز و نیاز کے معاملات ہیں۔ یہ روایت  
متقدّم سے ہوتی ہوئی داغ، امیر اور ان کے متبعین تک پہنچتی ہے لیکن اس رنگ  
کو جرأت نے خصوصیت کے ساتھ بڑھا۔ دہلی میں مومن اور داغ اس کے نمائندہ شاعر  
ہیں۔ اس طرح یہ معاملہ بندی لکھنؤ سے مخصوص نہیں۔ دہلی کے متقدّمین کے یہاں کمتر اور  
شعراے متاخرین کے یہاں معاملہ بندی کے اشعار موجود ہیں۔

معاملہ بندی پر عموماً اعتراضات بہت ہوئے ہیں لیکن اگر معاملہ بندی کو  
عامیانہ پیرہن نہ دیا جائے تو اردو غزل کی اس روایت کو معتبر بنایا جاسکتا ہے۔

غزل کی یہ روایت جلیل کے پاس بڑے رکھ رکھاؤ اور بڑے رچاؤ کے ساتھ ملتی ہے۔ پاکستان کے ایک نائد جلیل کی معاملہ بندی کے تعلق سے بڑے واضح انداز میں لکھتے ہیں:

”غزل میں حسن و عشق کی ایک جیتی جاگتی دُنیا ہوتی ہے حسن اور متعلقات جس شکوہ شکایت، اترار و انکار، فراق وصال شاعر کی خود آزاری، جوش و رقابت محبوب کی ستم پردی ہی وہ دُنیا ہے جو ہمیں غزل کی شاعری میں جیتی جاگتی نظر آتی ہے جلیل نے اپنی غزل میں یہی مضامین استعمال کئے ہیں مگر ایسے حسن و سلیقہ سے کہ وہ ہماری شاعری کا ایک مستقل حصہ بن کر رہ گئے ہیں“ اے

جلیل کا یہ لاجواب شعر اسی معاملہ بندی کی دین ہے۔

ہم تم ملے نہ تھے تو جُدائی کا تھا لال  
اب یہ لال ہے کہ تمنا بکل گئی

ڈاکٹر ذکی کا کوروی بھی جلیل کی معاملہ بندی کو سراہتے ہیں :-

”معاملہ بندی کے شعر کثرت سے ہیں مگر ان میں بے راہروی نام کو نہیں اور نہ وہ داغ و امیر کی طرح حد سے تجاوز کرتے ہیں“  
پروفیسر مسعود حسین خاں جلیل کی معاملہ بندی کی شرح یوں کرتے ہیں،

”جلیل کی معاملہ بندی اور لکھنؤ کے دیگر شعرا کی معاملہ بندی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایک ششستہ و رفتہ اور دوسری از خود رفتہ۔ اس ششستہ و رفتہ معاملہ بندی نے حسرت موہانی کی شاعری کے مجازی رنگ کو چوکھا کیا۔ یہی جلیل کا اصلی رنگ ہے۔“ (قلمی تحریہ)

اس بیان کی تائید درج ذیل اشعار سے ہوتی ہے:

آپ پہلوں جو بیٹھیں تو سنبھل کر بیٹھیں      دل بیتاب کو عادت ہے چل جانے کی  
اچھے تم آنے دیکھتے اپنے مرین کو      آنکھیں دکھا کے اور بھی بھرا کر دیا

کچھ اس ادا سے یار نے پوچھا مزاج کہنا پڑا کہ شکر ہے پروردگار کا  
تم نے آکر مزاج پوچھ لیا اب طبیعت کہاں ٹھہرتی ہے  
وہ بخودی کی آڑ میں لپٹے جلیں سے کیونکر کہوں کہ ہوش نہ تھا تھا ضرور تھا

## خریات

اردو کے تقریباً سبھی غزل گو شعرا کے کلام میں کم و بیش خمریات کا عنصر ضرور  
ملتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ریاض نے اس پر خاص توجہ دی اور اس میں کمال پیدا  
کیا۔ جلیں کے یہاں رندانہ اشعار کی اتنی بہتات تو نہیں تاہم ان کی شاعری کا خاصا  
حصہ خمریات پر مشتمل ہے اور جلیں کے زبان رندانہ اشعار میں ان کی تعداد قابل لحاظ  
ہے مثلاً یہ شعر تو جلیں کی پہچان بنا ہوا ہے۔

پینے پینے کر چکا تھا میں تو بہ مگر جلیں

بادل کا رنگ دیکھ کے نیت بدل گئی

ریاض اور جلیں کی خمریات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو بدیہی فرق یہ محسوس ہوتا  
ہے کہ ریاض کے پاس رندانہ اشعار کی سطح ایک ہی ہے جسے ہم شوفی و طنز کا نام دے  
سکتے ہیں۔ ان اشعار میں شوفی و طنز بھی ہے، پھبتیاں بھی، بیباکی و گستاخی بھی  
سرخوشی و بدستی بھی۔ جلیں کی خمریات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ایک وہ جن  
میں جلیں و ریاض برابر کے شریک ہیں۔ دوسرے وہ جن میں ”بادہ ساغر“ کے پردے  
میں جلیں نے بڑی معنی آفرینی کی ہے۔ پہلی قسم کے کلام میں اگر دونوں کے اشعار کو ملا دیا جائے  
تو ریاض و جلیں کے اشعار کی پہچان مشکل ہو جائے۔ درج ذیل اشعار میں جلیں کی  
خریات کا یہی رنگ ہے۔

ریاض کبخت نے شراب کا ذکر اس قدر کیا  
جلیں ساتی بہار آتے ہی رنگ اور ہو گیا  
ریاض پینے سے پلانے سے ہیں کام نہیں ہے  
جلیں رندوں کو غم بادہ کلفام نہیں ہے  
داعظ کے منہ سے آنے لگی بوشراب کی  
گلشن کے پھول دینے لگے بوشراب کی  
وہ دن گئے اب شعل مئے و جام نہیں ہے  
آنکھیں تو ہیں ساتی کی اگر جام نہیں ہے

ریاض: لوگ کہتے ہیں کہ ہے زاہد متراض ریاض  
جلیل: صحبت پیرمخال میں یہ کھلا راز جلیل  
ریاض: لگاتار ہیں پیشانی میں سجدے کے پہاڑے  
جلیل: جلیل ان میکشوں پر کیوں نہ پھر مگر کربنائے  
زندہ کہتے ہیں اسے چور ہے میخانے کا  
خلد کہتے ہیں جسے نام ہے میخانے کا  
یہی خاک در میخانہ ہے اکسیر میخانہ  
وہ سنے پیتے ہیں جس کا نام ہے اکسیر میخانہ

## روزمرہ اور محاورے

روزمرہ اور محاورے ہر زبان کے اپنے ہوتے ہیں اور انہیں سے زبان کا مزاج  
پہچانا جاتا ہے۔ ان میں بیرونی اثرات کا عمل دخل بہت کم ہوتا ہے۔ زبان دانی کی پرکھ  
انہیں محاوروں اور روزمروں کے صحیح استعمال سے ہوتی ہے۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ روزمرہ  
تحریر اور تقریر دونوں کی جان ہے اور محاورہ ان کا ایمان۔ روزمرہ اور محاورے زبان  
کا جوہر ہیں۔ ان کے بغیر زبان کی حیثیت ایک روح بے قالب کی سی ہے۔ ان دونوں  
میں بڑا نمایاں فرق یہ ہے کہ روزمرہ اپنے حقیقی معنوں میں اور محاورہ مجازی معنوں میں استعمال  
ہوتا ہے۔

محاورے زبان کا زلیور ہیں، مطلب کو منتخب پیرایہ میں بیان کرنے کا سبب  
بنتے ہیں۔ اس کی بنیاد عموماً استعارہ پر ہوتی ہے اور حقیقی معنوں کے بجائے اپنے مجازی  
معنوں میں استعمال ہوتا ہے یعنی لغوی معنی کے بجائے عموماً دوسرے قرار یافتہ معنی نکلتے  
ہیں۔ محاورے کے استعمال کے تعلق سے یہ بات بہت اہم ہے کہ محاورہ کسی قسم کا تصرف  
کمی بیشی یا تغیر کی مداخلت برداشت نہیں کرتا جوں کا توں استعمال ہوتا ہے۔

جلیل نے اپنے کلام کے بیشتر حصے کو روزمرہ کا درجہ دیا ہے۔ اشعار کے  
ٹکڑے اس انداز سے آتے ہیں جیسے وہ روزمرہ ہی ہوں یا کوئی محاورہ ترتیب پا گیا  
ہو۔ یوں تو کوئی شاعر ان سے دامن کشاں نہیں رہ سکتا لیکن خصوصیت سے جلیل کے  
تغزل کو کلاسیکیت عطا کرنے میں روزمرہ اور محاوروں کے استعمال کو زیادہ دخل ہے۔  
اس خصوصیت کے تعلق سے سلیمان ندوی کا یہ تبصرہ ناظر ہو:

”جلیل کی شاعری کی خاص خصوصیات کلام کی فصاحت زبان

کی صحت، محاورات کی پیروی اور بندش کی چستی . . . . آج  
شاعر بہت ہیں مگر استاد کم جو لفظوں کے ہاتھ میں نہ ہوں  
بلکہ لفظ ان کے ہاتھ میں ہوں۔ جن کے کلام سے زبان کے  
الفاظ، محاورات اور اشال کی تصدیق ہو، اے

جلیل کی غزلوں کے تین ضخیم دلیان ہیں۔ ان کو کھنگالا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ محاوروں  
اور روزمرہ کی زبان ہیں۔ محاوروں کے استعمال میں جلیل نے زیادہ تر احتیاط کرتی ہے  
کہ محاورے اور روزمرے بغیر کی صرف و تعقید کے اپنی ترتیب الفاظ کے ساتھ  
موزوں ہو جائیں۔

محاورہ دو لفظوں کا بھی ہو سکتا ہے اس میں زیادہ لفظ بھی ہو سکتے ہیں۔  
دو لفظوں کے محاورے جو جلیل کے کلام میں ہیں ان کی چند مثالیں یہ ہیں،  
چھری دینا، خاک ہونا، اوس پڑنا، ہوا ہونا، آنکھیں سیکنا، زبان دینا، آنچ آنا،  
بار پانا، اندھیر ہونا، منہ آنا، راہ دینا، زبان کٹنا۔ طبیعت آنا، کان بھرنے، ہوا ترنا  
سر چڑھنا، پاؤں پھیلانا، بات رکھنا، گلے باندھنا، خون ہونا، جوہر کھلنا، پر دہ  
ڈالنا، منہ موڑنا، بات رہجانا، کانٹا نکلنا، چھینٹے دینا، دل بھڑانا، آنکھیں دکھانا،  
خاک چھاننا، ہوا بندھنا، زخم بھرنے، آستین چڑھانا، اور چھادنی چھانا وغیرہ۔  
اشارہ میں ان کے استعمال کی چند مثالیں حسب ذیل ہیں۔

چھادنی چھانا

تمہیں آکر جو نکالو تو نکل سکتے ہیں چھادنی چھائے ہوئے ہیں غم و خصال میں  
چھری دینا

جو بہر آشیاں تن کا اٹھاؤں لے خبز حبلی جو کوئی شاخ کل چھانٹوں چھری دے باغباں عجب  
خاک ڈالنا

قبر میں بھی ہوگا روشن داغ دل چاند پر کیا خاک ڈالی جائے گی

صبر بڑنا

رات بھر آتش حرمت سے جلا کرتی ہے نشہ پر صبر بڑا ہے کسی پر دانے کا  
زیادہ الفاظ کے محاوروں کی تعداد بھی قابل لحاظ ہے مثلاً:

گھر بھونک تماشا دیکھنا۔ گریباں میں منہ ڈالنا۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی،  
آنکھ بچا کر نکل جانا۔ آنکھ کا پانی ڈھلنا۔ زخموں پر نمک چھڑکنا۔ نشہ میں چور ہونا۔ گلے  
کا ہار ہونا۔ زبان پر کانٹے پڑنا۔ تل ادٹ پیڑ ادٹ۔ چار میں کُسو ہونا، چار سے باہر  
ہونا۔ ہاتھ جھوٹا کرنا، شیشہ میں اتارنا۔ جینے سے ہاتھ دھونا، مٹی خراب ہونا۔ دھلا  
پان ہونا۔ لگا ہوں میں تلنا وغیرہ۔

ذیل کی مثالوں میں دیکھئے ایسا معلوم ہوتا ہے خود محاورہ موزوں ہو گئے ہیں۔

گھر بھونک تماشا دیکھنا

نالہ کش کیا ہوئی گھر بھونک تماشا دیکھا ایک تنکا بھی نہ بلبل کے نشیمن میں رہا

گلے کا ہار ہونا

چمن سے توڑ کر گل لے گیا بولی نہ کچھ بلبل جوئی ہوتا تو گھیس کے گلے کا ہار ہو جانا

چار میں کُسو کرنا

میرے رونے پر ابھی ہنستے ہو تم پھر کہو گے چار میں کُسو کیا

چار سے باہر ہونا

ادھر زینت کے کپڑے وہ پہنتے ہیں شہدہ ادھر جامعہ سے باہر حضرت دل ہوتے جاتے ہیں  
یہ محاورہ جہاں رعایت لفظی کے ساتھ ہوتے ہیں کچھ اور ہی لطف دیتے ہیں۔

نشہ میں چور ہونا

رندوں کے ہاتھ سے نہیں ٹوٹی ہے ساقیا نشہ میں چور ہو گئی تو بس شراب کی

چھینٹے دینا

دعدہ محشر کے چھینٹے دیر ہے ہیں اس لئے تاکہ مری جاتے پیاسا شربت دیدار کا

پانی پانی ہونا

پانی پانی مری تو بہہ کیوں لے ساقی دیکھ پایا ہے پھلکنا ہوا ساغر

آنکھوں سے گرنا

یہی رونا ہے تو کچھ شک نہیں رسوائی میں سب کی آنکھوں سے گرائیں گے کیونکہ ہر محاوروں کے استعمال کا ایک فنکارانہ خصوصیت یہ بھی ہے کہ ایک ہی شعر میں کہیں دو اور کہیں تین محاورے بے تکلف یکجا ہو جاتے ہیں۔

سر چڑھنا۔ غرور کی لینا۔ نگاہ سے گرنا

سر چڑھنے سے سہ سے تھ ہر اک غرور کی آخر قیہ گر گئے ان کی نگاہ سے گل کھلا ہے داغ دے گیا ہے

یہ گل کھلا ہے نیا باغ آشنائی کا کہ دل بھی داغ مجھے دے گیا حُدا کی بات رکھنا۔ زبان دینا

میں وعدہ وصال پہ سوجان سے نثار رکھ لی ہے بات کہ آپ نے دیکر زبان مجھے سر چڑھنا۔ رسم بڑھانا۔ نگاہوں سے گرنا

ایسے معشوق سے کیا رسم بڑھائے کوئی سر چڑھا کر جو نگاہوں سے گرا دیتا ہے جلیل کی زبان کے اس وصف کے بارے میں ابواللیث مدنی لکھتے ہیں۔

”جلیل کی محاورہ بندی کے نمونے بھی قابل مطالعہ ہیں۔

اردو غزل گوئی کے دور میں مرزا داغ دہلوی کا کلام اس

اعتبار سے عام طور پر مشہور ہے۔ داغ کے تلامذہ نے

بھی اس رعایت کو ملحوظ رکھا ہے۔ . . . .

جلیل کو بھی محاورہ بندی کا بڑا شوق ہے؟“ لہ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس شوق کو جلیل نے بڑی فرصت اور اہتمام کے ساتھ

پورا کیا ہے مثلاً ان کے یہاں بعض صورتوں میں ایک لفظ سے بننے والے محاوروں کی

تعداد حیرت انگیز ہے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ کا کوئی محاورہ اور روزمرہ محولہ

نے نہیں چھوڑا۔ مثلاً آنکھ کے حسب ذیل محاورات ملاحظہ ہوں جو ان کے دواویں سے ہیں

نے اخذ کئے ہیں۔

آنکھ سے گرنا۔ آنکھ سینکنا۔ آنکھ بدلنا۔ آنکھ کا پانی ڈھلنا۔ آنکھ لڑنا۔ آنکھ  
چڑانا۔ آنکھ بچانا۔ آنکھ گھنا۔ آنکھ لگانا۔ آنکھ لڑنا۔ آنکھوں میں کھپنا۔ آنکھوں میں کھٹکنا  
آنکھوں پہ بٹھانا۔ آنکھوں پر لینا۔ آنکھوں میں جھپنا۔ آنکھوں سے لگانا۔ آنکھیں بھڑانا  
آنکھیں کھل جانا۔ آنکھوں میں گھر کرنا۔ آنکھوں میں سبک ہونا۔ آنکھوں آنکھوں میں۔  
آنکھوں کا تارا۔ آنکھیں دکھانا۔ آنکھیں نکالنا۔ آنکھیں ملانا۔ آنکھوں میں بھڑنا۔  
آنکھیں پھیر لینا۔ آنکھوں سے گرنا۔ اور آنکھوں میں سامنا۔

## انفرادیت

جلیل نے اپنے دور کے دوسرے غزل گو شعرا کے مقابلے میں غزل کو جو  
نیا اسلوب دلہجہ دیا ہے وہ لائق غور ہے کلاسیکی اور روایتی انداز کی اس تبدیلی سے  
بارے میں اکثر تبصرہ نگاروں نے اپنی تحریروں میں واضح اشارے کئے ہیں، ایک نقاد  
کا کہنا ہے کہ جلیل کے کلام میں ہر اعتبار سے ایک لطیف واضح تبدیلی کا پتہ چلتا ہے  
جلیل کی شاعری پر اے زنی کرتے ہوئے اس رخ کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ جلیل نے  
اپنے جس اسلوب سے عصر حاضر کو روشناس کرایا وہ یقیناً دوسرے اساتذہ سخن کے  
مقابلہ میں زیادہ ضبط اور تہذیب سے عبارت ہے۔ جلیل کے خیال کی ندرت اور اسلوب  
کی برجستگی بقول پروفیسر ثیا حسین ان کے معاصرین و نیز دیگر کلاسیکی روایت کے غزل گو  
شعرا کو متاثر کرتی ہے بلکہ چنانچہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ جلیل نے اپنے تخیل کے اور اسلوب  
کے امتزاج سے جو دنیا تخلیق کی ہے وہ پائیدار روایت ہوتے ہوئے بھی نئی ہے اور  
اپنے رنگ میں منفرد ہے۔

مختلف نقادوں نے اس انفرادیت کی تشریح یوں کی ہے :  
”یہ کہنا کہ جلیل کی غزلیں داغ کی بعض غزلوں کی طرح صرف

ارباب نشاط کی بدولت قبول عام حاصل کر سکیں سچ نہیں۔  
ان کے کہے ہوئے ہر غزل کے اشعار میں جلیل کا وہ منفرد  
رنگ ملتا ہے جس کے لیے انھیں قبولیت عوام ہے اور جس  
میں زبان و بیان کی وہ چاشنی ملتی ہے جو جلیل کی شاعر کا طرہ  
افتیاز ہے۔“

پروفیسر سعید حسین خان۔ (مکتوب بنام علی احمد جلیلی ۱۹ مارچ ۱۹۸۹ء)  
”ان کے کلام کی سادگی، ادائی، بے تکلفی اور خیالات کا تسلیح  
ہوا ہونا اس گلاب کا ساحل ہے جس کے قبا کو گل بوٹے کی  
ضرورت نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جلیل اس وقت اپنے رنگ  
کے تنہا کہنے والے ہیں۔ جلیل ایک صاحب طرز سخنور ہیں۔“  
[نیاز فتحپوری۔ لنگار غزل نمبر۔ پاکستان اڈیشن ص ۳۰۹]  
”یہ سمجھنا غلط ہے کہ جلیل کی آواز ان کی اکسائی شخصیت کی  
آواز ہے۔ ان کی آواز ان کی اپنی آواز ہے۔“

(ڈاکٹر حفیظ قتیل۔ مجلہ عثمانیہ۔ جلیل نمبر۔ ص ۱۰۷)  
ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں۔ کیا اس گویائی میں محاصرین سے علیحدہ دنیا میں اور دنیا بھر میں جو  
جلیل کی شناخت ہے۔

اس شان سے وہ آج پئے امتحاں چلے	فنون نے پاؤں چوم کے پوچھا کہاں چلے
جب میں چلوں تو سایہ بھی اپنا نہ ساتھ دے	جب تم چلو زمین چلے آسماں چلے
ساتھ کیا کیوں نہ ہوں ہو مجھے بھانجانے کی	دل ہے شیشے کا مرا آنکھ ہے پیمانے کی
بات ساتی کی نہ ٹالی جائے گی	کر کے توبہ توڑ ڈالی جائے گی
اس ادا سے وہ چلے مستانہ حال	سایہ گھڑیوں خاک پر لٹا کرینا

## درباری شاعری

درباری شاعری کے تعلق سے درباری سرپرستی اور سخن و سخن سنج یاد شاہوں کی قدر دانی اور ادب و لازمی کامیابیوں کا اکثر زبانوں پر بڑا احسان ہے لیکن اردو زبان کی ابتدائی نشوونما اور اسے پروان چڑھانے میں شاہوں اور شاہی دربار نے جو حصہ لیا وہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ تاریخ کے ادراک شاہد ہیں کہ قطب شاہی اور عادل شاہی سلاطین سے بیکر شاہان مغلیہ لڑا بان اودھ، تاجدارانِ رامپور اور لڑا بان میر عثمان علیخان والی دکن کے دربار تک جو طویل سفر اُردو نے کیا اس سفر میں کیسی کیسی میزبانیاں اس کے شامل حال رہیں۔ سخنور سلاطین نے نہ صرف اپنی شاعری اور شعری تخلیقات سے زبان کی خدمت کی بلکہ اپنے دور کے شاعروں کی سرپرستی بھی کی اور جن شاعروں کو انہوں نے اپنا استاد بنایا انہوں نے دربار میں جگہ دی انہوں نے دیگر اصنافِ ادب کے ساتھ اپنے محسن بادشاہوں، حکمرانوں اور امراءے دولت کی تعریف و تحسین ان کی شجاعت سخاوت اور علم و دقت یا ان کی بھونچو کچھ لکھا وہ بھی آج اُردو کا سکس کا بڑا سرمایہ ہیں۔ دکن کے قطب شاہی و عادل شاہی حکمرانوں سے لیکر دہلی کے سلاطین مغلیہ اودھ کے لڑا بانوں اور حیدر آباد کے سلاطین آصفیہ تک کے طویل سفر میں سیکڑوں شاعروں کا درباروں سے تعلق رہا اور اس تعلق کے نتیجے میں ایک ایسے لٹریچر کی تخلیق ہوئی جو

جوشاندگی اور صورت میں نہ ہوتی۔ سلطنتِ آصفیہ کے درباری شاعروں میں مرزا داغ کے بعد دوسرا نام فصاحت جنگِ جلیل مائیکپوری کا ہے جو نہ صرف مکتب شعر کے آخری استاد تھے بلکہ وہ درباری شاعری جو عہدِ قدیم کا طرہ امتیاز تھی ان کے ساتھ ختم ہو گئی۔ نہ شاہ باقی رہے اور نہ استاد شاہ۔ بقول سولانا سلیمان ندوی،

”ہنرور شاعر اور ہنر پرور بادشاہ میں جو تلازم عہد عباسیہ میں شروع ہوا تھا اس کو بھی حضرت جلیل اور میر عثمان علی خاں پر اب تمام سمجھئے“ اے جلیل کی غزلوں کا سکہ تو آج بھی لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ وہ اپنے دور کے سب سے بڑے غزل تھے لیکن بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ جلیل ایک باکمال قصیدہ گو شاعر بھی تھے جلیل کی درباری شاعری کئی اعتبار سے اہمیت رکھتی ہے۔

۱۔ مدحیہ شاعری کا ذخیرہ اور سرمایہ اثنا دافر ہے کہ شاید ہی کسی درباری شاعر کے پاس ہو۔

۲۔ انھوں نے دو حکمرانوں کا در حکومت دیکھا اور وہ دو بادشاہوں کے استاد تھے جیسا کہ شاہ عثمان کے فرمان سے ظاہر ہوتا ہے۔

”فصاحتِ جنگ بہادر جلیل میرے استاد ہیں جن کو میں فی زمانہ امام  
الغن سمجھتا ہوں ان سے میرے والد مرحوم و مغفور نے بھی اصلاح  
لی تھی بعد وفات فصیح الملک داغ دہلوی“ اے

منصبِ استاد کی سرفرازی سے پہلے جلیل کی مدحیہ شاعری کا آغاز ہوتا ہے جنابِ داغ کی رحلت کے دوسرے سال ۱۳۳۳ھ میں شاہ آصف کی جشنِ جوہلی کی تقریب میں ہمارا کشن پر شاد شاد نے ایک مشاعرہ خاص کا اہتمام کیا تھا۔ اس مشاعرہ میں سولانا خاں بھی موجود تھے اور خود اعلیٰ حضرت اس محفل میں رونق افروز تھے۔ جلیل نے اس موقع پر جو قصیدہ

۱۔ سلیمان ندوی۔ یادِ رنگار ۱۹۸۲ء کراچی ص ۳۳

۲۔ فرمان شاہی مورخہ ۵ ارجمادی الاول ۱۲۵۲ھ ص ۵۲ ضائع شدہ درگزرٹ۔

سُنا یا در حقیقت اس کی مقبولیت ہی سے دربار شاہی میں سپینے کی راہ ہموار ہوئی۔  
قصیدہ کا پہلا شعر یہ تھا:

جشن شاہی میں غجب رنگ اچھلتے دیکھا سا غریب کو بے پاؤں کے چلتے دیکھا  
اس جشن کے سلسلے کا دوسرا قصیدہ جو محبوب الکلام میں طبع ہوا یہ تھا:  
مرے کی آج جشن آصفی میں مدح خوانی ہے اِدھر سے کلفِ شانی ہے اُدھر سے زرِ نشانی ہے  
پھر ایک بار اور قصیدہ گزرا ناگیا جس کا مطلع یہ ہے:

کوئی شاہ دکن کا آج ہتا ہو نہیں سکتا یہ شوکت ہو نہیں سکتی یہ شہر ہو نہیں سکتا  
زمانہ امیدواری میں ایک موقع پر کسی بات پر خوش ہو کر آصف نے جلیل سے مخاطب ہو کر  
یہ مصرع ارشاد فرمایا تھا:

خ جلیل القدر ہو صاحب تمہاری بات کیا کہنا

اس لقب کی سرفرازی پر جلیل نے اسی زمین میں ایک طویل قصیدہ لکھ کر بارگاہِ خسروی میں  
گزارنا مطلع یہ تھا:

جلیل القدر ہو صاحب تمہاری بات کیا کہنا یہ وہ مصرع ہے جس پر چاہیے صدرِ حاکمنا  
اسی زمانہ کا ایک اور قابل ذکر قصیدہ وہ ہے جو دربارِ دہلی کے موقع پر کہا  
گیا جب وہ ملکِ معظم ایڈرڈ ہفتم کے دربارِ تاجپوشی کے جشن میں شرکت کے لیے  
شاہی اسٹاف کے ساتھ دہلی گئے تھے۔ اس طویل قصیدے کا آغاز یوں ہوا تھا:  
سے رہی ہے کیا مرزا آنکھوں میں نید آئی ہوئی ماہِ رے ہم بے پئے مستی سی ہے چھائی ہوئی  
جب یہ قصیدہ دلی میں شائع ہوا تو اس کی مقبولیت ہندوستان بھر میں ہوئی۔

۱۔ مہاراجہ بہادر استاد جلیل السلطنتہ دربارِ آصفی کی ادارت میں دو گلدستے ردِ ربیعہ آصفی  
اور محبوب الکلام شائع ہوتے تھے۔

۲۔ اگرچہ اس وقت تک جلیل کا تعلق دربار سے نہیں ہوا تھا لیکن مہاراجہ شاد دہلی  
سلطنتِ حیدر خان دلاں جیل کے سرپرست و مربی تھے شاہی اسٹاف کے ساتھ انہیں  
بھی اپنے ہمراہ رکھا تھا۔

بعد ازاں ۱۳۲۷ھ ۱۹۰۹ء سے حقیقی درباری شاعری کا آغاز ہوتا ہے جب آپ میر محبوب علی خاں دانی دکن نے ایک فرمان کے ذریعہ نہ صرف اپنے مصاحبین میں داخل کیا بلکہ باقاعدہ طور پر اپنے کلام پر اصلاح لینے لگے۔ وہ فرمان جس کے ذریعہ استاد شاہ بنائے گئے یہ تھا:

”صرف خام میں داغ صاحب مرحوم کی جگہ جلیل حسن صاحب حبیبیل کوئیں نے مقرر کیا ہے۔ یہ بھی مانند داغ صاحب کے میرے مصاحبین میں سمجھے جائیں گے“

اس سرفرازی پر جلیل نے وہ زبردست قصیدہ پیش کیا جو قصائد کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتا ہے۔ اس کے کچھ منتخب اشعار بطور نمونہ درج ذیل ہیں:

جو دن پھرتے ہیں تو سامان پیدا ہوئی جاتا،  
شب غم لاکھ طولانی ہو ٹرکا ہوئی جاتا ہے  
چمن میں پھولنے پھلنے کی لوبت آہی جاتی ہے  
دکن میں بارور نخل تنہا ہوئی جاتا ہے  
رہا جو شرہ کی نظردں میں ترقی اس کو لازم ہے  
بلادریا سے جو قطرہ وہ دریا ہوئی جاتا ہے

جلیل زار کو دیکھو جلیل الفت در کو دیکھو  
تعب کیوں کسی کو ہو ہماری سرفرازی پر  
لکھوں اب شکریہ کے ساتھ کچھ مدح والا  
یہ مدح شاہ وہ مضمون ہے جس کے نظم کرنے کا  
لعب جو شاہ سے ملتا ہے زیبا ہوئی جاتا ہے  
خدا کا فضل ہوتا ہے تو ایسا ہوئی جاتا ہے  
کہ اس موقع پہ دل میں جوش پیدا ہوئی جاتا ہے  
ارادہ میں نہیں کرتا، ارادہ ہو ہی جاتا ہے

کلام خسروی کیونکر نہ دنیا میں نرالا ہو  
رباں پر طوطی ہندوستان کو دہدا آتا ہے  
تلق کو داغ، آتش کو جلن، جامی کو بیہوشی  
شہ کیٹا کا ہر مضمون یکتا ہوئی جاتا ہے  
بیاں پر بلبیل شیراز شیدا ہوئی جاتا ہے  
صبا کو بے کل، سودا کو سودا ہوئی جاتا ہے

مجھے دعویٰ نہیں لیکن شاہ شہ کی لکھت ہوں  
کوئی مانے نہ مانے میں تو ہوں اس فیض کا قائل  
سخن کو اپنی یکتائی کا دعویٰ ہوئی جاتا ہے  
زمین مشکل سے مشکل ہو قصیدہ ہوئی جاتا ہے

جلیل کی درباری شاعری کا پہلا دور یہاں ختم ہوتا ہے کیوں کہ ۳۲۹ھ میں شاہ آصف نے رحلت فرمائی۔ اور نواب میر عثمان علی خاں تخت نشین ہوئے۔ پھر تخت نشین کا جب دربار عام ہوا تو استاد شاہ کی حیثیت سے جلیل نے ایک قصیدہ بارگاہ اقدس میں گزرا نا۔

بزم عشرت میں نئے رنگ کا سا مل دیکھا حالت و جو میں ساغر کو بھی رتھاں دیکھا  
اس قصیدے کے ساتھ جو تاریخ تخت نشین گزرائی گئی وہ دنیا کے تاریخ میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اس کا جواب الہامی تاریخ کے قطعہ میں جس صنعت تمغیہ کا استعمال ہوا ہے اس کا جواب فنِ جبل میں مشکل ہی سے ملے گا۔ شاہ کے ساتویں یاد شاہ ہونے کی تمام سے (۷) اشعار ہیں۔ قطعہ ملاحظہ ہو۔

### قطعہ تاریخ تخت نشین مبارک

اول اول جو ہوئے شاہ دکن آصف جاہ مگر گئے صاف وہ تلوار سے میدانِ دکن  
بعد ازاں آصف ثانی جو ہوئے تخت نشین ہفت اقلیم میں بھلائے وہ خاتانِ دکن  
تیسرے شاہ کا ہے عہد سکندر جاہی ان کے اقبال سے کچھ اور بڑھی شانِ دکن  
ناصر الدولہ ہوئے آصف رابع مشہور شانِ دشوکت نے کہا ان کو سلیمانِ دکن  
دورِ پنجم کا ہے آصف دولہ بہ مدار زورِ دقوت میں جو تھے شیرِ نستانِ دکن  
میر محبوب علی آصف سادس کا تھا نام تھے وہ محبوبِ دکن روحِ دکن جانِ دکن

اُٹھ گئے چھوٹے بفرمانِ خداوندِ جلیل

میر عثمان علی خاں ہوئے سلطانِ دکن

۱۹۱۷ء - ۶ - ۱۹۱۱ء

مصرع تاریخ سالم الامداد نہیں۔ اس میں صنعتِ تخرجہ کو اس خوبی سے استعمال کیا گیا ہے کہ اس کا گمان بھی نہیں ہوتا کہ یہ تخرجہ ضرورتاً کیا گیا ہے۔ فنِ جبل میں اس کا شمار نادرات سے ہے۔ اس پر لطف یہ کہ مصرع تاریخ الفاظ و معنوں کے لحاظ سے برجستہ صاف اور روان ہے۔

اس کے ساتھ ایک مدحیہ قصیدہ بھی سوزوں کیا گیا تھا۔

مدح گوئی فخر ہے طبع رسا کے واسطے دل دُعا کے واسطے لب ہیں ثنا کے واسطے  
کچھ عرصہ بعد جب شاہ دکن لڑ شاہ بنے اور کتھرائی کا دربار سبایا گیا تو جلیل  
نے اس تقریب شادی میں بطور نگہائے عقیدت جو سہرا بڑھا وہ اس لحاظ سے قابل  
ذکر ہے کہ جس زمین کو ذوق و غالب نے اپنی طبع رسا سے روند ڈالا تھا اُسی زمین  
کو جلیل نے اپنے فکر سخن کی جولا نگاہ بنایا۔

### سہرا

آتشِ حسن سے جلتا نہیں رخ پر سہرا  
شوخی ایسا ہے کہ چھوٹے سے اُلجھ پڑتا ہے  
چال سو بھی یہ نیا رنگ جانے کے لئے  
ایک سہرے پہ ہزاروں کی لڑی ہیں آنکھیں  
دیکھئے اس کو تو پستلی میں سما جاتا ہے  
موتیوں کا ہے جو سہرا سرِ نوشہ پہ جلتا ہے  
آب گوہر میں جو ڈوبا ہے سراسر سہرا  
مجھ کو حیرت ہے کہ گوندھا گیا کیونکر سہرا  
پاتوسی کو چلا سر سے اُتر کر سہرا  
نئے پھولوں کا ہے پہنے ہوئے زلیور سہرا  
ناپے اس کو تو ہے قد کے برابر سہرا  
ہم بھی لکھ لائے ہیں گنجنہ گوہر سہرا

تقابلی مطالعہ کے لیے ذوق و غالب کے اشعار بھی درج کئے جاتے ہیں :

غالب : رُخ پہ دلہا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا  
ذوق : ریخِ فرخ پہ جو ہیں تیرے ہرستے انوار  
غالب : دھوم ہے گلشنِ آفاق میں اس سہرے کی  
ذوق : جبکہ اپنے میں سائیں نہ خوشی کے مارے  
غالب : ناؤ بھر کر پرے گئے ہو گئے سوئی  
ذوق : رومانی میں تجھے دے مرو غور شدہ فلک  
غالب : کیا ہی اس چاند سے چہرہ پھلا لگتا ہے  
غالب : یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جا  
غالب : تارِ ریشم کا نہیں ہے یہ رگِ ابر سہرا  
ذوق : اک گہر بھی نہیں حد کاں گہر میں چھوڑا

ہے رگِ ابر گہر بار سراسر سہرا  
تارِ بارش سے بنا ایک سراسر سہرا  
گائیں مرفانِ ناسخ نہ کیوں کر سہرا  
گوندھے پھولوں کا بھلا چہرہ کیوں کر سہرا  
در نہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا  
کھولے منہ کو جو تو منہ سے اُٹھا کر سہرا  
ہے ترے حسنِ دل افروز کا زلیور سہرا  
رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا  
لائیکہ کا تاب گرا نیباری گوہر سہرا  
تیرا بویا ہے لے لیکے جو گوہر سہرا

ڈاکٹر ذکی کا کوروی ان سہروں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

” غالب و ذوق کے دونوں سپرے اُردو سہروں میں اپنا  
جواب شکل سے رکھتے ہیں جلیں کا ایسے استادوں کی پامال  
کی ہوتی زمین میں قدم رکھنا اور کامیابی حاصل کرنا ان کی اعلیٰ  
درجہ کی شاعرانہ صلاحیتوں کا بین ثبوت ہے۔“

(جلیں مانیکوری، ص ۱۲۹)

۱۹۱۱ء میں ملک منظم جارج پنجم کے جشن تاجپوشی کا دربار دہلی میں منعقد ہوا تو  
شاہی اسٹاف کے ساتھ آپ بھی دہلی گئے۔ اس موقع پر ”دربارِ دوبار“ کے نام سے ایک  
طویل قصیدہ لکھا۔

غلغلہ آج ہے دربار کا دنیا بھر میں یہی چرچا ہے زبان پر یہی سودا سُر میں  
قصائد کے علاوہ تہنیشیں اور قطعات بھی جلیں کی درباری نگاہ حصہ ہیں جو شاہی  
تقریبات، عطایا کے شکریے اور مدحِ شاہ سے متعلق ہیں۔ ان میں جلیں نے اپنی تادار الکلامی  
کے جوہر دکھائے ہیں۔ مثلاً:

تلوار کی تعریف میں کہا:

میں یہ سمجھا کسی معشوق کی انگریزائی ہے  
اس نے اقبال کی صورت مجھے دکھائی ہے  
تیغ کے گھاٹ پہ گھنگھور گھٹا چھپائی ہے

جھونک کھا کر ہوتی سیدھی جو لمپکنی تلوار  
سیف میں ہے جو صفائی نہیں آئی ہے  
جو ہراتنے ہیں کہ دیکھے سے سرور آتا ہے  
انگوٹھی کی توصیف میں کہا:

عید کے چاند کی شہرت دے ہاتھ آئی ہے  
لعل و یاقوت نے ہیرے کی کئی کھائی ہے  
نہ زباں ایسی نہ ایسی مری گویا آئی ہے

انگلیاں اُٹھتی ہیں خاتمِ یہ زمانے بھر کی  
ہے وہ خوش رنگ انگوٹھی سا نگینہ جس پر  
شکر الطاف ہو کہ طرح ادا مجھ سے جلتیل  
سونے کی گھڑی عطا ہونے کا شکر یہ:

مجھے گھڑی وہ عطا کی جو ہے عجیب غریب  
کہ سخت جاگ اُٹھے سونے کی گھڑی پائی

گھڑی گھڑی سے سرکار کو خوشی ہو نصیب  
بچا ہے میں جو کہولی عیش کی گھڑی آئی

پری کا حُسن ہے اس کے جمال پر صد تے خرام ناز حسیناں ہے جال پر صد تے  
 کہاں حُسن دلا دیز ماہ کا رسل میں جوئیں نے جیب میں رکھی انرنگی دل میں  
 مقیم ہو کے ہمیشہ سفر میں رہتی ہے ہر اک کے کان میں چلنے کا حال کہتی ہے  
 اسی کے نقش قدم پر زمانہ چلتا ہے اسی سے کام شب و روز کا نکلتا ہے

دعا یہ ہے کہ سلامت مرے حضور رہیں خوشی قریب رہے ناخوشی سے دُور رہیں  
 سیب اور انگور عطا ہونے کا شکریہ:

ہونے کو بہت لوگ ہیں قیمت والے پاتے ہیں یہ پھل حسنِ عقیدت والے  
 ہے دافعِ آسب ہر اک سیب جلیں انگور کی ہیں تاک میں سب ستوالے  
 شکریہ عطاءئے انبہ:

ندوی کو شاہ نے جو کیا آم سے نہال یہ جاں نثار خاص ہوا سر خرد کمال  
 نایاب آم لطف ہوے رنگ رنگ کے کوئی ہے زرد، کوئی ہرا، کوئی لال لال  
 ممکن نہیں زبان سے تعریف ہو سکے! رنگت میں بے نظیر ہیں لذت میں بے مثال

رکھے خدا حضور کو سر سبز و سر خرد احباب سر بلند ہوں بد خواہ پاکمال  
 قدیم آصفی دستور کے مطابق سال بھر میں تین تقریبات سرکاری طرز پر دربار معلّے  
 اور محلات شاہی میں شادی جاتیں۔ جشن سالگرہ مبارک۔ جشن عیدِ صیام۔ جشن عیدِ اضحیٰ۔  
 استاد کو حکم تھا کہ ان تینوں تقریبات شاہی پر قطعات اور تاریکیں بطور ہمینیت پیش کی جائیں۔  
 چنانچہ جلیل کے ایسے صد ہا قطعات اور تاریکیں ہیں جو ان ایام میں بطور خاص کچھ گزرائی  
 گئیں۔

اس سلسلے میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جلیل کی مدحیہ شاعری کا مقام متعین کرنے  
 کے لیے مدحِ آصفِ سابع کے وہ اشعار بھی درج کر دوں جن میں خیالِ آفرینی لطافتِ معنی  
 سے طے کرنا انتہائے کمال کو پہنچ گئی ہے۔ جلیل نے سب سیارہ ہفت افلاک، ہفت اقلیم،  
 ہفت فلزم اور سبع منازلِ قرآن کا شاعرانہ ربط آصفِ سابع کے ساتھ کس نکتہ سنجی اور

کس نازک خیالی سے قائم کیا ہے۔

سبع سیارہ

تھا یہ طغی سے عیاں ادج پطالع ہوگا بخت و اتقال فدا چرخ بھی نابح ہوگا  
سبع سیارہ کی رنستار خیر دیتی تھی کہ جواں ہو کے ہی آصف سابع ہوگا

شاہ ذبیحہ کا جسکو اک اشارا ہو جائے ادج پراس کے مقدر کا ستارا ہو جائے  
سبع سیارہ اسی شوق میں پھرتے ہیں جلیں کہ کہیں آصف سابع کا نظار ہو جائے  
ہفت افلاک

شہ کو سکھ لے ملک پہمذانی دیکھا حکمت و دانش و تدبیر کا بانی دیکھا  
ہفت افلاک کو مدت ہوئی گردش کرتے آج تک آصف سابع کا نہ ثانی دیکھا

ہفت اقلیم

عہد دالامین ہے کیا سلطوت آصفی ہی شہرہ و جاہ و چشم ماہ سے ہے تاہی  
رمزیہ آصف سابع میں ہے مضر کہ جلیں ہفت اقلیم رہے زیر لگیں شاہی

ہفت قلم

گوچر گرے ہیں بہت خسرو قیصر پہلے یوں ہوا کوئی نہ طالع کا سکندر پہلے  
دع کرنا ہے اگر آصف سابع کہ جلیں ہفت قلم میں زباں دھویئے جا کر پہلے

سبع سائل قرآن

شاہ دالامین ہے اللہ کی رحمت کیسی عہد عالی میں ہے اسلام کی شوکت کیسی  
نزلین سات ہیں قرآن میں یہ سابع آصف مصحف پاک کو عثمان سے ہے نسبت کیسی

آصف سابع پر نکتہ آرائیوں کا یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ جلیں اب آصف  
سابع میں سات حرفوں کے مددی اتفاق کا انکشاف کر کے اس شاعرانہ انداز میں ظاہر  
کرتے ہیں کہ بظاہر ایک بڑا راز جو اب تک عام لکھ ہوں سے پوشیدہ تھا اچانک فاش  
ہوتا نظر آتا ہے۔

کیا جشن پر بہار ہے عشرت طراز ہے مسدود باب غم ہے در عیش باز ہے  
آصف میں تین حرف ہیں سابع میں چار حرف یہ اتفاق سات کا قدرت کا راز ہے  
عید اٹھے میں سات حرف ہیں اس پر بھی جلیل کی نگاہ پڑی۔

بخت نازاں ہے ندائے شہ عثمان ہو کر فخر کرتا ہے فلک تابع فرماں ہو کر  
سات حرفوں سے بنی اس لیے عید اٹھے کہ ہے آصف سابع پہ یہ قرباں ہو کر  
عید صیام میں بھی سات حرفوں کا ہونا بڑا دل چپ اتفاق ہے۔

عید تمہید است فتح و نصرت و تائید را بزم شہ در دور آرد ساغر توحید را  
ہست روشن از حروف سبع در عید صیام بہر آصف جاہ سابع ساختہ این عید را  
بعد ازاں جلیل نے لفظ عثمان کے حروف ان کی تعداد اور نقاط کا تجزیہ  
کر کے ان سے بھی عجیب و غریب مضامین پیدا کئے حروف کی رعایت سے جن اشعار  
میں استفادہ کیا ہے ان کا نمونہ یہ ہے۔

جو عید آئی توبادہ بھی حساب میں آیا ہمارے عشرت جاوید دام میں آیا  
یہ شبہ کے حتیٰ میں نشاط دوام کی ہے کہ عین عید کا عثمان کے نام میں آیا

عین عثمان سے ہوئی عید کی عشرت پیدا حرف ثا سے ثمر نخل سعادت پیدا  
میم سے منظر اقبال و کمال و اجلال اوج الف سے ہے عیاں نون سے ثمر پیدا

عثمان کا عین عشق الہی یہ دال ہے ثا ثمرہ نہال عروج و کمال ہے  
میم دال ف مراتب و اجلال کا نشان توں نغمہ عطوفت و جود و نوال ہے

سرکار آفتاب سپہر کمال ہیں بحر کرم ہیں، مظہر شانِ جمال ہیں  
عثمان علی کے نام میں دو عین اے جلیل عشق خداؤ عشق محمد پیہ دال ہیں  
اسی طرح حروف اور نقاط کی تعداد سے یوں مضمون آفرینی کی ہے۔

عثمان میں پانچ حوت ہیں جو آشکار ہیں      لفظے ہیں چار جو گہرے سحر ہیں  
اس سے کھلا یہ راز کہ عامی حضور کے      روز ازل سے بخت و چار و یار ہیں  
شاہ عثمان میں سات لفظے ہیں۔ ان کی تاویل یوں کی گئی ہے۔

فرد ہیں آصف سابع کرم و احسان میں      گل کھلا کوئی نہ ایسا چمن اسکاں میں  
سات لفظے جو درخشاں ہیں گماں ہوتا ہے      سبع سیارہ ہیں دامن شہ عثمان ہیں

شاہ عثمان میں جو لفظے ہیں عجب پیارے ہیں      آسمانِ حشم و جاہ کے سب تارے ہیں  
سبع سیارہ ہیں لاریب یہ ساتوں لفظے      فرق اتنا ہے یہ ثابت ہے وہ سیارے ہیں

### مدحیہ قصائد پر تنقیدی نظر:

جلیل بنیادی طور پر نزل گو شاعر ہیں پھر بھی قصائد جو انھوں نے لکھے اور ان میں  
جس اجتہاد سے کام لیا وہ اس صنفِ قصیدہ گوئی میں ایک نیا موڑ ہے۔ عام روایتی انداز  
سے ہٹ کر جلیل نے اپنا راستہ الگ بنایا۔ انھوں نے ان میں نہ تو اپنی علمیت کا  
اظہار کیا نہ صنفِ گری کی اور نہ مختلف علوم کی اصلاحات کو اپنے قصیدوں میں سمویا جو  
ستودا اور انشا کے زمانے میں قصیدہ نگاری کا حُسن سمجھے جاتے تھے۔ جلیل نے اپنے ابتدائی  
قصائد میں تشبیب، گریز اور مدح کے لوازمات کو بہت ضرور ہے لیکن بڑے ہی اختصار  
اور سہل منتع کے ساتھ اور پھر سادگی و پرکاری ایسی کہ سننے والے کو ذرا بھی اکتا نہ ہو  
محسوس نہیں ہوتی۔ انھوں نے اپنے قصائد میں شریعت کا خون، قصیدہ نگاری کی خاطر  
نہیں کیا بلکہ قصیدہ نگاری میں شریعت کو داخل کیا۔ مثال کے طور پر یہاں ہرمت ایک  
قصیدہ کا جائزہ لیا گیا ہے۔

تشبیب (عاشقانہ یعنی وارداتِ حُسن و عشق)

آنکھوں میں آج اک صنم خوش جمال ہے      کس سے مثال دوں کہ عیدِ مثال ہے  
صانع کی یاد آتی ہے صفت کو دیکھ کر      اللہ کیا جمال ہے کیا خط و خال ہے  
ہے وہ گلاب جس سے طراوتِ رنگاہ میں      ہے وہ نہال جس سے سلیجِ نہال ہے

زلفوں کے دام پر تو ہے صیاد کا گماں  
آنکھیں یہ کہتی ہیں کوئی رعنا غزال ہے  
اس سادگی پہ لاکھ تکلف نثار ہوں  
پہندی نہیں لگائی مگر ہاتھ لال ہے

تو کون ہے خدا کے لئے اے بت حسین  
جاتے رہے حواس یہ کیسا جمال ہے  
جنت کی حور ہے کہ پرستان کی پری  
سچ مچ بتا تجھے قسم ذوالجلال ہے  
نام و نشان سے تیرے مجھے بھی ہوا آگہی  
خواہش یہی مری یہی دل کا سوال ہے

دیکھا جو اضطراب مرا اس نے یہ کہا  
اتنی سی بات کے لیے تیرا یہ حال ہے  
میں سلطنت ہوں اس شہ گردوں سریر کی  
جو نیر منور اوج کمال ہے

باغِ دکن میں جلوہ نما وہ بہارِ عیش !  
باغِ سخن میں طوطیِ شیریں مقال ہے  
محبوب ہے علیؑ کا وہ مطلوب جان و دل  
ظلِ خدا ہے ذوالکرم و ذوالجلال ہے  
اصف لقب ہے اس شہ والا شکوہ کا  
فیاض ہے کریم ہے عالی خیال ہے  
تیرا جمال تیری جلالت یہ دال ہے  
بازل وہ ہے کہ داد و دہش بے سوال ہے  
مادل وہ ہے کہ آج ہو میں ہوا عدال  
حاکم کیا ہے جب سے تجھے کردگار نے  
ظالم کی ہے پکار کہ حمیت اوبال ہے

دکھلا رہی ہے شان تری بندہ پروری  
اک دل ہے اور سائے جہاں کا خیال ہے  
وصفِ حضور کیا ہو رقم کیا بیان ہو  
خامہ مرا قلم ہے زبانِ پیری لال ہے  
دُعا

افزون ہو عمر و جاہ، بڑھے حشمت و سپاہ  
جب تک شمار روز و شب و ماہ و سال ہے  
قصیدہ کے اس مختصر جائزہ کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ جلیل نے  
روایتی طور پر لوازماتِ قصیدہ کو نہیں اپنایا۔ حتیٰ کہ تشبیب و مدح میں بھی اختصار اختیار کیا  
کو پیش نظر رکھا۔ ادق لفظیات، مشکل ترکیب اور صنائعِ بدائع کی بہتات کے

بر خلاف سادگی و صفائی کو جگہ دی اور اس سلاست میں کبھی اکھنوں نے مسمون آفری  
 اور نازک خیالی کا دامن نہیں چھوڑا۔ یہ قصائد خشکی سے نہیں تغزل سے کھر لورے ہیں۔  
 ان کے علاوہ مدحیہ نظموں، قطعات تہنیت، رُبا عیوں اور قطعات تاریخ کا اتنا  
 ضخیم سرمایہ اپنے پیچھے چھوڑا ہے جس کے ذکر کے بغیر جلیل کی شاعرانہ عظمت مکمل  
 نہیں ہوتی۔

## تاریخ گوئی

جلیل نے غزل کے علاوہ بہت کم اصنافِ سخن کو اپنایا ہے لیکن جسے اپنایا اُسے کمال تک پہنچایا۔ ان میں فنِ تاریخ گوئی بھی ہے۔ ان کے یہاں تاریخ کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے کہ ایک بیاض تاریخ ترتیب دی جا سکتی ہے، یہ تمام تاریخیں مسودات کی صورت میں میرے پاس محفوظ ہیں۔ بہت سے قطعات تاریخ مختلف مجموعہ ہائے کلام میں موجود ہیں۔

تاریخ علمِ بدیع کی صنعتوں میں سے ایک ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تاریخ نکالنے والا کسی امر کے واقع ہونے کو کسی لفظ یا فقرے یا مصرع یا اس سے زیادہ بڑی عبارت کے ذریعہ پیش کرے جس کے ساتھ اعدادِ حسابِ حمل کے لحاظ سے بیان کردہ سنہ کے مطابق ہولناں فرمان فتح پوری کے الفاظ میں — کسی واقعہ کے تاریخ وقوع کو الفاظ میں اس طرح بیان کرنے کو کہ حرف کے اعداد سے سنہ وقوع ظاہر ہو اصطلاح میں تاریخ گوئی کہتے ہیں“ ۱

تاریخ گوئی ایک فن ہے جو تخصیص جاتا ہے۔ اچھی تاریخ نکالنے کے لیے بڑی ہنرمندی کی ضرورت ہے۔ تاریخ گوئی میں شاعر کا کام واقعہ کے اظہار کے لیے ایک لفظی پیرایہ فراہم کرنا ہوتا ہے جس کے حروف کی عددی قیمت واقعہ کے سنہ تاریخی کے برابر ہو اور یہ کوئی آسان بات نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات تارکِ الکلام شاعروں کو بھی کامیابی نہیں ہوتی ۲

تاریخ گوئی کے کئی اقسام ہیں۔

۱۔ ہرین جنگ دلا۔ غرائب الجمل ص ۴۲ نقوش۔ عصری ادب نمبر ۹۸۲ ص ۶۲

۲۔ حسن الدین احمد۔ ابتدائی باتیں۔ غرائب الجمل (زیر طبع)

صوری معنوی صوری و معنوی

جلیل نے تاریخ معنوی پر ہی اپنا سارا زور صرف کیا ہے معنوی میں جلیل کے یہاں تین صورتیں ہیں۔

مطلق یا سالم الاعداد

یہ تاریخ معنوی کی وہ صورت ہے جس میں کسی مادہ تاریخ کے الفاظ میں بغیر کسی کمی و بیشی کے کل حروف کے اعداد جمع کرنے سے تاریخ کا سال نکال آئے۔  
تعمیہ :- اصطلاح اہل جمل میں تعمیہ یا تعمیہ وہ ہے جس کے ذریعہ تاریخ کے اعداد کو درست اور برابر کریں خواہ زیادتی کے ذریعہ ہو یا کمی کے ذریعہ۔ تعمیہ کی دو صورتیں ہیں۔  
(ا)۔ تعمیہ داخلی یا مدخلہ۔ اگر مادہ تاریخ میں اعداد کی کمی ہو تو اس میں بھرتی کا عمل مدخلہ کہلاتا ہے۔

(ب)۔ تعمیہ خارجی یا تخرجہ۔ اگر مادہ تاریخ میں اعداد کی زیادتی ہو تو اس کو کم کرنے کا عمل تخرجہ کہلاتا ہے۔

تعمیہ کی دونوں صورتوں میں خواہ وہ تعمیہ داخلی ہو یا تعمیہ خارجی یہ اشارہ دینا ضروری نہیں ہے کہ کون سے لفظ سے داخلہ یا خارجہ کا عمل کیا گیا ہے۔ البتہ لطیف اشارے کئے جاتے ہیں جو تاریخ گوئی میں لطافت کا کام دے۔

جلیل نے ان اقسام میں جو تاریخیں نکالی ہیں ان میں اعلیٰ درجہ کی اور نادر و نایاب تاریخوں کی کمی نہیں۔ ان میں لفظی و معنوی حسن بھی ملتا ہے اور موقع و محل کی مناسبت بھی۔ انھوں نے فن و زبان شاعری کے جملہ محاسن کا لحاظ رکھتے ہوئے مناسبت کی صحیح ترجمانی کی ہے۔

جلیل کی ان تاریخوں کے موضوعات — دلالت، وفات، شادی و دیگر تقریبات، اشاعت دواوین، تعمیر عمارت و تالاب، اور عطایات شای و غیرہ۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختلف اقسام کی تاریخوں میں سے ہر ایک قسم کی چند مثالیں درج کر دی جائیں۔

## سالم الاعداد تاریخ کی مثالیں :

تاریخ گوئی میں سب سے بہتر وہ تاریخ سمجھی جاتی ہے جو اپنی جگہ مکمل اعداد رکھتی ہو۔ جو غیر کی محتاج نہ ہو۔ یعنی مصرع تاریخ کے اعداد کا مجموعہ ہی ٹھیک سند مطلوب ہو۔ جلیل کی یہ تاریخیں دیکھئے :

تاریخ وفاد آغ : صدیف وہ دلو دے گئے داغ (۵۱۳۲۲)

تاریخ وفات ریاض : چمن خلد ہے مقام ریاض (۱۹۳۳ء)

تاریخ عطائے شمشیر : آج شمشیر عطا کی سند نے (۵۱۳۲۹)

تاریخ وفات مظفر خیر آبادی : اٹھا آج اعتبار ملک معنی (۱۳۲۵ھ)

تاریخ طبع ہتاب داغ : کیا نیا چاند ہے کہ داغ نہیں (۵۱۳۱۰)

تاریخ عطائے انگشتی : ایک انگوٹھی ہاتھ آئی شاہ سے (۵۱۳۳۱)

ان مادہائے تاریخ میں آپ دیکھیں گے کہ تاریخ کے مصرع کتنے بے ساختہ رول بغیر کسی تعقید اور بھرتی کے الفاظ کے سوزوں ہوئے ہیں۔ نام اور واقعہ کی سوزونیت اور رعایت لفظی نے مصرعوں کی شریعت میں اضافہ کیا ہے۔ داغ نام کی رعایت سے داغ دینے کا محاورہ، ریاض کی مناسبت سے چمن خلد ہتاب داغ کے تعلق سے چاند اور داغ سے الفاظ کا انتخاب، انگوٹھی کی رعایت سے ہاتھ آنے کا محاورہ، شہزادہ کے لیے شمر گلشن کا استعارہ — یہ تمام مناسبات ایسے ہیں جن کا تاریخی اعداد کے ساتھ یکجا کرنا سارے دارد ہوتا ہے۔ ایسے تصرفات جلیل کی قدرت و قادر الکلامی پر دال ہیں۔

## تعمیہ خارجی و داخلی :

دوسرے زمرہ میں وہ تاریخیں آتی ہیں جن میں اعداد کی کمی و بیشی کے لیے تعمیہ داخلی و خارجی سے کام لیا گیا ہے۔ غلام حسن کسریٰ اس تعلق سے لکھتے ہیں :

”فن تاریخ میں تعمیہ کو عجز طبیعت کے نام سے موسوم کیا جاتا

ہے لیکن تعمیر کے لیے مورخ کو جس قدر زحمت اٹھانی پڑتی ہے وہ اہل فن سے پوشیدہ نہیں۔۔۔ ایسے تعمیراتی اور مورخ کی مکمل اور صحیح فکر و کاوش کے وہ لازوال نمونے ہیں جن کے لیے اس فن کے فنی کمالات میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔

حضرت جلیل قبلہ تعمیر فرماتے ہیں منفرد ہیں اور نرالے رنگ اور اچھوتے رنگ میں تعمیر فرماتے ہیں کہ اہل نظر کچھ اس کمال کی داد دے سکتے ہیں؛ لہ

جلیل کے کلام سے پہلے تعمیر خارجی کی کچھ مثالیں یہاں درج کی جاتی ہیں، جلیل مصرع تاریخ بے بہا نکلا کہ آئی شاد سے ملنے کو بکے رحمت عید ۱۳۸۳ھ مادہ تاریخ کے اعداد ۱۳۹۱ ہوتے ہیں اور نہ مطلوب ۱۳۸۳ ہے۔ اس لیے بے بہا کہہ کر بہا کے (۸) عدد کو خارج کر دیا گیا ہے۔

طبع کا سال ایک نکلا ہے جلیلی دیکش و نادر ہے میلانے خیال ۱۳۵۱ھ مصرع تاریخ کے اعداد ۱۳۵۲ ہیں جب کہ مطلوبہ سنہ ۱۳۵۱ درکار ہے۔ لفظ ایک سے ایک عدد کا تخریج کیا گیا۔

فرد نکلا یہ مصرع تاریخ اے خوشا جامہ دار سلطان ۱۳۳۳ھ مادہ تاریخ میں ایک عدد نہ آتا تھا۔ اس کو نکالنے کے لیے فرد کا لفظ رکھا ہے۔ فرد کے معنی ایک کے بھی ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظ فرد، جامہ دار کے ساتھ جو رعایت لفظی پیدا کرتا ہے وہ قابلِ داد ہے۔

ادانعلی ہے تاریخ میں یہ خوب جلیلی بہار گلشن جاں ہے یہ شہزادہ سالگرہ ۱۳۳۴ھ مصرع تاریخ کے پہلے مصرع میں ادا کے لفظ سے تخریج کا عمل کیا گیا ہے۔ ادا کے اعداد ہوتے ہیں چھ (۶)۔ یہ چھ عدد کی زیادتی جو مصرع تاریخ میں تھی ادا کے عدد سے کم ہوگئی۔

صفت تخریجہ کی ایک نادر و نایاب مثال آصف سابع کی تخت نشینی کا قطعہ تاریخ ہے جس میں (۷) عدد کا تخریجہ اس صحن سے کیا گیا ہے کہ اس کا جواب دنیائے تاریخ نہیں پیش کر سکتی۔ سات شعر کے قطعہ تاریخ میں (۶) سلاطین آصفی کا ذکر نام بنام کیا گیا ہے۔ قطعہ کا پہلا شعر ہے

اول اول جو ہوئے شاہ دکن آصف جاہ کر گئے صاف وہ تلوار سے میدان دکن  
چھ سلاطین کے ذکر کے بعد ساتویں شعر میں آصف سابع کی تخت نشینی کا سال یوں نکالا گیا ہے۔

اٹھ گئے چھ تو بفرمانِ خداوند جلیل میر عثمان علی خان ہوئے سلطانِ دکن (۱۹۰۰)  
یہ تخریجہ ایسا ہے جس کے آگے سالم الامداد تاریخ بھی سرخم کرتی ہے۔  
تعمیرِ داخلی — وہ صورت ہے جب کہ مادہ تاریخ میں کچھ اعداد کی کمی رہ جاتی ہے اور باہر سے اس کی تکمیل کی مختلف صورتیں تلاش کی جاتی ہیں مثلاً

آگیا ایک لب پہ مصرع سال دوسرا شیر بھی شکار ہوا (۵۱۳۳۲)  
مادہ میں ایک عدد کی کمی کو لفظ ایک یعنی ایک عدد کے جمع سے پورا کیا گیا ہے۔ ایک اور دوسرا میں جو معنوی ربطیت ہے وہ اس مادہ تاریخ کا حصہ ہے۔

جلیل مصرع تاریخ کیا بلا زیا ہزاروں سال ہو پروردگار سالگرہ (۵۱۳۴۰)  
دوسرے مصرع یعنی مادہ تاریخ کے اعداد ۱۳۲۰ ہی ہوتے ہیں۔ زیبا کا لفظ جس کی مدد قیمت (۲۰) ہے اس کی کوپوراکرتا ہے۔

پڑھو جلیل بہ آواز مصرع تاریخ الہی تا بہ اندہ ہوشمار سالگرہ (۵۱۳۳۹)  
مادہ تاریخ کے اعداد (۱۳۳۲) ہیں یعنی مطلوبہ سنہ سے (۱۵) کم۔ آواز کی عددی قیمت (۱۵) ہے جس سے مدخلہ کا کام لیا گیا ہے۔

حیدر آباد کے ڈیم نظام ساگر کی تعمیر کی تاریخ مدخلہ کی ایک نادر مثال ہے یہ تاریخ فارسی میں ہے اور نظام ساگر ٹینک بند پیر کاندہ ہے۔

آب در جو آمد و تاریخِ غنم اے جلیل در دکن آور دشمن چہر آب حیات (۱۹۳۲)  
مادہ تاریخ کے اعداد ۱۹۲۰ ہیں یعنی سنہ مطلوبہ کے لئے (۱۲) عدد کی کمی

ہے۔ یہ کمی مصرع اولے کے دو الفاظ آب اور جو سے پوری کی گئی ہے۔ آب کی مددی قیمت (۳) اور جو کی (۹) ہے۔ یہ دونوں مل کر (۱۲) عدد کی تکمیل کرتے ہیں۔ یہ تخریجہ اہل نظر سے کافی داد لے چکا ہے۔

ادپر کی سطر دہ میں لکھا جا چکا ہے کہ جلیل نے تاریخ میں ندرت و جدت پیدا کرنے اور اس کی صنعتوں کی طرف توجہ نہیں دی ہے تاہم کچھ جدولوں اور صنعتوں کے نمونے مل جاتے ہیں۔ چنانچہ سالم الاعداد تاریخوں میں ایسی تاریخیں بھی ہیں جہاں انھوں نے مکمل مصرعوں کے بجائے مصرع کے کسی جزو سے تاریخ برآمد کی ہے اس کی چند مثالیں حسب ذیل ہیں۔

تاریخ تذکرہ خندانہ جاوید

ع نکر ہے کیوں سال کی، یہ تذکرہ خود سال ہے

۱۳۲۵ھ

تاریخ وفات امیر مینائی

گئے جو غلدہریں کو تو انکی تربت سپہ جلیل نے یہ لکھا۔ روضہ جناب امیر

۱۳۱۸ھ

تاریخ طبع دیوان شاعر بکھنوی

چھپ کر جو ہوا شائع افکار کا مجموعہ تاریخ بھی میں نے۔ دیکھو سخن شاعر

۱۳۲۶ھ

صنعت منقوط :

جلیل کے یہاں صنعت منقوط میں کئی تاریخیں ملتی ہیں۔ اسے صنعت اعجام بھی کہتے ہیں۔ فنِ حمل میں صنعت منقوط اس مادۂ تاریخ کا نام ہے جس میں حروفِ ہملمہ کو چھوڑ کر صرف حروفِ معجم سے تاریخ نکالی جائے یعنی منقوط حروف کے اعداد ہی شمار میں لائے جائیں۔ مثلاً

جلیل اچھی کہی تاریخ یہ منقوط میں میں نے چراغ کعبۂ علم و عمل محمود شاہ آئے ۱۳۲۵ھ  
اس تاریخ میں صرف چ، غ، ب، ش اور ی کے اعداد ہی کو شمار میں لایا گیا ہے۔ غیر منقوط حروف سب چھوڑ دیے گئے۔ اس صنعت کی دیگر تاریخیں یہ ہیں :

حرف منقوط میں تاریخ بھی نہیں نے جلیل چھپ گیا شام کو غور شید علی کا صدحیف ۱۳۲۵ھ  
 چونکہ دم فکر تاریخش بہ منقوط ندا آمد خوشادلیوان ناظم ۱۹۱۰ء  
 کیں بہ منقوط است تاریخ اے جلیل زندہ باش عثمان علی خاں زندہ باش ۱۹۲۸ء

## صنعت تضاعف :

اس صنعت میں بہت کم تاریخیں لکھی جاتی ہیں۔ جلیل کی تاریخ ذیل اس کی اچھی مثال ہے۔ اس صنعت میں تاریخ کے الفاظ کو دہرانے یا اعداد کو دو چند کرنے سے مفید حاصل ہوتا ہے۔

مطلوب جو تاریخ ہو دیوان کی جلیل دوبار کہو ہے نعت گوئی اعجاز ۶۶۳ھ  
 نعت گوئی اعجاز کے تاریخی اعداد (۶۶۳) ہیں اس عدد کو دو چند کرنے سے ۱۳۲۶ حاصل ہوتے ہیں۔ نعتیہ دیوان کا مطلوبہ سنہ یہی ہے۔

## صنعت توشیح :

تاریخ گوئی میں یہ صنعت بھی بہت کم استعمال ہوتی ہے۔ حیرت ہے کہ عزیز دلا کی تالیف غرائب الجمل میں اس صنعت کا بیان نہیں ملتا۔ جلیل کے یہاں صرف ایک تاریخ ملتی ہے جو ان کے کمال فن کا بین ثبوت ہے۔ ڈاکٹر ذکی کاوردی نے اس تاریخ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے :

”صنعت توشیح ایک شکل صنعت ہے۔ اس میں بھی جلیل نے تاریخیں

لکھی ہیں۔ اس صنعت میں ہر مصرع کے پہلے حرف کے اعداد کی جمع سے اور اسی طرح ہر مصرع کے آخری حرف کے اعداد کی جمع سے دو تاریخیں نکلتی ہیں۔ ایسا ایک قطعہ تاریخ ملاحظہ فرما :

- |     |                           |    |
|-----|---------------------------|----|
| ۳۰. | شکر مدشکر خالق بنزداں     | ۵. |
| ۲۰. | کہ ہوئی پوری آرزو سے جہاں | ۵. |
| ۲۰. | سکاظم نیک طالع و خوشرو    | ۶  |

۵۰	نام پر جس کے جان و دل قرباں	۵۰
۳۰	خوب پیدا ہوا مبارک فال	۶۰۰
۵۰	ہو گئی سیرگشت زار جہاں	۵
۳۰	ذکر مولود سے جہاں ہے خوش	۷۰۰
۵۰	عید کا ہے مکان میں سماں	۷۰
۱۰	فیض دیدار حسن صورت ہے	۸۰
۵۰	آنکھ روشنی ہے اور دل شاداں	۱
۶۰۰	میں نے کیا خوب یہ بھی تاریخ	۴۰
۵۰	حبلوہ اور چشم راحتِ حبال	۳

۱۲۹۶ ت

۵۱۳۰۶

۱۸۸۹ ع

اس قطعہ تاریخ میں صنعت توشیح کی دو تاریخوں کے علاوہ آخری  
مصرع سے تیسری ہجری تاریخ بھی نکلتی ہے۔ ایسی تاریخیں فن  
تاریخ گوئی میں اپنا جواب نہیں رکھتیں، لہ

فن تاریخ گوئی پر جلیل کی کامل دسترس کا علم ان استفسارات کے جواب سے  
ہوتا ہے جو اس فن کے بارے میں دقتاً فوقتاً ان سے کئے جاتے رہے ہیں۔ مثال کے  
طور پر چند جوابات درج ذیل کئے جاتے ہیں۔

۱۔ اللہ میں دو لام ہیں۔ اس کے (۶۶) عدد لئے جاتے ہیں۔

۲۔ ہوے اور ہوئی (ہوئی) کا اِلا ایک یا کے ساتھ بھی ہے اور دوبارے  
ساتھ بھی۔ میرے نزدیک ایک یا کو ترجیح ہے ہمزہ لکھیں یا نہ لکھیں اختیار ہے  
کیوں کہ ہمزہ عدد میں محسوب نہیں ہوتا۔

۳۔ آئے (آے) کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ آے یا ئے موقوف کے ساتھ  
بر وزن فاع ہو اس میں ایک یا ہے۔ اس کے دس عدد لئے جائیں گے۔ دوسری

صورت آئے بروزن فعل ہے جس میں دو یا ہیں۔ اس کے (۲۰) عدد محسوب ہوں گے۔  
۴. آئی میں ہمزه نہیں بلکہ یا ہے لہذا دو یا کے (۲۰) عدد لینا چاہیے۔ یعنی  
لفظ آئی کے (۲۱) عدد شمار ہوتے ہیں۔

۵. لکھنؤ کا ہمزه عدد میں شمار نہیں ہوتا لیکن اگر نون کے بعد شوشہ ہو (لکھنؤ)  
تو ایسی صورت میں دس عدد لئے جائیں گے اور اگر شوشہ نہ ہو تو کوئی عدد نہیں  
لایا جائے گا۔

۶. سرائے میں ہمزه نہیں ہے یا ہے۔ اس کے دس عدد شمار کئے جائیں  
گے۔ اور سرائیر یا کے بھی صحیح ہے اور بکثرت مستعمل ہے۔

۷. مصرع تاریخ میں ہائے مختفی کو الف کے قافیوں کے ساتھ لکھنا  
درست نہیں۔ بغیر مادہ کے عام قوافی میں الف سے لکھنا جائز ہے اور کثرت سے  
مستعمل ہے۔

۸. خفی رحمت اللہ تائے دراز سے درست نہیں۔ قرآن شریف  
میں رحمت بتائے مدور مسطور ہے ہر ایک قرآن میں یہی کتابت ہے۔ اس صورت  
میں تائے مدور کے حرف (۵) عدد لئے جائیں۔ اے



۱۔ یہ جوابات مسکتیب جلیل کے صفحات ۸۹، ۹۲، ۱۰۷، ۲۲۲ سے لیے  
گئے ہیں جو راقم الحروف کی مرتب کردہ ہے۔

تجربہ

## صنائع لفظی و معنوی

صنائع سے شعر کے الفاظ کی نشست و ترتیب میں حُسن پیدا کیا جاتا ہے  
ایمانی اثر کو بڑھایا جاتا ہے۔ لفظوں سے تراشے جانے والے پیکر چونکہ اعلیٰ ترین  
ذہنی کاوش کا نتیجہ ہوتے ہیں اس لیے لفظی و معنوی صناعتی مرن انہیں سے ممکن ہے  
جن کا ادبی مذاق، ریاض اور ذہنی پختگی کا حامل ہے۔

پروفیسر سلیم چشتی کے الفاظ میں:

”فن شاعری کے لحاظ سے کسی شاعر کے قادر الکلام ہونے  
کا معیار یہ ہے کہ وہ صنائع بدائع معنوی کو کس کس پہلو  
سے اپنے کلام میں استعمال کر سکتا ہے“ عہ

کسی شاعر کا تنقیدی نقطہ نظر سے جائزہ لیتے وقت اس کے کلام کی صناعتی  
پر غور کرنے سے اس کی ذہنی کیفیت کا بھی صحیح اندازہ ہو سکتا ہے کیوں کہ اس بات  
کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ درپردہ یا بین السطور شاعر نے کوئی بات  
کہی ہو۔ لے صفتوں کا استعمال شاعری میں مقصود بالذات نہیں مقصود بالذات تو وہ  
بات ہے جو شاعر کہنا چاہتا ہے۔ ان کے ذریعہ کلام کی تزیین ہوتی ہے۔ شعر کی  
تاثیر اور اس کی معنویت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ان میں معنی پر دلالت کرنے کیلئے  
مختلف طریقے یا پیرائے استعمال کئے جاتے ہیں جو مختلف صنعتوں کی صورت میں  
ظاہر ہوتے ہیں۔

جلیل مانپکوری کے یہاں لکھنؤ کے انداز کے مطابق لفظی و معنوی صنائع  
کا استعمال شعوری اور غیر شعوری طور پر ملتا ہے لیکن ان کی نہ تو کثرت ہے اور نہ ہی  
ان کا استعمال ایسا رسمی ہے جس کے لیے دماغی کاوش کی جائے ان سے لطفِ شعر

میں اضافہ ہی ہوا ہے۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ جلیل نے اپنے کلام کی تزئین اور شعر کی معنویت دونوں کو بڑھانے کے لیے کن کن صنعتوں کا سہارا لیا ہے؟ ان پر محض صنعتوں کے استعمال کا لیل تو نہیں لگایا جاسکتا؛ جلیل کے یہاں کم و بیش ہر صنعت موجود ہے۔

## صنعت لفظی

۱۔ تجنیس۔ اس صنعت میں دو الفاظ ہر طرح یعنی کتابت اور تلفظ میں مشابہہ ہوتے ہیں لیکن معنی کے اعتبار سے ان میں فرق ہوتا ہے۔ جلیل کے کلام میں اس کی (۵) صورتیں ملتی ہیں۔ (۱) تجنیس نام۔ ایسے دو لفظ جو ہر صورت میں یعنی شمار، ترکیب اور حرکات و سکنات میں ایک دوسرے کے مشابہہ ہوں لیکن معنی میں ایک دوسرے سے الگ جیسا کہ جلیل کے ان شعروں سے واضح ہوتا ہے:

ہے لاکھ لاکھ شکر خُداے جلیل کا جس نے در سخن سے بھرا منہ جلیل کا  
دیم دیدار دم آنکھوں میں کھینچا آتا ہے کیسی دلکش ہے مرے زخم جگر کی صورت  
یوں کھلے منہ شب کو سونا اور زبرِ آسمان چاند اڑا لیجائے گا سونا ترے رخسار کا  
۲۔ تجنیس محرف۔ یہ ایسی تجنیس ہے جس سے دونوں لفظوں کی ظاہری شکل یا اعتبار حروف ایک ہی ہو مگر حرکات و سکنات اور اعراب میں مختلف ہو۔

مجھے سخت جاں کہتا جاتا ہے قاتل گلا کٹ رہا ہے گلا ہو رہا ہے !!  
رہا۔ اسیر تو شکوے رہے اسیری کے رہا ہوا تو مجھے غم ہوا رہا کی کا !!  
۳۔ تجنیس زائد یا ناقص۔ ایسے الفاظ استعمال کرنا جن میں سے ایک کے اول بیچ یا آخر میں ایک لفظ کا اضافہ ہو جائے۔

اچھا ہوا کہ وصل کی شب ہو گیا وصال اب حشر تک تو صلح کا دھڑکا نہیں رہا  
بم تو اتنی سخت حانی کی حا سے کٹا گڈ سے کہتے ہیں وہ کیا کاٹ ہے تلوار  
انہ ہو کچھ جوڑ چل گیا نزاکت کا  
صرف ایک حرف کا اختلاف ہو

اور وہ حرف بعید المخرج بھی ہو۔

اے تیغِ ناز چھوڑ نہ منجدھار میں مجھے  
کر گئی دیوانگی ہم کو بُری ہر جُرم سے  
نثار کر دے جوستی میں اپنی ہستی کو  
(۵)۔ تجنیس مذیل: جب دو تجنیسی لفظوں میں سے کسی ایک لفظ میں دو حرف زائد ہوں،

تم تو بہرِ در نہیں در دہمارا کیا ہے  
ترکِ شراب کا مجھے برسوں اثر رہا !  
ایک دن دیکھی تھی اس نے وحشتِ مجزل کی سیر  
۲۔ صفتِ اشتقاق :- اس صفت میں ایک ہی مادہ سے مشتق الفاظ استعمال  
کئے جاتے ہیں جن کی اصل ایک ہی ہو۔

ادامتی بھری نظروں میں مستی چالِ مستانہ  
ترے حسن کا ذکر، مذکور مسیحا  
کوپے میں یار کے ہی پھولوں کی سیج ہے  
۳۔ صفتِ تکریر :- دو لفظوں کو جو ایک ہی معنی رکھتے ہوں شعر میں برابر جمع کرنا۔  
اس کی کئی صورتیں ہیں۔

(۱) بجزرِ مطلق :- ایک ہی معنی میں دو لفظوں کو بغیر کسی فصل کے مکرر استعمال کرنا  
صبا نے جھکو سگھائی ہے جب سے بوتری  
چمن چمن لئے پھرتی ہے جستجو تیری  
بلبل کی بہار میں نہ پوچھو  
منہ چوستی ہے کلی کلی کا  
کی محبت نے آج یہ اصلاح سیکھ  
شیشوں کو توڑ توڑ کے پیسا کر دیا  
(۲) بجزرِ مع الوسائط :- اس صفت لفظی میں مکرر آنے والے الفاظ کے درمیان

وقف پیدا کرنے والے الفاظ پر، پہ کے ذریعہ مفہوم میں دور پیدا کیا جاتا ہے  
پھول پر پھول کھیلے نذر خزاں ہو ہو کر  
داغ پر داغ اٹھانے کو میں گلشن میں ہوا  
تیر پر تیر چلاؤ ہمیں ڈر کس کا ہے  
جان کس کی ہے مری جان جگر کس کا ہے  
ذبح کرنے میں ستم اوستم ایجاد نہ کر  
رحم کر رحم کے پردے میں یہ بیداد نہ کر

(۳) تکریرِ مثنوی :- تکریر کی اس قسم میں پہلے اور دوسرے دونوں مصرعوں میں لفظوں کی تکرار ہوتی ہے۔

ذرا ذرا سی شکایت پہ روٹھ جاتے ہیں نیا نیا ہے ابھی شوق آشنائی کا  
رفتہ رفتہ رنگ لایا اشکِ خوں قطرہ قطرہ ایک در ہو گیا !  
رفتہ رفتہ چھپتی جاتی ہے لگا ہونے نفا جیسے جیسے لڑ چھٹتا ہے ترے رُحسا کا  
(۴) تکریرِ متانف :- اس صنعت میں لفظ تو وہی ہوتا ہے مگر اس کی تکرار سے معنی میں کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ان میں جو الفاظ کے ٹکڑے آتے ہیں ان کے درمیان وقفہ ہوتا ہے۔

چل پھر کے تہم نے رنگ چمن کا بڑھا دیا غنچے کو بھول بھول کو گلشن بنا دیا  
نازک خیال ہوں یہ ہے سا قیا خیال پینے کو بھول بھول سا پیا چاہیے  
۴۔ استنباغ یا متالبع :- اصطلاح میں بات نکالنے کو کہتے ہیں۔ یعنی شعر میں الفاظ اس طرح لائے جائیں کہ ایک لفظ کی متابعت میں دوسرا لفظ آئے۔

دو بالا رنگ ہستی ہو گیا رنگینی نے سے کہ میں سا غربگت ہوں اور سا غزل بدماں ہے  
آپ چھو دیکھیں کسی غنچے کو اپنے ہاتھ سے غنچہ گل ہو جائے گا اور گل چمن ہو جائیگا  
کیا سیر ہے مجھے نکول میں ان کا اور منہ دیکھیں وہ آہ کسی کا

۵۔ رد العجز :- عروضیوں نے ارکان کے اعتبار سے شعر کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر حصہ کا نام بھی دیا ہے جلیل نے ان صنعتوں کے استعمال سے سخن کلام میں اضافہ کیا ہے۔

(۱) رد العجز (علی الصدر) :- جو لفظ صدر میں ہو وہی عجز میں بھی ہو۔

ہیں جو مشہور قاتل عالم دیکھو وہ منہ چھپائے بیٹھے ہیں  
چاہے دنیا عقیقی چاہے ہے جو تجھے چاہے اُسے کیا چاہے

(۲) رد العجز (علی الابدال) :- عجز میں جو لفظ ہو وہی ابتدائی میں ہو۔

سن لو جو کسی روز تو کھل جائے یہ تم پر اتنا ہے کہ نالہ مجھے کرنا نہیں آتا !  
شب کوئی مثال شبِ فرقت نہیں دیکھی دیکھی ہے مگر ایسی مصیبت نہیں دیکھی

(۳)۔ ابتدا کی تکرار صدر میں :

ان کا جلوہ خود فروش و خود بُنا  
ان کا جلوہ ہے دکھانے کیلئے  
وعدہ وہ کر رہے ہیں مگر کُلف دیکھتے  
وعدہ یہ کہہ رہا ہے نہ کرنا دفا مجھے  
دوست کی قدر دوستی کا نباہ  
دوست دشمن کو از کیا جانے  
(۴)۔ حشو کی تکرار ابتدا میں :

راہ طلب میں ایسا خود رفتہ کون ہوگا  
منزل پہ ہم سچ پر منزل کو ڈھونڈتے ہیں  
کائنات زندگی کہتے اسے  
دل ہے جب تک دل میں اسکی یاد ہے  
۱۔ صنعت ترصیح :- اس صنعت میں پہلے مصرع کے الفاظ دوسرے مصرع کے الفاظ  
کے ہموزن ہوتے ہیں۔

عاشقی کیا ہے رہن غم جاناں ہونا  
زندگی کیا ہے قتلِ شبِ حبراں ہونا  
نہیں کُلتی نہیں کُلتی شبِ غم  
نہیں ہوتی نہیں ہوتی سحر آج  
۲۔ صنعت مسماط :- مسماط میں غزل کے مطلع کے سوا دیگر اشعار میں تین یا زیادہ  
ہموزن فقرے قافیہ کی رعایت کے ساتھ لائے جاتے ہیں۔

یہ رات ہے وصل کی مری جاں بھرے ہیں دل میں ہزاروں ایساں  
نہیں نہ نکلے زباں سے ہاں ہاں ارے یہ موقع نہیں نہیں کا  
مبارک اغیار سے تعلق، نئی ہے چاہت نیا عشق  
بلا سے ہم ہو گئے تصدق، تمہیں اب اسکا لال کیا ہے

### صنائع معنوی

یہ صنائع وہ ہیں جن سے کلام کی معنوی جو بیاں واضح ہوتی ہیں۔ ان سے  
نہ صرف ظاہری حُسن پیدا ہوتا ہے بلکہ بلاغت میں بدرجہا اضافہ ہوتا ہے۔ جلیل کے کلام  
میں تقریباً تمام اہم صنائع موجود ہیں۔

۱۔ ایہام :

سُلیخ کراشک نے یہ پھل پایا  
شجر عشق بے ثمر نکلا  
رات بھر آتشِ حسرت سے جلا کرتی ہے  
شمع پر صبر پڑا ہے کسی پر دانے کا

رندوں کے ہاتھ سے نہیں ٹوٹی ہے ساقیا  
نشہ میں چور ہو گئی بوتل شراب کی

۲. حسن تعلیل

کون بیکس غسریق بحر ہوا  
سر پہنکتی ہیں موجیں ساحل پر  
الہی آگ برق طور نے کسی لگائی تھی  
نکلنے میں شرار سے آج تک ایک ایک پتھر سے  
یہ کون زیر زمین اسکو گدگداتا ہے  
کہ مسکراتی ہوئی ہر کلی نیکلتی ہے

۳. صنعت تضاد

(۱). انغال کا تضاد

بہار ایک دم کی ہے کھلتا نہیں کچھ  
یہ گلی کھل رہی ہے ہیں کہ مڑھا رہے ہیں  
جز بیخودی گزر نہیں کوئے حبیب میں  
گم ہو گیا جو ہیں تو ملا راستا مجھ  
وہ اٹھے، درد اٹھا، حشر اٹھا  
مگر دل ہے کہ بیٹھا جا رہا ہے

(۲). اسایا حروف کا تضاد

نہ اشارہ نہ کنایہ نہ تبسم نہ کلام  
پاس بیٹھے ہیں مگر دور نظر آتے ہیں  
بچن سے اس کی آنکھ میں شوخی ہلا کی ہے  
بجلی میں اتنا سے ترپ اتنا کی ہے  
دام و قفس کی یاد نہیں چھوڑتی، ہمیں  
آزاد ہو کے اور گرفتار ہو گئے

(۳). حرف نفی کے ساتھ جڑا ہوا تضاد

پلا ساتی بہار آئے نہ آئے  
گھٹایہ بار بار آئے نہ آئے  
یا خدا دردِ محبت میں اثر ہے کہ نہیں  
جس پہ مڑتا ہوں اُسے میری خبر ہے کہ نہیں  
ہمت دشوار ہے عشوق کا ہموار ہو جانا  
وہ ملتے ہیں مگر ملتے نہیں ان کی نظر برسوں

(۴). ایک ہی شعر میں دہرائضاد

خوشی x غم  
خوشی کی روشنی میں بھی سوادِ غم نمایاں ہے  
مری صبح x شام  
مری صبح و ظن پروردہ شامِ غریباں ہے  
بہار x خزاں  
بہار جو دھل تو کھٹکا رہا حیرانی کا  
مری بہار میں عالمِ خزاں کا رہتا ہے  
بلطف x عقاب  
بلطف و رحمت x عذاب

نگاہِ لطف اگر ہے تو کچھ عتاب بھی ہے

تری ادا مجھے رحمت بھی ہے عذاب بھی ہے

۴. لف و نشر مرتب

میں سمجھتا ہوں کہ میں جنت و دوزخ کیا چیز

ایک ہے وصلِ ترا ایک ہے فرقتِ تیری

سِر و دگل سے چمن ہے میخانہ

کوئی مینا تھا کوئی ساعیہ تھا

میں نے پھولوں کو بھی دیکھا باغ میں کانٹوں کو بھی

ناز میں تیری طرح ہیں نازاں میری طرح

۵. مراعات النظر

جلوۂ یار سے چمکی ہے جو قسمت اُسکی

آئینہ کو ہے یہ دعویٰ کہ سکندر ہوں میں

تم خا جان کے ملتے ہو اسے ہاتھوں میں

رنگ لائے نہ کہیں خونِ تمنا میرا

بوٹا سا قد ہے پھول سا رخ غنچہ سادہ

جس گھر میں وہ گئے اسے گلزار کر دیا

۶. عکس

مزے بے تاب یوں کے آرہے ہیں

وہ ہم کو ہم اٹھیں سمجھا رہے ہیں

دل نے تو اضطراب میں چھوڑا ہمارا ساتھ

چھوڑا نہ دل کا ساتھ مگر اضطراب نے

جلیل الطاف شاہانہ کی ہے تفسیر میری صراحت

مقدر پر ہوں میں نازاں مقدر مجھ پر نازاں ہے

## عروضی تجزیہ

ادبی تنقید میں فن عروض کو عام طور پر نظر انداز کیا جاتا رہا ہے کیوں کہ اس فن میں اتنی نزاکتیں ہیں کہ اس پر آسانی سے عبور حاصل نہیں کیا جاسکتا اس طرح مواد تنقید پر عروضی گرفت کی بات دور جا پڑتی ہے اس کے علاوہ اس خیال کی آبیاری بھی مدتوں تک ہوتی رہی کہ شاعر کے لیے سوزوں طبع ہونا کافی ہے اور عروضیات سے واقفیت ضروری نہیں لیکن دورِ حاضر کی تنقید میں ایک خوشگوار رجحان عام ہو رہا ہے۔ یہ رجحان کسی شاعر کے فکر و فن پر تنقید کے سلسلے میں اس کے عروضی پہلو کا بھی جائزہ لینے کا رجحان ہے جیسا کہ پر د قیصر عنوانِ چشتی کی تحریر ذیل سے ظاہر ہوتا ہے۔

”اس دور میں اُردو کے بعض ادیبوں اور نقادوں نے عروضی تجزیے پیش کر کے عروضی تنقید کی سمت وجہت سے آشنا کیا ہے۔ اس سلسلے میں علامہ اقبال پر پروفیسر گیان چند جین کا عروضی تجزیہ اور شمس الرحمن فاروقی کا مقالہ اقبال کا عروضی نظام قابل ذکر ہیں۔ غالب کے کلام کے عروضی تجزیوں میں ڈاکٹر مغیث الدین فریدی سید مبارک علی اور کنول کرشن بالی نے خاصے تجربے کئے ہیں۔ اگرچہ یہ مختصر ہیں مگر اس سمت میں پیش رفت کی نوید سناتے ہیں۔ غالب کے کلام کا سب سے زیادہ تفصیلی عروضی تجزیہ صغریٰ بیگم نے کیا ہے۔“ لہ

غالب  
ڈاکٹر عنوانِ چشتی نے خود اپنی تصنیف ”عروضی اور فنی مسائل“ میں دیوانِ

اور اصغر کی شاعری کا عروضی تجزیہ کر کے اس نئی تنقیدی روایت کو آگے بڑھایا ہے  
پروفیسر مغنی تبسم نے اپنی کتاب ”فانی بدایونی“ میں جہاں فانی کے کلام کا صوتیاتی تجزیہ  
کیا ہے وہیں کلام فانی کے عروضی پہلو پر بھی نظر ڈالی ہے۔ عروضی اقدار کے اس  
نشاۃ ثانیہ کو نظر میں رکھتے ہوئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کلام جلیل پر تنقید کے  
سلسلے میں اس پہلو پر بھی غائر نظر ڈالی جائے۔

علم عروض میں فن شاعری کا مطالعہ جس مخصوص طرز سے ہوتا ہے وہ صوتی  
تنظیم کا طرز ہے کیوں کہ اس کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری زبان میں  
آدازوں کی ادائیگی کن اصولوں کی پابند ہے۔ عروضیوں نے چھوٹی بڑی آدازوں  
کی ترتیب اور آہنگ کو ظاہر کرنے کے لیے کچھ الفاظ وضع کئے ہیں جو اشعار کی  
آدازوں کی ترتیب کی تمام ممکنہ صورتوں کو مقرر کردہ مستقل علامتوں کے ذریعہ  
ظاہر کرتے ہیں۔ انھیں ارکان یا افاعیل کہتے ہیں۔ یہ ارکان عشرہ تعداد میں ۱۰ ہیں۔  
فعول۔ فاعلن۔ فاعلاتن۔ فاع لان۔ مفاعیلن۔ متفعلن۔ مفاعلتن۔  
مستفعلن۔ مفعولن۔ مفعولات۔

ان افاعیل کی الٹ پھیر اور آپس کے جوڑ توڑ سے جو وزن بنتے ہیں ان کی مقررہ ترتیب  
کا نام بحر ہے۔ اردو میں (۱۲) بحریں مروج و مقبول ہیں۔ ان میں سے جلیل نے حسب  
ذیل بحروں کا استعمال کیا ہے۔

مفرد بحر

(۱)۔ بحر رمل (۲)۔ بحر متقارب (۳)۔ بحر ہزج (۴)۔ بحر رجز

مرکب بحر

(۵)۔ مفاعیلن (۶)۔ مجتث (۷)۔ خفیف (۸)۔ سرلیح (۹)۔ سرسج۔

جلیل کی غزلیہ شاعری کا سرمایہ تین ضخیم دیوان ہیں

(۱)۔ تاج سخن۔ غزلوں کی تعداد : ۳۱۲ تعداد اشعار : ۵۱۲۷

(۲)۔ جان سخن۔ غزلوں کی تعداد : ۲۲۲ تعداد اشعار : ۲۸۱۵

(۳)۔ روح سخن۔ غزلوں کی تعداد : ۲۴۴ تعداد اشعار : ۲۸۹۳

جلیل کے سلام کا عرضی تجزیہ ان تینوں دوا دین پر مشتمل ہے۔ ذیل میں تینوں دواؤں کی غزلوں کا مجموعی عرضی تجزیہ اس کی مزاحف، بحروں کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔ جدول کی ترتیب میں زیادہ استعمال کی ہوئی بحروں کو پہلی جگہ دی گئی ہے۔

شمار	اوزان و بحر	غزلوں کی تعداد			
		تاج سخن	جان سخن	روح سخن	جملہ
۱۔	بحر رمل (مزاحف بحروں کے ساتھ)				
	(۱)۔ فاعلاتن فعلاتن فعلن	۵۶	۱۰۶	۲۵	۲۰۷
	(۲)۔ فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن	۳۳	۱۱	۱۶	۶۰
	(۳)۔ فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن	۲	۱	۱۷	۳۸
	(۴)۔ فاعلاتن فعلاتن فعلن	۸	-	۸	۱۶
۲۔	بحر ہزج (مزاحف بحروں کے ساتھ)				
	(۱)۔ مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن	۳۸	۱۰	۲۹	۸۷
	(۲)۔ مفعول مفاعیل مفاعیل مفعولن	۱۶	۶	۱۳	۳۵
	(۳)۔ مفاعیلن مفاعیلن مفعولن	۱۴	-	۹	۲۳
	(۴)۔ مفعول مفاعیل مفعولن	۳	۱	۱	۵
	(۵)۔ مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن	۱	۱	۲	۴
	(۶)۔ فاعلاتن مفاعیلن فاعلاتن مفاعیلن	-	-	۱	۱
۳۔	بحر مضارع (مزاحف بحروں کے ساتھ)				
	(۱)۔ مفعول فاعلات مفاعیل فاعلاتن	۵۷	۳۷	۳۸	۱۳۲
	(۲)۔ مفعول فاعلاتن مفعول فاعلاتن	۱	۱	-	۲
۴۔	بحر مجتث ۱				
	(۱)۔ مفاعیلن فعلاتن مفاعیلن فعلن	۳	۲۹	۲۱	۷۹

تاج سخن	جاسن	روح سخن	جملہ
۱۷	۱۸	۲۶	۶۱
۷	۷	۹	۱۸
۲	-	۳	۵
۲	-	۳	۵
-	-	۲	۲
-	-	۱	۱
-	-	۱	۱
-	-	۱	۱

بحر خفیف .

(۱). فاعلاتن مفاعیلن فعلن

بحر متقارب (مراحف بحروں کے سا)

(۱). فعلن فعلن فعلن فعلن

(۲). فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن

(۳). فعلن فعلن فعلن فعلن

بحر مشرح

(۱). مفتعلن فاعلات مفتعلن فاعلات

بحر رجز

(۱). مفتعلن فاعلن مفتعلن فاعلن

بحر سرح

(۱). مفتعلن مفتعلن فاعلن

بحر کابل

(۱). متفاعلن متفاعلن متفاعلن متفاعلن

## مجموعی عروضی تجزیہ

سطور بالا میں جلیل کے تینوں دواوین جن کا تعلق جلیل کی شاعری کے تین

ادوار سے ہے عروضی تجزیہ پیش کیا جا چکا ہے۔

اس تجزیہ کی بناء پر ایک جدول پیش کیا جاتا ہے جس سے بیک نظر ذیل

کی باتوں کی دھات ہو جاتی ہے۔

(۱). بحر کا نام

(۲). ہر بحر کے سامنے تعداد غزل اور تعداد اشعار درج ہے جس سے

اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شاعر نے تخلیقی عمل میں اپنے شعری تجربات کی نقش گری

کے لیے کون سا وزن زیادہ اور کون سا کم استعمال کیا ہے۔

(۳). ہر وزن کے سامنے فیصد بھی درج کر دیا گیا ہے۔

جن دواوین پر تجزیہ منحصر ہے ان کی جملہ غزلوں کی تعداد ۷۸۰ اور جملہ اشعار کی تعداد ۱۱۸۳۶ ہے۔

شمار	نام بحر	تعداد غزل	تعداد اشعار	فیصد
۱	بحر رمل	۳۲	۲۸۵۲	۴۰.۵۰
۲	بحر ہزج	۱۵۵	۲۴۴۷	۲۰.۵۰
۳	بحر مضارع	۱۳۴	۱۹۱۰	۱۶.۵۰
۴	بحر مجتث	۷۹	۱۲۱۵	۱۱.۵۰
۵	بحر خفیف	۶۱	۱۱۰۹	۱۰.۵۰
۶	بحر متقارب	۲۸	۲۵۸	۲.۵۶۲
۷	بحر منسرح	۲	۱۴	-
۸	بحر رجز	۱	۹	-
۹	بحر سریع	۱	۱۲	-
۱۰	بحر کابل	۱	۷	-

اس تحقیقی جائزہ کا حاصل یہ ہے :

۱. یہ عروضی تجزیہ جلیل کی (۷۸۱) غزلوں پر مشتمل ہے۔ جن کے اشعار کی تعداد (۱۱۸۳۶) ہے۔
۲. ایک غزل میں زیادہ سے زیادہ (۲۲) اور کم سے کم (۵) اشعار ہیں۔
۳. جلیل کی غزلیوں تو (۱۰) بحروں کا احاطہ کرتی ہیں لیکن حقیقت میں ان کی غزلوں کا محور صرف (۶) بحر ہیں۔ یہ بحر اردو کی ایسی بحر ہیں جن کا مقامی حجم زیادہ ہے۔ جلیل کی شاعری کے تین ادوار ہیں۔ تینوں ادوار میں یہی (۶) بحر سرفہرست ہیں۔ تیسرے دور میں چار اور بحروں رجز، سریع،

منرج اور کامل کا اضافہ ہو جاتا ہے لیکن ان میں سے کسی میں ایک یا دو سے زیادہ غزلیں نہیں ہیں۔ بحر رمل بہر صورت تینوں ادوار میں پہلے مقام پر ہے البتہ ہنرج جن کو پہلے دور میں دو سرا مقام حاصل تھا دوسرے دور میں چوتھے مقام پر آجاتی ہے۔ اسی طرح پہلے دور میں بحر متقارب میں بھی ہوئی غزلوں کی تعداد دوسرے دور میں گھٹ کر (۱۱) سے (۲) ہو جاتی ہے لیکن تیسرے دور میں اس کی تعداد پہلے دور سے بھی بڑھ کر (۱۳) ہو جاتی ہے۔

تیسرے دور میں پہلے دور کا اعادہ ہوتا ہے اور بحروں کی وہی ترتیب بھر قائم ہو جاتی ہے۔ مجموعی طور پر یہ ترتیب یوں ہوگی۔ غزلوں کی تعداد قوسین میں درج کر دی گئی ہے۔

(۷۹)

۱. رمل (۳۲۱) ۲. ہنرج (۱۵۵) ۳. مضارع (۱۳۴) ۴. مجتث
۵. خفیف (۶۱) ۶. متقارب (۲۶) ۷. رجز (۲) ۸. منرج (۲)۔
۹. سرلیج (۱) ۱۰. کامل (۱)۔

اس میں رمل کا مقام پہلا ہے۔ اس کی تقریباً نصف تعداد بحر ہنرج کی غزلوں کی ہے اور قریب قریب اتنی ہی غزلیں مضارع میں بھی ہیں۔ ہر غزل کو کا زیادہ کلام بالعموم پہلی (۳) بحروں ہی میں ملتا ہے۔ جلیل کے کلام کا ۸۲ فیصد انہیں بحروں میں ہے۔

۱. بحر رمل۔ مثنیٰ محذوف (مفعول)۔ فاعلاتن فعاتن فعاتن فعاتن۔
۲. بحر ہنرج۔ مثنیٰ سلم۔ فاعلین فاعلین فاعلین فاعلین۔
۳. بحر مضارع۔ مثنیٰ۔ مثنیٰ اخرج کفوف محذوف مفعول فاعلاتن فاعلین۔

۴. جملہ (۲۲) اوزان برتے گئے ہیں جو مختلف بحروں کے اوزان ہیں۔
۵. مبدس اوزان کے مقابل میں مثنیٰ کا استعمال بہت زیادہ ہے۔
۶. عام اردو شاعروں کی طرح مزاحف ارکان کا استعمال جلیل کے پاس بھی زیادہ ہے۔ سالم اور مزاحف ارکان کا اجتماع بھی ملتا ہے۔

۷۔ سالم بحر میں لکھی ہوئی سب سے زیادہ غزلیں بحر ہزج مثنیٰ سالم میں ہیں جنکے ارکان ہیں مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن۔

۸۔ سب سے زیادہ مزاحف اشکال کا استعمال بحر ہزج میں ہوا ہے۔

۹۔ ایک ہی وزن میں لکھی جانے والی سب سے زیادہ غزلیں بحر رمل مثنیٰ محذوف مفعول یعنی فاعلاتن فعاتن فعاتن میں ہیں جو کل اشعار کا ۲۶ فیصد ہیں۔

۱۰۔ شانزدہ رکنی بحر میں صرف پانچ غزلیں ہیں جنکے ارکان ہیں فاعلاتن فعاتن فعاتن فعاتن فعاتن فعاتن۔

### تقابل مطالعہ

ادھر کچھ عرصہ سے تنقید کلام میں عروضی تجزیہ کی جو روایت شروع ہوئی ہے۔ اس میں کئی شاعروں کے کلام کا عروضی تجزیہ سامنے آیا ہے۔ ان کی روشنی میں جلیل کے کلام کا تقابلی مطالعہ جدول کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے:

شاعر کا نام	غزلوں کی تعداد	اشعار کی تعداد	مفعول و بحر کی تعداد	زیادہ مستعمل تین بحر کی ترتیب	ایک ہی وزن میں سب سے زیادہ مستعمل بحر	اوزان کی تعداد
غالب	۲۳۹	۱۳۹۳	۸	رمل، مضارع، ہزج	مضارع مثنیٰ آخری محذوف محذوف مفعول فاعلاتن فعاتن	۱۹
اصغر	۱۲۹	۱۰۶۰	۷	رمل، ہزج، مضارع	مضارع مثنیٰ آخری محذوف محذوف مفعول فاعلاتن فعاتن	۱۴
فانی	۵۲۳	۳۵۰۸	۱۰	رمل، ہزج، مضارع	رمل مثنیٰ محذوف فاعلاتن فعاتن	۲۸
جلیل	۷۸۱	۱۱۸۳۶	۱۰	رمل، ہزج، مضارع	رمل مثنیٰ محذوف مفعول فاعلاتن فعاتن	۲۲

۱۔ پروفیسر عنوان چشتی، عروضی و فی مسائل۔ ص ۷۲، ۹۷۔  
پروفیسر مفتی تبسم فانی بدایونی ص ۳۸۲۔

۱. جلیل کا شعری سرمایہ تینوں شاعروں میں سب سے زیادہ ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جلیل کی غزلیں طویل ہیں۔ دو غزلہ اور سہ غزلہ کی تعداد بھی خاصی ہے۔

۲. جلیل بحروں کے استعمال میں اپنے معاصرین اصغر و فانی سے زیادہ قریب ہیں۔ فانی و جلیل کے یہاں اوزان کا استعمال اصغر و غالب سے کہیں زیادہ

۳. جلیل و فانی نے اپنے سب سے زیادہ پسندیدہ وزن کا انتخاب رمل ہی سے کیا ہے اور اسی میں سب سے زیادہ اشعار کہتے ہیں جو اردو شاعری کی سب سے زیادہ مستعمل بحر ہے۔



# جہیل اور آہنگ شعر

کسی شعر کا آہنگ جس قدر دل آویز ہوگا اسی تناسب سے اس کی قدر و قیمت بڑھ جائے گی اور اس کی تاثیر میں بھی اضافہ ہوگا جب کبھی ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں بحر زور اور روانی کے لیے زیادہ موزوں ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس بحر کا انتخاب بالخصوص غزلیہ شاعری کے لیے بہتر ہوتا ہے جس میں خاص قسم کا صوتی لطیف ملتا ہے اور بحر اور غنائیت پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو نے اپنے آہنگ کی بنیاد عربی و فارسی پر رکھی لیکن ان بحروں کو مسترد کر دیا جو زبان اردو کے مزاج اور موسیقی کے مطابق نہ تھیں، اردو کے بہت سے شاعروں نے موضوع فکر اور ادا زان میں آہنگ قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے کسی شاعر کے مطالعہ کلام میں آہنگ شعر کی تلاش بھی اپنی جگہ بہت اہمیت رکھتی ہے۔

ایک تعریف کے مطابق آہنگ سے مراد صوتی گروہوں کا ایک تسلسل ہے جو انھیں باہم مربوط کرنے والے کسی نفسیاتی اصول کے مطابق تخلیق کیا گیا ہو۔ شری آہنگ دو قسم کا ہوتا ہے۔

## (۱) داخلی آہنگ (۲) خارجی آہنگ

داخلی آہنگ میں جذبہ خیال کا آہنگ شامل ہے۔ خارجی آہنگ میں حروف کی غنائی لفظء تراکیب اور بحر و وزن کا آہنگ داخل ہے۔ شعر کی ہیئت میں چونکہ اصوات کو بنیاد مقام حاصل ہے اس لیے ظاہر ہے کہ شعر کا خارجی آہنگ اصوات کی مخصوص ترتیب سے تشکیل پاتا ہے۔ شاعر اصوات کے ان مجموعوں یعنی الفاظ و تراکیب کے ذریعہ اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ شاعری اپنی جڑیں زبان ہی میں کھتی ہے۔ شاعری اور زبان کا یہ وہ رشتہ ہے کہ میں کسی شاعر کے کلام کے صوتی آہنگ کے مطالعہ کی طرف مائل کرتا ہے۔

حروف و الفاظ کے ذریعہ ادا کی جانے والی آوازوں سے پیدا ہونے والے

آہنگ کا تجربہ انفرادی طور پر لفظ میں چھوٹے اور لائبے مصوتوں کی تعداد اور لفظوں میں مصوتوں کی نوعیت پر ہوتا ہے۔ دیگر زبانوں کی طرح اردو زبان کا نظام اصوات بھی درجہ پر مشتمل ہے۔

### (۱)۔ مصوتے (۲)۔ مصوتے

آہنگ کی تشکیل کا تعلق راست مصوتوں سے ہے۔ اردو زبان کے مصوتے دس ہیں۔ ان میں تین چھوٹے اور سات لائبے مصوتے ہیں۔ چھوٹے مصوتوں میں زیر، زبر اور پیش ہیں۔ لائبے مصوتوں میں ی، و اور الف ہیں۔ شاعر بحر کی مناسبت سے موزوں مقام پر لمبے اور چھوٹے مصوتوں کے استعمال سے اپنا لہجہ بناتا ہے۔ بحر کے اجزائے ترکیبی میں مصوتوں کا انتخاب اور مصوتوں کی ترتیب دونوں داخل ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہر بحر اور اس کے ہر وزن کا ایک مخصوص آہنگ ہوتا ہے جو چھوٹے اور لائبے مصوتوں کے باہمی تناسب ان کی تنظیم اور درمیانی وقفوں میں کیب پاتا ہے !

صوتیاتی نقطہ نظر سے اردو بحر کا آہنگ ان چار اجزاء پر مشتمل ہوتا ہے۔

۱۔ لائبے مصوتوں کی زیادہ سے زیادہ گنجائش

۲۔ چھوٹے مصوتوں کی کم سے کم تعداد

۳۔ چھوٹے اور لائبے مصوتوں کی ترتیب

۴۔ مصوتوں اور مصمتوں کا تناسب۔

شاعر کسی بحر کا استعمال کرتے ہوئے لمبے مصوتوں کی جگہ چھوٹے مصوتے لا سکتا ہے۔ ایسی صورت میں جتنے لمبے مصوتے کم ہوں گے مصمتوں کی تعداد اتنی ہی بڑھتی جائے گی۔ لیکن مصوتوں اور مصمتوں کی مجموعی تعداد بحر فراہم کردہ گنجائش سے آگے نہیں بڑھ سکے گی۔

ہر وزن کی ایک صوتی مقدار ہوتی ہے کسی وزن کی صوتی مقدار کو ناپنے کی

امائی اگر چھوٹا مصوٹہ قرار دیا جائے اور اس کی مقدار ۱ فرض کی جائے تو لائبے مصوٹے کی مقدار ۲ ہوگی۔ مثلاً ہندی والوں کے یہاں چھوٹے مصوٹوں کا علامتی اظہار کھڑی ماترائی کے ذریعہ کرتے ہیں۔ لائبے مصوٹے جن کو وہ گرد کہتے ہیں ان کے لئے علامتی اظہار اختیار کرتے ہیں۔

ان علامتوں کو استعمال کر کے رکن مستعلن کا تجزیہ کیا جائے تو مصوٹوں کی مقدار یوں ہوگی۔

مستعلن (س نفع ع لن) = S I S S

مفاعیلن (م فاع لن) = S I S I

اس اصول سے بحر متقارب مشتمل سالم کا صوتی تجزیہ یوں ہوگا۔

فعلون فعلون فعلون = S S I S S I S S I

لاببے مصوٹے = ۸، چھوٹے مصوٹے = ۲

۸ لائبے مصوٹوں کی صوتی مقدار ۱۶ ہوگی، اس میں چھوٹے مصوٹوں کی صوتی

مقدار ۴ کو جمع کر لیا جائے تو مصرع کی صوتی مقدار ۱۶ + ۲ = ۲۰ ہوگی۔ پورے شعر کے سالم وزن کی مقدار ۱۰ + ۲ = ۲۰ ہوگی۔

بالعموم شاعری کو مطالعہ کی چیز سمجھا جاتا ہے اس لیے شعر کے نظری مطالعہ سے

بعض ایسی خوبیاں بالخصوص اس کا آہنگ اور نغمگی نظر انداز ہو جاتی ہیں جن کو سن کر ہی لطف اُٹھایا جاسکتا ہے۔ اس پہلو کو نظر میں رکھتے ہوئے آج کل تنقید میں علم صوتیات سے مناسب مدد لی جا رہی ہے اور شعر کے صوتی اور سماعی پہلو پر زور دیا جا رہا ہے۔

مطلب یہ کہ شاعری کا مطالعہ صرف موضوع اور مفہوم تک محدود نہ رہے بلکہ ہیئت و آہنگ کا بھی جائزہ لیا جائے۔

اس پس منظر میں جلیل کے آہنگ شعر میں بحرین کے انتخاب اور استعمال کا

جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ اس مقصد کے لیے جلیل کے کثیر الاستعمال اوزان کی غزلوں کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ ان مثالوں سے یہ اندازہ لگایا جاسکے گا کہ جلیل نے مختلف اوزان اور بحر میں اپنا اسلوب کس طرح سمویا ہے لیکن مثالوں کے مطالعہ سے پہلے

اس بات کو ذہن نشین رکھنا ہوگا کہ ہر اذن لائے مصوتوں کی ایک معین گنجائش فراہم کرتا ہے۔ اس گنجائش سے جتنا زیادہ استفادہ کیا جائے گا شعر میں اسی قدر روانی آئے گی اور آہنگ پیدا ہوگا۔

جلیل کی نظر چونکہ صفائی بیان اور روانی پر زیادہ ہوتی ہے اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے کلام میں لائے مصوتوں کا تناسب زیادہ ہوتا ہے۔ الفاظ کے انتخاب اور جملوں کی ساخت سے وہ یہ مقصد حاصل کرتے ہیں۔ بول چال کی سادہ زبان، روزمرہ کا استعمال اور مضرد جملے استعمال کئے جاتے تو لائے مصوتوں کا تناسب بڑھ جاتا ہے۔ اور جلیل صوتی رمز کے اس فن سے اچھی طرح واقف ہیں۔

اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ فکری شاعری میں جہاں شاعر موضوع اور خیال کو اہمیت دیتا ہے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ شعر زیادہ صاف سلیس اور رواں ہو چنانچہ ڈاکٹر مغنی تبسم نے غالب کے کلام میں لائے مصوتوں کا اوسط تناسب دریافت کر کے نتیجہ یہ نکالا ہے کہ اوزان کی فراہم کردہ گنجائش کے مقابلہ میں یہ تناسب بالعموم سطر کے قریب قریب رہتا ہے۔ مثلاً غالب

دل تا جسگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب

اس رہگذر میں حبلۂ گل آگے گر دکھا

اس بحر مضارع (مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن) میں لائے مصوتوں کی فراہم کردہ گنجائش ۱۶ ہے لیکن غالب کے شعر میں صرف ۷ لائے مصوتے ہیں بلکہ برعکس اس کے جلیل کی غزلوں سے جو نمونے پیش کئے جا رہے ہیں ان سے اُن کے اس اسلوب کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ انھوں نے الفاظ کے انتخاب اور جملوں کی ساخت سے کس حد تک استفادہ کیا ہے اور کس طرح اپنے لہجہ کی نرمی اور گداختگی کو فروغ دیا ہے۔ ساتھ ہی اس بات کا بھی انکشاف ہوتا ہے کہ جلیل نے جتنے اوزان استعمال کئے ہیں ان میں لمبے مصوتوں کی فراہم کردہ گنجائش

چھوٹے مصوتوں کی تعداد سے زیادہ ہی ہے۔

## ۱. بحرِ رمل مِشمن محذوف مخمُول

بحرِ رمل کا استعمال جلیل کے پاس سب سے زیادہ ہے۔ اس کی مزاحف

بحرِ مِشمن محذوف مخمُول ان کی پسندیدہ بحر ہے۔ بحرِ رمل سالم کے مقابلہ میں اس محذوف وزن میں ارکان کے اختصار کے سبب درمیانی وقفہ قریب تر اور آہنگ تیز تر ہو جاتا ہے اس بحر کا صوتی تجزیہ مصوتوں کی صورت میں یوں ہوگا۔

بحرِ رمل مِشمن محذوف مخمُول مقطوع

نا علائن فعلائن فعلائن فعلائن

SSIS SSII SSII SSII

لا بنے مصوتے : ۸      چھوٹے مصوتے : ۷

لا بنے مصوتوں کی گنجائش ایک شعر میں : ۱۶

اب دیکھنا یہ ہے کہ جلیل نے اس بحر میں جو اشعار کہے ہیں ان میں لا بنے مصوتوں کی تعداد کس طرح بڑھائی ہے اور اوزان کی صوتی مقدار میں کتنا اضافہ کیا ہے۔

بے پتے چین نہیں ہوش نہیں جان نہیں

۸ = Si IS Si IS Si IS SIS

شوق کا ہے کو مرھن ہے مجھے میخواری کا

۸ = SSSS II S II I SS IS

لا بنے مصوتے : ۱۶

صبر آئے کہ وہ آئیں کہ قیامت آئے

۷ = SS ISI I SS I I SS II

لاگھتا ہوں میں شبِ ہجر دُعائیں کیا کیا

۸ = SS SSI II SI I S SIS

لا بنے مصوتے : ۱۵

- ماشقی کیا ہے رہیں غم جاناں ہونا  
 ۹ = SS SS // SSI I S S/S  
 زندگی کیا ہے تفتیل شب بھراں ہونا  
 ۷ = SS SI // SSI I S S/I  
 ۱۶ = لائے مصوتے

## ۲. بحر مضارع مثنیٰ ا خرب مکفوف

دوسرے نمبر پر سب سے زیادہ غزلیں بحر مضارع میں ہیں۔ یہ وزن چونکہ لائے مصوتے سے شروع ہوتا ہے اور اس میں وقف بہت کم پایا جاتا ہے۔ اس لیے وزن کے آہنگ میں سرعت اور تسلسل پایا جاتا ہے۔ اس بحر کا صوتی تجزیہ یہ ہے۔

مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن

SSS ISSI S/S S/S

یعنی اس وزن کے ایک مصرع میں ۸ لائے مصوتے اور شعریں ۱۶ لائے مصوتے لائے جاسکتے ہیں۔ اب یہ شاعر کی صلاحیت پر ہے کہ وہ الفاظ کی ترتیب سے مصوتوں کی تعداد بڑھائے۔ یہاں دیکھنا یہ ہے کہ جلیں لائے مصوتوں کے اندراج میں کتنے کامیاب ہیں۔

جوش بہار و بادہ ہے مستوں کا شور ہے

۷ = S S I S I / S S S/S

توبہ پکارتی ہے الہی بچا مجھے

۸ = SI SI SSI / S/SI SS

لائے مصوتوں کی تعداد = ۱۵

اس شعر میں لائے مصوتوں کی انتہائی گنجائش ۱۶ مصوتوں کی ہے۔ جس میں

جلیں نے پہلے مصرع میں ۷ اور دوسرے مصرع میں ۸ لائے مصوتے استعمال کر کے ان کی تعداد ۱۳ تک پہنچا دی ہے۔

آنکھوں میں کون آ کے الٹی نکل گیا

۷: SS / SS / SS / SS / SS

کس کی تلاش میں مرے اٹک رواں چلے

۶: SS / SS / SS / SS / SS

۱۳: لائے مصوتوں کی تعداد

### ۳۔ بحر ہزج مثنوی سالم

زیادہ استعمال کے اعتبار سے جلیل کے یہاں بحر ہزج تنیسرے نمبر پر ہے۔ یہ وزن بھی بہت زیادہ وزن کا حامل ہے غنائی اور ہلکے لمبے میں نادر احسانا و خیالات کے لیے بہت موزوں و مناسب ہے۔ لائے مصوتوں کی گنجائش آہنگ کو بلند کرتی ہے۔

مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

۱۲: لائے مصوتے SS / SS / SS / SS / SS

یعنی ایک مصرع میں ۱۲ لائے مصوتوں اور پورے شعر میں ۲۲ لائے مصوتوں کی گنجائش ہے۔ ذیل کی مثالوں سے ظاہر ہوگا کہ جلیل نے اس بحر و وزن سے مکمل طور سے فائدہ اٹھایا ہے۔

سجود آستانِ یار سے سیری نہیں ہوتی

۱۲: SS / SS / SS / SS / SS

کئے جاتے جسبیں سائی اگر باقی جسبیں ہوتی

۱۱: SS / SS / SS / SS / SS

۲۳: لائے مصوتوں کی تعداد

اس بحر ہزج میں بھی جس میں ۱۲ لائے مصوتوں کی گنجائش ایک شعر میں ۲۲ ہے۔

جلیل نے پہلے مصرع میں ۱۲ اور دوسرے مصرع میں ۱۱ لائے مصوتوں سے استفادہ کر کے ان کی تعداد ۲۳ تک پہنچا دی ہے۔

نرمانا دیکھتا ہے سوئے گردوں اک تماشا ہے

10: S S S I I S I S S S S S I

ہلال عید کیا ہے چاک ہے میرے گریبان کا

11: S S S I S S S I S S S S S I

۲۲ = لے  
لے ۲۲ = مصوتوں کی تعداد

۱۷ اسی بحر میں جس میں لائے مصوتوں کی گنجائش (۲۲) ہے ڈاکٹر مغنی تبسم نے فانی کے کلام کا صوتی تجزیہ کرتے ہوئے یہ بتاتے کے لیے کہ بحر کا آہنگ شاعر کے لب لہجہ اور انتخاب پر کس طرح اثر ڈالتا ہے مختلف اساتذہ سخن کے چند ہم زمین اشعار کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے اور اس کا تجزیہ یوں کیا ہے۔

ناستخ	مرا سینہ ہے مشرق آفتاب، داغِ ہجرال کا	۱۸: لائے مصوتے
	طلوع صلیح محشر چاک ہے میرے گریبان کا	
آتش	بجھاتا ہے نہایت دل کو خط رخسار جاناں کا	۱۹: لائے مصوتے
	گھسیٹے گا مجھے کانٹوں میں سبزہ اس گلستاں کا	
غالب	ستائش مگر ہے زاہد اس قدح جس باغِ رضواں کا	۲۰: لائے مصوتے
	وہ اک گلہ ستہ ہے ہم بخود دل سے طاقِ نسیم کا	
ایمر	ہنیں سودا فقط یوسف کو اس کے دورِ دامان کا	۲۱: لائے مصوتے
	گدا اور بس بھی ہے کوچہ چاک گریبان کا	

(فانی بدایونی ص ۳۷۸)

نوٹ :-

اس تقابلی مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ دیگر اساتذہ سخن کے مقابلہ میں سب سے زیادہ لائے مصوتے جلیق نے استعمال کئے ہیں۔

## ۴. بحر مجتث مثنیٰ مخبون محذوف :

اس بحر میں جلیل کی غزلوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ اس وزن کی ابتدا دیکھ لےجے سے ہوتی ہے۔ اس کا آہنگ بھی بڑا متوازن اور بہک رو ہے۔

بحر مفاعیل کی طرح اس بحر میں بھی ایک شعر (۱۶) لائے مصوتوں کی گنجائش رکھتا ہے۔ جلیل نے اپنی دیگر پسندیدہ بحروں کی طرح اس بحر کو بھی الفاظ کے انتخاب اور ترتیب سے رواں دواں بنا دیا ہے۔ لائے مصوتوں سے پورا استفادہ کیا ہے

بلا کا زور تھا تیری شراب میں ساقی

۸ = SS S ISI SS IIS I SI

غور توڑ دیا جس نے پار سائی کا

۷ : S SSIS II SI IS ISI

لائے مصوتوں کی تعداد = ۱۵

یہ حُسن کی نہیں جا دو گری تو پھر کیا ہے

۶ : SS I I SI SS II S III

۷ : کہ تیری آنکھ میں شوخی بھی ہے عذاب بھی ہے

SIISI S I SS I IS ISI

لائے مصوتوں کی تعداد = ۱۳

## ۵. بحر مزج مسدس اخرب مقبوض محذوف

مسدس بحر میں بھی جلیل نے اپنی روایت کو قائم رکھتے ہیں۔ یہ بحر شش گونی ہونے کے باوجود لائے مصوتوں کی اچھی تعداد رکھتی ہے جیسا کہ ذیل کے ارکان سے ظاہر ہوتا ہے۔

مفعول مفاعیل فاعول

۶ : لائے مصوتہ SS I SISI ISS

یعنی ایک مصرع میں (۶) لائے مصوتے اور پورے شعر میں (۱۲) لائے مصوتوں کی گنجائش ہے۔ ذیل کے اشعار سے ظاہر ہوگا کہ جلیل نے اس

بحر دوزن سے کتنا فائدہ اٹھایا ہے۔

او آنکھ چرا کے جانے والے

۷ : SS SS ISI IS S

ہم بھی کھتے کبھی تیری نظر میں

۲ : S II SI SI I SI

لائے مصوتوں کی تعداد : ۱۱

اتنا بھی نہ ہو کوئی حیا دار

۵ : IS SI SI S I I SI

دیکھا تو سما گئے نظریں

۵ : S II SI SI I SS

لائے مصوتوں کی تعداد : ۱۰

مندرجہ بالا مثالیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ جلیں نے اپنے اشعار

میں غنائت، روانی اور چستی قائم کرنے کے لیے کثیر الاستعمال اوزان والی جملوں

کو پیش نظر رکھا ہے اور اس میں اپنا اسلوب اس طرح سمویا ہے کہ لائے مصوتوں کی

ممکنہ گنجائش سے پورا پورا استفادہ ہوا۔ جلیں نے الفاظ کے انتخاب اور جملوں کی

ساخت سے یہ مقصد حاصل کیا ہے۔ بول چال کی سادہ زبان، روزمرہ اور مفرد

جملوں کے استعمال سے لائے مصوتوں کی تعداد کو بڑھایا ہے۔ یعنی ۶ گنجائش

کے مقابلہ میں ۱۵ اور ۲۲ کے مقابلہ میں زیادہ سے زیادہ ۲۳ لائے مصوتوں کے

حصول میں کامیاب رہے ہیں۔

## رویف و قوانی کا آہنگ

بحر دوزن کے آہنگ کے تعلق سے بالائی سطروں میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ

ہر بحر کا ایک صوتی آہنگ ہوتا ہے جو ارکان کی تکرار سے تشکیل پاتا ہے اور اردو

میں بہت سی بحریں ایسی ہیں مثلاً رمل، ہزج، مضارع جن میں اس کی گنجائش

ہوتی ہے کہ مصوتے، مصمتوں سے زیادہ لائے جائیں اور لائے مصوتوں کا تناسب چھوٹے مصوتوں سے زیادہ ہو۔

بحر کے بعد آہنگ کے بہاؤ کو تیز کرنے میں قوافی اور ردیف بھی بہت اہم حصہ لیتے ہیں۔ شعر کا مجموعی تاثر بڑی حد تک ردیف و قوافی کے بار بار دہرائے جانے والے اصوات پر ہوتا ہے۔ غزل کے قوافی و ردیف بحر میں مصوتوں اور مصمتوں کی گنجائش فراہم کر کے صوتی آہنگ میں اضافہ کرتے ہیں اور الفاظ کے انتخاب میں شاعر کے رہنما بھی ہوتے ہیں۔ غزل میں ردیف کی حیثیت حرف آخر کی ہوتی ہے چنانچہ ایسی ردیفوں میں جولاہے مصوتوں پر ختم ہوتی ہیں آہنگ زیادہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر جلیل کی حسب ذیل ردیفیں دیکھئے جن میں انھوں نے ردیف و قوافی کے صوتی آہنگ کو زیادہ پیش نظر رکھا ہے۔ ردیف و قوافی مل کر تین اور چار لائے مصوتے فراہم کرتے ہیں۔

ہمارا دل وہ گل ہے جس کو زلف یار میں دیکھا

جو زلفیں ہو گئیں برہم گلے کے ہار میں دیکھا

جامِ جب تک نہ چلے ہم نہیں ملتے والے

آج ساقی ترے نقرے نہیں چلتے والے

شب وعدہ عذرِ جا ہو رہا ہے

وہاں آج خونِ دہلا ہو رہا ہے

ردیف و قوافی کے تال میل کا کچھ ایسا ہی مظاہرہ ان غزلوں میں بھی نظر آتا ہے جن کے اشعار میں زیادہ قافیہ مصوتوں اور مصمتوں کے نمونے پر ملتے ہیں غزل چونکہ ایسی ردیفوں کی زیادہ متحمل نہیں ہوتی اس لیے اساتذہ سخن نے اسے دواوین کی ردیف کی غزلوں تک محدود رکھا ہے۔ اسما کے مقابلہ میں افعال بہت سے اعمال کے ساتھ جوڑے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ ان افعال میں جلیل کے یہاں مصوتوں اور

مصمتوں کا اندراج اختتامی صورت میں کچھ اس طرح ملتا ہے۔  
دستِ نازک سے وہاں خنجر نکل کر رہ گیا  
ابجِ مشتاقِ شہادت ہاتھ مل کر رہ گیا

بن ٹھن کے سامنے سے جو قاتل نکل گیا  
 سینے سے میری آئی صدا دل نکل گیا

داغِ دل کی تازگی کہتی ہے یار آنے کو ہے  
ہو گیا سرسبز ویرانہ ہمارا آنے کو ہے

ان مثالوں میں اسما خنجر، قاتل، اور یار کو رہ گیا نکل گیا ہے ادا آنے کو ہے  
 وغیرہ افعال کے ساتھ جوڑا گیا ہے۔

بعض جگہ طویل ردیفیں بھی آہنگ کی تکرار میں مدد دیتی ہیں۔ جلیل کی کئی ایک  
 ایسی غزلیں اسی وصف کے باعث بہت مقبول و مشہور ہیں۔ یہ ردیفیں دو سے لیکر پانچ  
 لفظوں تک ہیں۔

جو دل کو کھو چکے ہیں وہ دل کو ڈھونڈتے ہیں  
ہم دل سے تنگ آکر قاتل کو ڈھونڈتے ہیں

مجت رنگ دیکھتی ہے جب دلِ دل سے ملتا ہے  
مگر شکل تو یہ ہے دل بڑی شکل سے ملتا ہے

بنی ہے جان پہ جانے کی تم نے خوب کبھی  
مرا یہ حال بھر آنے کی تم نے خوب کبھی

مشتاق بحرِ دل میں بعض مزاحفِ بحرِ یہی بھی ہیں کہ ان کے مصوٰتوں کے مختلف

ترا سب لہو مجھے بخود بنا جاتا تو کیا ہوتا  
جگر میں دل میں آنکھوں میں سما جاتا تو کیا ہوتا

دل گیا دل لگی نہیں جاتی روتے روتے ہشی نہیں جاتی

تافیوں کے متوازی استعمال کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ مصرعوں کے ابتدائی الفاظ ہم قافیہ ہوں کہیں ان کا آواز لاجے مصوتے سے ہوتا ہے اور کہیں مصمتہ اور مصوتہ کے میل کے ساتھ۔ جیسا کہ ذیل کے شعروں سے ظاہر ہوتا ہے۔

نام رکھنے کیلئے رکھتے ہیں خنجر معشوق کالم کرنے کیلئے تیغ ادا ہوتی ہے  
یہ سادگی ہے کہ زینت کا انکو ہوش نہیں یہ نازکی ہے کہ رنگ حنا بھی بار ہوا  
عاشقی کیا ہے؟ رہیں غم جاناں ہونا زندگی کیا ہے؟ قاتل شبِ بھراں ہونا  
مرے داغوں کے جلنے سے سبق لیتا ہے پروان مرے نالوں سے بلبل سیکھے فریاد آتی ہے  
اکثر مقامات پر جلیں نے یہ انتظام بھی کیا ہے کہ قوافی کی جگہ ہوزن الفاظ یا ٹکڑے رکھے ہیں۔ اس طرح اصوات کا تکرار میں تنوع بھی پیدا ہوا ہے اور آہنگ بھی۔  
ایک پریاں نے کیا خون ہمارے دل کا ایک قطرے نے ڈلوایا ہمیں دریا ہو کر  
تمہاری شکلِ صورتِ آنکھ میں گھر کرتی جاتی ہے تمہارے خال و عارض آنکھ کا تل ہوتے جاتے ہیں  
پھول ہو کر سرے اشارے بٹے یاروں میں داغ بن کر مرا مضمون دل دشمن میں رہا  
آہنگ شعر کے قیام کے لیے اندرونی قافیوں کی تنظیم سے بھی مدد لی جاتی ہے۔

ایسی بحری جن کے سرع دو و نقول میں تقسیم ہو جاتے ہیں اندرونی قافیوں کی تنظیم کے لیے بہت فردری رہی۔ ایسی بحروں میں جلیں نے جو غزلیں کہی ہیں ان کے اکثر شعروں میں سجع سے بھی کام لیا ہے اور سسط سے بھی۔

نہ وہ آئیں کہ راحت ہو نہ موت آئے کہ فرصت ہو

پڑی ہے جاں کشاکش میں نہ غم نیکلے نہ دم نیکلے

ہمیں وہ جان بھی لیں گے، ہمیں پہچان بھی لیں گے

اتر جائے کاسب نشہ، ابھی چڑھتی جوانی ہے

غضب بچن کا وہ زمانا، غضب وہ دلک پند آنا وہ گودیں میری کوٹ جانا چل چل کر حسیں کا

حصول کے اجزائے کلام چھوٹے چھوٹے فقروں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ جلیل نے ان اداں سے بھی کام لیا ہے۔

جاتے ہو خدا حافظ، ہاں اتنی گزارش ہے  
جب یاد ہم آجائیں ملنے کی دُعا کرنا

تمہیں سے روئے (میں معطر تمہیں سے سطح فلک منور  
تمہیں تو ہو پھول یا سمن کا، تمہیں تو ہو پھول چاندنی کا

راہ طلب میں ایسا، خورِ رستہ کون ہو گا  
منزل پہ ہم پہنچ کر، منزل کو ڈھونڈتے ہیں  
ان اشعار میں اجزائے کلام کا چھوٹے چھوٹے فقروں میں تقسیم ہونا اور پھر ردی اور ردیف کی تکرار کا مقررہ صوتی و تقوٰی کے ساتھ واقع ہونا صوتی آہنگ میں لے کے اضافہ کا سبب بنتا ہے۔

جلیل کے یہاں ایک غالب میلان متحرک مصمتوں کے ساتھ مصوتوں کے مسلسل اندراج کا بھی ہے متعدد غزلوں کی ردیف اور قوافی میں تین سے بھی زیادہ لائے مصوتے متحرک مصمتوں کے ساتھ متواتر لائے گئے ہیں۔ جیسا کہ ان مصرعوں سے ظاہر ہوتا ہے:

چشمِ میگوں یہ ہیں زلفوں کی ادائیں کیا کیا

چاں سے فلتہ خوابیدہ بنگانے آئے

غضب ہوتا تری صورت جو بے پردہ کہیں ہوتی

جلیل کی مترنم شاعری کے صوتی آہنگ کی کچھ خصوصیات ردیف و قوافی کے اس خاص تال میل میں بھی نظر آتی ہیں جو تکرار اصوات کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ چنانچہ خاص مثال ردیف و قوافی میں قافیوں کا میل ردیف سے ملاتے ہوئے مصوتوں اور مصمتوں کی تکرار سے خاص آہنگ پیدا کیا ہے۔

ہات ساقی کی نہ ٹالی جائے گی سر کے توہ توڑ ڈالی جائے گی

## اصوات کی تکرار

شعری خارجی موسیقی یا غنائیت اصوات کی مخصوص ترتیب سے تشکیل پاتی ہے چنانچہ جلیں کی شاعری کے لہجے اور آہنگ کی تشکیل میں اصوات کی تنظیم اور ان کی تکرار کا بھی بڑا حصہ ہے جس سے افعال نے قدم قدم پر کام لیا ہے۔ زبان کے استعمال کے سلسلے میں جلیں کا یہ خاص اسلوب رہا ہے کہ وہ شعر میں منظم یا غیر منظم طرز پر لفظ کو مکرر لاتے ہیں۔ یہ صوتی رعایت یعنی تکرار کی یہ اعلیٰ فنکاری ان کے کلام میں ان کی افتاد طبعیت کی مناسبت سے غیر شعوری طور پر درآئی ہے جس کی حسب ذیل امکانی صورتیں دریافت ہوتی ہیں۔

دو لفظوں کو شعریا مصرعوں میں برابر جمع کرنا۔ یہ تکرار بڑی مترنم ہوتی ہے۔  
 سو سو کو مست کرتے ہیں اک اک نگاہ میں جس بزم میں گئے اُسے میخانہ کر دیا  
 صبا نے محکو سسکھائی ہے جب بوتری چمن چمن لئے بھرتی ہے جستجو تیری  
 بہا رآئی تو ہوتا جامہ گل پہرہ اپنا مگر یہاں مگرے مگرے پر پردہ آستین توتی  
 خاص صورتوں میں جلیں نے الفاظ کی تکرار کا تو اذن دونوں مصرعوں میں برابر رکھا ہے۔  
 پیار پیار ہونٹ چوم آیا ترے اوست ناز آنکھوں آنکھوں سے لگائے کا سا غرہو گیا  
 رفتہ رفتہ رنگ لایا اشک خوں قطرہ قطرہ ایک دریا ہو گیا  
 تڑپ تڑپ کے رہا دل بھننا ہوا میرا اچھا اچھے کے رہی زلف عنبریں تیری  
 تکراریں جب دو لفظوں کے درمیان کوئی اور لفظ موجود ہو۔

ذبح کرنے میں کمی اوستم ایجاد نہ کر رحم کر رحم کے پردہ میں یہ بیداد نہ کر  
 محتب راہ لے اپنی کہ بہا رآئی ہے اٹھ نکھیا دور تر دور ہے پیانے کا  
 شکر پر شکر نکلتا ہے دل بسمل سے زخم پر زخم تراشیر نظر دیتا ہے  
 پہلے اور دوسرے مصرعے میں یا صرف دوسرے مصرعے میں لفظ کی تکرار سے لطف شعر کو دو چند کیا ہے :

ہم تم ملے دھتے تو خدائی کا تھا ملا اب یہ ملا ہے کہ تمسٹا بکلی گئی!

مجھے تمام زمانے کی آرزو کیوں ہو بہت سے میرے لئے ایک آرزو تیری  
چلو سے آج کام نکالیں گے ساقیا ساغر نہیں تو ہاتھ کو ساغر بنائیں گے  
دوسرے مصرع میں دہرائے ہوئے لفظ کو کسی فارسی لفظ سے ترکیب دیکر زور  
کلام کے لیے مربوط کرنا

دھل کی رات خوشی نے مجھے سونے نہ دیا میں بھی بیدار رہا طابع بیدار کے ساتھ  
مجھ کو بھی اپنے ساتھ لاتا ہے خاک میں خانہ خراب ہو، دل خانہ خراب کا  
راحت نہ مل سکی کبھی میخانہ چھوڑ کر گردش میں ہوں میں گردش پیادہ چھوڑ کر  
شعر کے بعض الفاظ میں تقسیم و تاخیر کر کے بھی ایک خاص قسم کا آہنگ پیدا کیا ہے۔  
جو دل کی ناک ہے ان کو تو ہم بھی ہیں ہشیار وہ ہم کو اور ہم ان کی نظر کو دیکھتے ہیں  
جی میں آتا ہے کہ دو آہ سے ناوک کا جواب تو نشان ہو مرا میں ہوں نشان تیرا  
شعر کو ایسے لفظوں اور ٹکڑوں میں بھی تقسیم کیا جاسکتا ہے کہ ان کی تکرار خاص و تفصیل  
کے ساتھ ہو۔

قلق اس میں تڑپ اس میں، الم اس میں، حزن اس میں سینے میں دل کیا ہے خزینہ ہر محبت کا  
جب میں چلوں تو سایہ بھی اپنا نہ ساتھ لے جب تر چلو زمین چلے، آساں چلے  
تڑپنا دل کا۔ رونا آنکھ کا چلنا کلیجے کا یہ تھے آپ کے سننے کے قابل ہوتے جاتے ہیں  
اصوات کی تکرار اور ان کی ترتیب سے صوتی آہنگ پیدا کرنے کے لیے  
جلیل الفاظ کے انتخاب میں غیر ارادی طور پر صوتی مماثلت کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ ان اشعار  
میں اصوات کی مسلسل تکرار ہوتی ہے اور ایسے ہر شعر میں ایک دو اصوات ایسی ہوتی  
ہیں جن کی تکرار سب سے زیادہ ہوتی ہے۔

ایسے چھپنے سے تو بہتر تھا نہ چھپنا تیرا تو ہے پردے میں مگر ذکر ہے گھر گھر تیرا  
اس شعر کا صوتی تجزیہ بتلاتا ہے کہ اس میں :

ے = ۱۰ بار ر = ۸ بار ت = ۵ بار ج = ۵ بار گ = ۵ بار س = ۱۰ بار اور م مکرر  
لائے گئے ہیں۔

اب تک میں اسی شک میں ترے دیکھنے والے دیکھا بھی ہے یا جلوہ جاننا نہیں دیکھا

اس شعر کا صوتی تجزیہ بتلاتا ہے کہ اس میں :

ی : ۱۳ بار ل : ۸ بار ن : ۷ بار ک : ۵ بار اد م : ت ،  
و اور ج سکر لائے گئے ہیں۔

میں ہوں حاضر ہدف تیر نظر ہونے کو دیکھو دیکھو دشمن نہ خدا را دیکھو  
اس شعر کا تجزیہ بتلاتا ہے کہ اس میں

ہ : ۶ بار و : ۶ بار ی : ۶ بار د : ۵ بار ر : ۴ بار ن : ۵ بار  
ک : ۴ بار استعمال ہوا ہے۔

بستم کی چال بستم کی ادا۔ بستم کی نگاہ ترے ستم کا ستمگر کوئی حساب بھی ہے  
اس شعر کا صوتی تجزیہ بتلاتا ہے کہ اس میں :

ی : ۸ بار س : ۶ بار ت : ۶ بار م : ۵ بار اد رک : ۵ بار

## ناقدین کی رالیوں پر تبصرہ

جلیل کے ناقدین کے غائر مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جلیل کی شاعری کے بعض اہم پہلوؤں کے تعلق سے ناقدین میں اختلاف رائے ہے۔ متضاد رائے بھی ملتی ہیں ان کو پیش نظر رکھ کر میں نے بحث کے سلسلے کو آگے بڑھایا ہے تاکہ صحیح صورت حال سامنے آ سکے۔

### امیر اور داغ کے رنگ کا تتبع

کئی تنقیدیں ایسی ہیں جن میں اس امر کا اظہار کیا گیا ہے کہ جلیل نے داغ کے رنگ کا تتبع کیا ہے۔ کچھ ناقدین اس تتبع کی بات کو تسلیم نہیں کرتے۔ ایک ناقد تو یہاں تک لکھ گئے ہیں کہ جلیل کو امیر کے رنگ سے کوئی واسطہ نہیں، وہ صرف داغ کے مقلد ہیں۔ غرض تنقیدوں میں جہاں جہاں اس موضوع کو چھیڑا گیا ہے ان کا بالاختصار حوالہ دے کر موازنہ و مقابلہ کیا گیا ہے۔

نیا ز فحتوری، ”جلیل نے ان (امیر مینائی) کا تلمذ اس وقت اختیار کیا جب امیر مینائی صنم خانہ کی بنیاد ڈال رہے تھے اور اس لئے جلیل کا رجحان داغ کی طرف لے گیا۔ اور اس رنگ شاعری میں انھوں نے مشق کر کے استاد کا درجہ حاصل کیا۔“

کلیم الدین احمد: ”زبان سے ظاہر ہے کہ داغ اور امیر اپنا اثر ڈال چکے ہیں۔“  
قاضی عبدالغفار: ”داغ کی زبان کی بے ساختگی اور امیر مینائی کے تفکر دونوں سے جلیل کی شاعرانہ فطرت نے اپنا حصہ حاصل کر لیا تھا۔“

سلیمان ندوی: ”استاد (امیر مینائی) کا اتنا صحیح تتبع امیر کے تلامذہ میں کم ملتا ہے۔“  
اعجاز صدیقی: ”حضرت جلیل کی ترقیوں کا راز صرف مرزا داغ کی پیروی میں مضمر ہے۔“

متذکرہ بالا آراء میں بھی نے اس تبصرہ سے اتفاق کیا ہے کہ جلیل کی شاعری پر لکھنؤ اور دہلی دونوں دبستانوں کا اثر ہے یعنی کلام جلیل میں لکھنؤ اسکول کے نمائندہ شاعر امیر اور دہلی اسکول کے نمائندہ شاعر داغ، دونوں کا رنگ آمیزنگ پایا جاتا ہے۔ رہا داغ کے تتبع کا سوال تو نیاز فتحپوری اور اعجاز صدیقی نے اس پہلو پر زیادہ زور دیا ہے۔ نیاز فتحپوری کی اس تنقید کا جائزہ ذکی کا کوروی نے اپنی کتاب جلیل مانکپوری میں تفصیل سے لیا ہے اور نیاز کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ تنقید حقائق پر مبنی نہیں۔ اس کے کئی وجوہات بھی انھوں نے بیان کی ہیں، ”(۱)۔ اول تو وہ (جلیل) داغ کے ساتھ حیدر آباد میں پانچ سال رہے۔

(۲)۔ اس زمانے تک وہ استادانہ حیثیت کے مالک ہو چکے تھے۔ نیز ان کو امیر کے وصال کے بعد جانشین امیر مان لیا گیا تھا۔

(۳)۔ جلیل داغ کی حیات ہی میں حیدر آباد میں کافی مقبول ہو چکے تھے اور ان کو داغ کا مد مقابل سمجھا جانے لگا تھا۔ ڈاکٹر ذکی نے آخر میں یہ نتیجہ نکالا کہ جلیل کو داغ کا تتبع سمجھنا غلط ہوگا۔ اس پس منظر میں اعجاز صدیقی کی یہ مبالغہ آمیز تحریر ملاحظہ ہو۔

”فصیح الملک داغ دہلوی کے بعد جو نمک دربار دکن کے منصب جلیلہ پر حضرت جلیل فائز ہوئے اس لیے انھوں نے انتہائی کوشش کی کہ وہ خود کو مرزا داغ کے رنگ میں اتنا رنگ لیں کہ شہر یار دکن کو داغ کی کمی محسوس نہ ہو۔۔۔۔۔ حضرت جلیل مرحوم کی ترقیوں کا راز صرف مرزا داغ کی پیروی میں مضمر ہے“ (ماہنامہ سب رس جنوری ۱۹۷۱ء)

اعجاز صدیقی کی اس تنقید کا جواب ساحل احمد مانکپوری نے ان الفاظ میں دیا ہے:

اعجاز صاحب کے بیان میں یہ بات مان معلوم ہوتی ہے کہ

صرف جلیل ہی نے نہیں بلکہ ان کے استاد حضرت امیر مینائی  
 لکھنوی نے بھی داغ کا متبع کیا ہے اور اس وقت تک  
 ان میں وہ شعری صلاحیتیں اُجاگر نہیں ہوئیں جب تک انہوں  
 نے داغ کی پیروی نہیں کی۔ اعجاز صاحب کے اس بیان میں  
 مد سے زیادہ انتہا پسندی کی جھلک آگئی ہے۔ اعجاز صاحب  
 نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے ان میں جھلّا ہٹ کا شائبہ  
 زیادہ نظر آتا ہے۔“

(ماہنامہ سب دس۔ جلیل مانیکپوری کا تفریل جنوری ۱۹۸۸ء)  
 رہا مدیحتی صاحب کا یہ فقرہ :

”اگر حضرت امیر مینائی سے ان (جلیل) کی نسبت کا اظہار  
 نہ کیا جائے تو وہ اپنے رنگ سخن سے کھینچا ہوئی معلوم ہوتی  
 تو اس کی نفی ناقدین کی ان رایوں سے ہو جاتی ہے :

”جلیل امیر اور امیر کے سلسلے میں دبستان لکھنؤ کے شاعر  
 ہیں۔ ان کی شاعری کا رنگ اور مزاج بھی لکھنوی ہے۔“  
 (ڈاکٹر ذکی کا کوروی)

”اگرچہ جلیل امیر کے شاگرد ہیں اور ان کا سلسلہ صحفی سے  
 ملتا ہے لیکن ان میں ناسخیت کا اثر غالب ہے۔ چنانچہ قدیم  
 طرز لکھنوی شاعری کی آخری یادگار بھی ہیں۔“

(ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)

اس طرح یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ داغ کے متبع کی بات قیاسی ہے جلیل خالص  
 دبستان لکھنؤ کے شاعر تھے اور اسی روایت کی پیروی میں انہوں نے نام کمایا۔  
 ڈاکٹر حفیظ قتیل نے اس غلط فہمی کا ازالہ یوں کیا ہے۔

”یہ سمجھنا غلط ہے کہ جلیل کی آواز ان کی اکتسابی شخصیت کی  
 آواز ہے۔ ان کی آواز ان کی اپنی آواز ہے۔“

ڈاکٹر یوسف سرست بھی سمجھا رہے ہیں :  
 ”جلیل نے قدیم رنگ تفرز کو ایسا تیکھا انداز عطا کیا جو  
 ان کا اپنا ہے۔“

مولانا سلیمان ہندولوی اشہر موصوف پر اپنی مہر لیں ثبت کرتے ہیں :  
 ”شاعری کی جو خصوصیات وادھانِ اتمیہ تھے وہی جلیل  
 میں بھی تھے بلکہ اتمیہ میں قدیم و جدید کے دو رنگ تھے وہی  
 جلیل میں تھے۔ مراۃ الغیب کا پُرانا رنگ اور صنم خانہ  
 عشق کا نیا رنگ جلیل کے قدیم و جدید رنگ میں نمایاں ہے۔“

معنی آفرینی و نازک خیالی ؟

جلیل کے ناقدین میں اس سوال پر بھی اختلاف ہے کہ جلیل، داغ کی  
 طرح صرف زبان کے شاعر تھے یا ان کے پاس فکر بھی ہے ؟ حسبِ ذیل ناقدین فکر کی  
 نفی کرتے ہیں۔

نیاز فتحپوری : ”جلیل کے یہاں تصوف ہے نہ فلسفہ نہ کوئی مضمون آفرینی نہ فکر و خیال  
 کی بلندی۔“

آل احمد سرور : ”جلیل کی دنیا سیدھی سادی ہے۔ فکر سرے سے بالکل نہیں۔ حرف جذبہ  
 اور جذبہ کا نکھار ہے۔“

ذکی کاوری : ”جلیل کے کلام میں غیر معمولی گہرائیاں اور بلندیاں یا کسی قسم کا فلسفہ اور  
 تصوف قطعی نہیں۔“

سکین ظہری : ”استاد جلیل کی شاعری تصوف فلسفہ سے بے نیاز۔ مضمون آفرینی اور بلندی  
 فکر و خیال سے بری ہے۔“

ایک عام خیال یہ ذہنوں میں جاگزیں ہے کہ زبان کا شاعر گہری فکر کا شاعر  
 نہیں ہوتا۔ یہ خیال غلط فہمیاں پیدا کرتا ہے۔ جلیل کو بھی اس نظر سے کچھ اصحاب نے  
 جانچا ہے ان لوگوں کے مشفق میں یہی کہوں گا کہ انھوں نے جلیل کا مطالعہ بالواسطہ

نہیں کیا ہے اور وہ صرف ان کی مقبول عام شاعری ہی ہے متاثر رہے ہیں۔ جلیل اور داغ ایک دوسرے سے قریبی مائلت رکھنے کے باوجود یہ فرق رکھتے ہیں کہ داغ کے مقابلہ میں جلیل کے یہاں تفکر بھی ہے۔ یہی بات حیدر آباد کے ایک مشاعرے میں ترکی صاحب نے برسرِ محفل کہہ دی تھی جس پر بڑا ہنسکامہ ہوا تھا۔ اور جس کا ذکر پچھلے صفحات میں آچکا ہے۔

”قطع نظر اس سے ایسے ناقدین کی آرا بھی موجود ہیں جو جلیل کی شاعری میں تفکر بھی پاتے ہیں۔“

قاضی عبدالغفار: داغ کی زبان کی بے ساختگی اور امیر مینائی کے تفکر دونوں سے جلیل کی ”شاعرانہ بنطرت نے اپنا حصہ حاصل کیا تھا“

ڈاکٹر یوسف سرست: ”جلیل کی شاعری میں گہرائی ہے اور گہرائی بھی“

ڈاکٹر ابداللہ الیٹ حدیقی: ”ان (جلیل) کے یہاں ایسے اشعار بھی ہیں جو بلند پایہ ہیں اور جن سے جلیل کا کلام عام بکھنوی رنگ سے مختلف ہوتا ہے۔۔۔۔۔ ان کے استاد امیر مینائی کے کلام میں ان عناصر کی کاروائی مسلم ہے اور اس باب میں جلیل اپنے استاد کے رنگ سے یکسر منحرف نہیں ہیں“

علی اختر: ”ان (جلیل) کی شاعری میں خیالات کی لطافت، مضمون آفرینی اور بندش کی چستی کا اس قدر اہتمام ہوتا ہے کہ ناسخ اور امیر کے یہاں بھی نہیں پایا جاتا۔“

غلام حسن کسری:۔

”جلیل نازک خیال شاعر تھے۔ ان کی نازک خیالی سے شعر کے

حسن میں چار چاند لگ جاتے تھے۔ روایتی مضامین میں ان کی

نازک خیالیاں بڑی دلکش اور پراثر ہو جاتی ہیں“

اس بحث میں یہ بات غور طلب ہے کہ سبھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں

کہ جلیل امیر کے معنوی جانشین بھی تھے، جلیل امیر کے متبع تھے، اور جلیل اپنے استاد کے رنگ سے منحرف نہیں وغیرہ تو پھر جلیل کے کلام کو اس تفکر سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا جو امیر کے کلام کی نمایاں خصوصیت تھی۔ امیر کی معنویت کی بات سبھی مانتے ہیں۔

جیل کے زبان زد اشعار پیش کئے جاسکتے ہیں۔ یہ بات اور ہے کہ ایسے اشعار کی تعداد جیل کے زبان زد اشعار کے مقابلہ میں کم ہے۔ ان کی ہر غزل میں ایسے شعر ضرور مل جاتے ہیں:

لطف میں مرا محبوب تصویر خیالی ہے  
الہی آگ برق طور نے کسی لگائی تھی  
میزاں کھڑی ہوئی مرے آگے نہ روڑ جڑ  
یہ اس کو زیر زمیں کون گدگداتا ہے  
دکان ہے پہ پیچ کر کھلی حقیقت حال  
رفتہ رفتہ چھپتی جاتی ہے لگا ہوا نقاب  
لگی ہیں اس سے رندوں کی جو آنکھیں اک تاشا  
مہر کی ان پر ضرور کیا ہے اے پیر مغال  
ہو سبک رفتار کسی ہی نسیم صمد  
نازک گلوں پہ رنگ مسرت بھی بار ہے  
ہر چند کہ یہ اشعار مشتے از خروارے ہیں تاہم یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں  
کہ جیل زبان کے ساتھ تفکر کو بھی نظر میں رکھتے ہیں۔ اس مسلک کا اظہار وہ  
اپنے شعروں میں جا بجا کرتے ہیں۔

دُرِ مضمون کا ہے وہ جوش کہ اللہ اللہ  
پوچھا جو ان سے جانتے ہو تم جیل کو  
زہیں شعر ہم کرتے ہیں آباد  
لہریں لیتی ہے طبیعت مری دریا ہو کر  
بولے کہ ہاں وہ شاعر نازک خیال ہے  
چلے آتے ہیں مضمون آسمان سے

اے امیر کے اشعار میں نزاکت خیالی بلند پروازی اور قادر الکلامی بدرجہ احسن موجود ہے  
باعتبار شکوہ الفاظ اور متانت اور نازک خیالی امیر کو داغ پر فوقیت حاصل ہے۔ (رام بابو سکینہ  
تالیخ ادب اردو ص ۴۲۶، ۴۲۷)۔ امیر کے یہاں سب سے پہلے خالص عاشقانہ کلام میں  
بھی خیال کی گہرائی اور فکر کی بلندی پائی جاتی ہے۔ (ابوالیث صدیقی، دستان کھڑک ص ۶۱)

## تصوف و معرفت

جہاں تک جلیل کے کلام میں تصوف و معرفت کے عنصر کا سوال ہے اس وصف میں بھی ناقدین کی آرا غصم ہیں۔ نیاز فختوری، ذٹی کا کوری اور تسکین کاظمی کے خیال میں تصوف و معرفت کا عنصر جلیل کے یہاں ہے ہی نہیں لیکن کچھ ناقدین اس سے قطعی اختلاف کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ابوللیث صدیقی نے اپنی کتاب ”لکھنؤ کا دبستان“ میں اس پہلو پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ تصوف و معرفت کا عنصر جلیل کے یہاں ہے ضرور مگر کم ہے۔

”جلیل کے یہاں ایسے (صوفیانہ) مضامین کم ہیں اور جہاں ہیں وہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اھول نے تصوف برائے گفتن خوب است“ سمجھا ہے۔ یہ بھی خالص لکھنؤی روایت ہے جو متقدمین شعرا سے جلیل نے ورثہ میں پائی ہے۔ امیر مینائی کے رنگ اثر سے معرفت کے اچھے مضامین بھی نظر آتے ہیں

پر دہ نہ تھا وہ صرف نظر کا قصو تھا  
دیکھا تو زرہ زرہ میں اس کا جلو تھا

جانتے ہیں تجھے ہم روزِ ازل سے لیکن  
یہ نہیں جانتے کیونکر تجھے ہم جانتے ہیں  
جلوۂ یار سے ہر آنکھ کو روشن دیکھا  
لاکھ آئینوں میں اک صورت لورانی ہے؛

(لکھنؤ کا دبستان، ص ۶۵۷)

ڈاکٹر عبدالحالی لکھتے ہیں کہ ”یہ کہنا نا مناسب ہو گا کہ جلیل کا کلام تصوف و فلسفہ سے خالی ہے۔ ان کے دیوان میں ان مضامین سے متعلق اچھے اشعار ملتے ہیں“

جلیل کے کلام میں تصوف کی شمولیت کے دو وجوہات ہیں ایک بقول  
ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھنوی روایت کی پابندی میں۔ دوسرے امیر مینائی  
کی تقلید میں۔ تیسرا ایک سبب اور بھی تھا کہ جلیل صوفی منش بھی تھے بقول  
خود:

جب سنا بزم میں کلام جلیل صوفیوں کا عجیب حال ہوا  
چنانچہ شراب کے تعلق سے ایک اعتراض کے جواب میں جلیل نفیس بنگلوری کو لکھتے ہیں:  
”اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اگر شراب کا لفظ ناجائز  
ہے تو قرآن سے بھی شراب کا لفظ نکلوا دیا جائے۔ اگر  
یہ کہا جائے کہ قرآن پاک میں شراب طہور آیا ہے تو اس  
کا جواب یہ ہے کہ شعر میں شراب غیر طہور کہا ہے۔  
اس میں بھی شراب طہور ہی مراد ہے۔ قرآن میں بھی کئی  
جگہ صرف شراب کا لفظ آیا ہے“ لہ

امیر مینائی کے یہاں متصوفانہ مضامین بہت ہیں جو نتیجہ تھا امیر کے خاندانی  
روایات اور ابتدائی تعلیم و تربیت کا۔ یہی صورت حال جلیل کی بھی تھی ابتدائی  
تعلیم قرآن پاک کے حفظ سے شروع ہوتی ہے اور پھر انھیں رام لور میں جناب  
امیر اور بزرگان دین کی صحبت حاصل ہو گئی۔ یہی وہ عوامل ہیں جنہوں نے  
جلیل سے تصوف کے اشعار روایتی طور پر بھی کہلائے اور دینی مسلک کے طور پر بھی۔  
ان کے دیوانوں میں ایسے اشعار جا بجا بکھرے نظر آتے ہیں۔

بصیرت جب ہوئی پیدا ہمیں مشق تصور سے جو کچھ خلوت میں دیکھا تھا وہی بازاں میں دیکھا  
دیر و کعبہ کی زیارت تو فقط حیلہ ہے جستجو تیری لئے پھرتے ہے گھر گھر محبو  
تیں عکس ہوں آیتہ اسکاں میں تمہارا تم سا جو نہیں اور تو مجھ سا بھی نہیں اور  
دیکھوں ہزار آنکھ سے حبلوہ ترا مگر جب دیکھنے بھی دے مجھے کثرت ظہور کی

ہستی و عدم دونوں ہمارے ہی لئے ہیں اس گھر میں چلے جائیں گے اس گھر سے نکل کر  
 جتنے آئینے ہیں سب تکتے ہیں صورت میری آئینہ خاندان میں آیا میں متا شاہوکر  
 ایسے چھپنے سے تو بہتر تھا نہ چھپنا تیرا تو ہے پردے میں مگر ذکر ہے گھر گھر تیرا  
 حُسن دیکھا جو بتوں کا تو خدایا د آیا راہ کعبے کی ملی ہے مجھے بیخانانے سے  
 کوثر سے کیا بجھے گی لگی دل کی ساتیا اگر مسیکدہ بھی ہم لب کوثر بنائیں گے

## معاملہ بندی

جلیل کے ذکر میں معاملہ بندی اور اس کے تعلقات کے تعلق سے ڈاکٹر  
 ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں:

”یہی وہ رنگ ہے جو لکھنوی شاعری کے دامن پر بند  
 داغ ہے۔ اگرچہ مصحفی اور ان کے شاگردوں نے اپنے  
 معاصرین کے مقابلہ میں اپنا دامن کم آلودہ کیا ہے۔ جلیل کی  
 معاملہ بندی پر وہ اعتراضات وارد ہو سکتے ہیں جو  
 حالی کے عہد سے آج تک ناقدین نے اردو غزل پر کئے  
 ہیں۔ جلیل کے یہاں اس قسم کے اشعار کی بہتات ہے“

اس جگہ معاملہ بندی کیا ہے؟ مختصر طور پر اس کا جائزہ لینا ضروری معلوم  
 ہوتا ہے۔ تغزل میں معاملات جن و عشق کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ غزل کا بنیادی  
 تصور خویاں سے چھڑ اور حسینوں کے ساتھ ناز و نیاز کے معاملات ہیں۔ متقدین کے  
 یہاں غزل کا حقیقی منصب جن و عاشقی کا بیان ہی ہے۔ یہ روایت دلی دکنی ہے اور پھر  
 تیر سے ہوتی ہوئی داغ و امیر اور ان کے متبعین تک پہنچتی ہے لیکن اس رنگ کو جرأت  
 نے خصوصیت کے ساتھ برتنا۔

۱۔ ابواللیث صدیقی ”جلیل مانپکوری“ لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۲۲۲  
 ۲۔ تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سے کہو گلا حادو ہیں ٹرے میں غزل اللہ

دہلی میں موتیوں اور داغ اس کے نمایندہ شاعر ہیں۔ ابتداء میں معاملہ بندی رعایت لفظی کے قدم بقدم حلی بعد ازاں جب بے جا رعایت لفظی کو ترک کیا جانے لگا تو زبان کی سلاست و روانی سے مفاہین غزل میں معاملہ بندی کا رنگ بکھر گیا۔ پھر یہ معاملہ لکھنؤ سے مخصوص نہیں دہلی کے شقین کے یہاں کمزور شعرائے تاخرین کے یہاں اکثر معاملہ بندی کے اشعار موجود ہیں۔

غزل کی یہ روایت جلیل کے پاس بڑے رکھ رکھاؤ سے ملتی ہے۔ پاکستان کے ایک ناقد لکھتے ہیں،

”جلیل نے اپنی غزل میں یہی مفاہین حسن اور متعلقات حسن استعمال کئے ہیں مگر ایسے حسن و سلیقہ سے کہ وہ ہماری شاعری کا ایک مستقل حصہ بن کر رہ گئے ہیں۔ جلیل کا یہ لاجواب شعرا اسی معاملہ کی دین ہے۔

ہم تم ملے نہ تھے تو جُدا کی کا تھا ملال  
اب یہ ملال ہے کہ تمنا بیکل گئی  
ڈاکٹر ذکی کا کوردی بھی جلیل کی معاملہ بندی کو سراہتے ہیں۔

”معاملہ بندی کے شعر کثرت سے ہیں مگر ان میں بے راہروی نام کو نہیں اور نہ وہ داغ و آئینہ کی طرح حد سے تجاوز کرتے ہیں۔  
پروفیسر مسعود حسین خان جلیل کی معاملہ بندی کی شرح لیں کرتے ہیں:

”جلیل کی معاملہ بندی اور لکھنؤ کے دیگر شعرا کی معاملہ بندی

میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہ اودھ اور دکن کے دربار کا فرق ہے۔ ایک ششہ و دارفہ اور دوسری از خود فریہ

اس ششہ و رفته معاملہ بندی نے حسرت موہانی کی شاعری کے مجازی رنگ کو چوکھا کیا۔ یہی جلیل کا اصل رنگ ہے۔“ (قلی تحریر)

# کتابیات

- احسن اللہ خاں ثاقب - مکتب امیر مینائی لکھنؤ ۱۹۲۲ء  
 احسن مارہروی - انشائے داغ - دہلی ۱۹۲۲ء  
 احمد علی خاں - تذکرہ کامران لاہور - دہلی ۱۹۲۹ء  
 اختر الایمان - فصاحت جنگ جلیل (شخصی مکتوب)  
 اصغر گونڈوی - غزل سرا - دہلی ۱۹۶۳ء  
 امیر مینائی - مراۃ الغیب - لکھنؤ ۱۳۰۹ھ  
 صنم خانہ عشق - لکھنؤ ۱۳۳۹ھ  
 امیر اللغات - آگرہ ۱۸۱۱ھ  
 مکتوب شخصی - پیام والد جلیل مانپوری  
 مکتوب شخصی - پیام جلیل حسن جلیل  
 بشیر بدر - (ڈاکٹر) - آزادی کے بعد کی غزل - دہلی ۱۹۸۱ء  
 جلال لکھنوی - دیوان جلال - لکھنؤ  
 جگر مراد آبادی - شعلہ طور - دہلی ۱۹۲۷ء  
 جلیل مانپوری - تاج سخن - حیدر آباد ۱۹۱۰ء  
 جان سخن - حیدر آباد ۱۹۱۶ء  
 روح سخن - (غیر مطبوعہ)  
 سراج سخن - لکھنؤ ۱۳۲۷ھ  
 معراج سخن - لکھنؤ ۱۳۲۷ھ  
 تذکیر و تانیث - حیدر آباد ۱۹۰۸ء  
 گل صد برگ - حیدر آباد ۱۹۱۰ء  
 سوانح امیر مینائی - حیدر آباد ۱۹۲۸ء

\_\_\_\_\_ معیار اردو . حیدر آباد ۱۹۲۴ء

\_\_\_\_\_ تاریخ دکن . حیدر آباد

\_\_\_\_\_ مجموعہ تصانیف (غیر مطبوعہ)

حبیب ضیاء ڈاکٹر . مہاراجہ سرکشن پرشاد . حیدر آباد ۱۹۷۸ء

حسرت سوبانی . کلیات حسرت سوبانی . دہلی ۱۹۵۹ء

حیرت بدایونی . کردار جلیل . حیدر آباد ۱۹۶۵ء

ذکی کاکوردی ڈاکٹر . جلیل مانپوری . لکھنؤ ۱۹۷۱ء

رام بابو سکسینہ . تاریخ ادب اردو . دہلی ۱۹۶۶ء

راہی معصوم رضا . جلیل استاد شاعر (شخصی مکتوب)

رشید احمد صدیقی . جدید غزل . لکھنؤ ۱۹۵۵ء

ریاض خیر آبادی . ریاض رضوان . حیدر آباد ۱۹۳۸ء

زور . محی الدین تادری . فرخندہ بنیاد حیدر آباد . حیدر آباد ۱۹۵۲ء

\_\_\_\_\_ عہد عثمانی میں اردو کی ترقی . حیدر آباد ۱۹۳۲ء

\_\_\_\_\_ مرقع سخن . حیدر آباد ۱۹۲۵ء

سحر . ابو محمد ڈاکٹر . مطالعہ امیر . نسیم بک ڈپو . لکھنؤ ۱۹۶۲ء

سیمان ندوی . یاد رفتگان . کراچی ۱۹۸۳ء ص ۳۲۹، ۳۳۷

سیدہ جعفر پرنسپل (مرتب) حیدر آباد میں بیرونی شعرا . حیدر آباد ۱۹۸۸ء

شمس الرحمن فاروقی (مرتب) درس بلاغت . ترقی اردو بیورو دہلی ۱۹۸۱ء

\_\_\_\_\_ جلیل مانپوری (شخصی مکتوب)

شوق سندیلوی . اصلاح سخن . دہلی ۱۹۱۷ء

صدیق احمد اثر . کارنامہ جلیل (قلمی)

صغیر النساہیکم . غزلیات غالب کا عرضی تجزیہ . دہلی ۱۹۸۲ء

صفدر مرزا پوری . حسن خیال . لکھنؤ . ص ۱۲۸

ضمیر احمد ہاشمی . ادراک نگل . رام پور ۱۹۵۶ء

- عارف ابو العلامی . امام الفن فصاحت جنگ جلیل . حیدر آباد ۱۹۳۷ء  
 عبد اللہ علوی قنیس مانکپوری . تاریخ کرۂ مانکپور . الہ آباد ۱۹۱۶ء  
 عبد اللہ قریشی ڈاکٹر . اقبال بنام شاد . لاہور ۱۹۸۶ء  
 عبد الجبار خاں آصفی . محبوب الزمن . حیدر آباد  
 عبد الحکیم حکمت . دبدبہ امیری . پٹنہ  
 عبد الخالق ذکی (ڈاکٹر) . جلیل مانکپوری . ۱۹۸۹ء  
 عبد التار ردولوی . ادبی ولسانی تحقیق  
 عزیز جنگ دلا . غرائب الجمل . حیدر آباد .  
 علی احمد جلیلی . مسکاتیب جلیل . حیدر آباد . ۱۹۸۲  
 علی سردار جعفری . دیباچہ روح سخن (مرتب مشتاق جلیلی) بمبئی ۱۹۵۵ء  
 غنایب شادانی . دور حاضر اور اردو غزل . لاہور . ۱۹۶۲ء  
 عنوان چشتی پردیسر . عربی و فنی مسائل . دہلی ۱۹۸۵ء  
 ذوق گورکھپوری . اردو کی عشقیہ شاعری . الہ آباد  
 لائق صلاح ڈاکٹر . شمس الدین فیض . حیدر آباد ۱۹۷۸ء  
 محمد طفیل . مخدومی . لاہور ۱۹۸۳ء  
 مسعود حسین رضوی ادیب . بہاری شاعری . بکھٹو  
 مسعود حسین خاں پردیسر . فصاحت جنگ جلیل (تلمی تحریب)  
 مشتاق جلیلی (مرتب) . روح سخن (انتخاب) بمبئی ۱۹۵۵ء  
 معنی بیستم پردیسر . فانی بدایونی . حیدر آباد ۱۹۶۱ء  
 آواز اور آدمی . حیدر آباد ۱۹۸۳ء  
 ممتاز علی آہ . امیر مینائی . رام پور . حیدر آباد ۱۹۴۱ء  
 مہدی نواز جنگ . مہاراجہ سرکش پرشاد . حیدر آباد  
 نجم الغنی رام پوری . تاریخ اودھ بکھٹو ۱۹۱۹ء  
 نورا الحسن ہاشمی . دلی کا دبستان شاعری . ۱۹۴۹ء

یوسف حسین ڈاکٹر - اردو غزل، ٹیلیگراف ۱۹۵۷ء

## رسائل

ادب لطیف - لاہور - ۱۹۶۷ء

امکاں سہ ماہی - بمبئی - ۱۹۸۱ء

پیام (اخبار) - حیدرآباد ۹ جنوری ۱۹۳۶ء

سب رس (ماہنامہ) - حیدرآباد جنوری ۱۹۷۱ء

شاعر ماہنامہ - غالب نمبر - بمبئی ۱۹۶۱ء

مجلہ عثمانیہ - جلیل نمبر - حیدرآباد ۱۹۳۶ء

معارف - اعظم گڑھ - مارچ ۱۹۳۶ء

میزان (اخبار) - جلیل نمبر - حیدرآباد ۷ جون ۱۹۳۶ء

نقوش سالنامہ - لاہور ۱۹۶۶ء

نقوش عصری ادب نمبر - لاہور ۱۹۸۶ء

نقوش - رسول نمبر - لاہور - ۱۹۸۷ء

نقوش - سالنامہ - لاہور ۱۹۸۶ء

لنگار - سالنامہ - غزل نمبر - پاکستان ادیشن ۱۹۸۶ء

ہندوستانی ادب - جلیل نمبر - حیدرآباد - ۱۹۳۶ء